اِنَّ اللّٰہَ لَطِیفٌ خَبِیرٌ
علمی دینی اصلاحی اور معلوماتی
اللطیف ویلور
دارالعلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم
سالنامہ
۱۴۲۷ ھجری
2006ء
اللطیف
ویلور
۴۵ واں شمارہ
بیادگار شیخ المشائخ اعلیٰحضرت علامہ مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری رحمۃ اللہ علیہ
مولانا مولوی ابوصالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری المعروف بہ میراں پاشاہ رحمۃ اللہ علیہ
مدیر مؤسس حضرت اقدس مولانا مولوی ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ اجراء
بروز پیر ۱۰ شعبان المعظم ۱۴۲۷ سنہ ہجری بمطابق 4 ستمبر 2006 سنہ

○ زیرِ نگرانی

مولانا مولوی ڈاکٹر ابو محمد شاہ محمد عثمان قادری ایم اے، پی ایچ ڈی، بی کام؛

ناظم دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان۔ ویلور

✡

مولانا شاہ ہلال احمد قادری شطاری ادیبِ فاضل (مدراس)

نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور

✡

○ زیرِ ادارت

حضرت مولانا مولوی پی. محمد ابوبکر ملیباری لطیفی قادری قمری مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مولانا مولوی حافظ ڈاکٹر ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، پی ایچ ڈی، مدرس دارالعلوم لطیفیہ ویلور

✡

○ نمائندگان طلباء

۱	مولوی کے۔ یم۔ محمد مصطفےٰ	بیڈرو ڈی	کرناٹکا
۲	مولوی یم۔ یچ۔ عبدالحکیم	بیلتا نگڈھی	,,
۳	حافظ منظفر بیگ	گڑیاتم	تمل ناڈو
۴	حافظ جیلانی باشاہ	بلہاری	کرناٹکا
۵	حافظ رحمت اللہ	بنگلور	,,
۶	حافظ ایف۔ سعید احمد	میسور	,,
۷	حافظ محمد رفیع	سروار	,,
۸	حافظ ای۔ یم۔ ڈی۔ یچ ذاکر	گنتکل	آندھرا
۹	حافظ افروز احمد	حیدرآباد	,,

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱	ثنائے ذوالجلال	قدوۃ السالکین حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری	5
۲۔	رباعیات امجدؔ	امجدؔ حیدرآبادی	6
۳۔	افتتاحیہ	ادارہ	7
۴۔	روئداد دارالعلوم لطیفیہ	ادارہ	22
۵۔	جواہر القرآن	حافظ ڈاکٹر ابوالنعمان بشیر الحق قریشی یم اے، پی ایچ ڈی	24
۶۔	جواہر الحدیث	حافظ ڈاکٹر ابوالنعمان بشیر الحق قریشی یم اے، پی ایچ ڈی	35
۷۔	فتویٰ	ادارہ	43
۸۔	مکتوبات حضرت قطب ویلورؒ	ترجمہ: حافظ ڈاکٹر ابوالنعمان بشیر الحق قریشی یم اے، پی ایچ ڈی	45
۹۔	جواہر السلوک	ترجمہ: مولانا سید احمد محی الدین قادری الحافظی، حیدرآبادی	48
۱۰۔	جواہر الحقائق	ترجمہ: ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ صاحب صبغۃ اللہی	61
۱۱۔	نقوش طاہر	ادارہ	72
۱۲۔	یوم لاینفع مال ولا بنون	مولانا ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری ایم اے پی ایچ ڈی	76
۱۳۔	احکام شرعیہ میں عرف و عادت کی حیثیت	حافظ ڈاکٹر ابوالنعمان بشیر الحق قریشی ایم اے پی ایچ ڈی	80
۱۴۔	رویت ہلال	مولوی قاری ایم بی شیخ فضل اللہ لطیفی ایم اے	102
۱۵۔	حضرت قطبؒ ویلور	ڈاکٹر جاویدہ حبیب یم اے، یم فل، پی ایچ ڈی	108
۱۶۔	ہنر بچشم عداوت	افضل العلماء حافظ محمد معین الدین باقوی	113
۱۷۔	محبت و معرفت والٰہی	خواجہ محمد بیابانی نور	120
۱۸۔	ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا	محمد شریف برکاتی آمبوری	129

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۹۔	باب النقوش (تعویذ)	حافظ عبدالمنعم قادری مرحوم آرنی	138
۲۰۔	آداب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا سید شاہ عثمان قادری یم اے پی ایچ ڈی	147
۲۱۔	عمل کثیر اجر عظیم	ٹی شیخ محبوب، امبت پور	149
۲۲۔	قطب الاقطاب حضرت شیخ دکن گلبرگہ	مولانا سید شاہ محمد کمال اللہ ظہوری لطفی چشتی القادری	152
۲۳۔	سید نور اللہ بادشاہ بخاری	حکیم محمود بخاری مجل	156
۲۴۔	حضرت مکان میں طالب علمی کا سنہرا دور	مولوی محمد حسین لطفی قادری جنیدی	161
۲۵۔	حضرت شیخ نظام الدین اولیاء	محمد شفاعت احمد سلیم	164
۲۶۔	ٹمل ناڈو کی ممتاز نعت گو شاعرہ	علیم صبا نویدی	174
۲۷۔	بر وفات حافظ عبدالمنعم صاحب	مولانا سید مفصح الدین آرنی	178
۲۸۔	خوانقاہوں کے اثرات	حافظ عبدالسلام احمد لطفی	180
۲۹۔	شخصیات و اعمال سے استعانت و استمداد	مولوی سید احمد لطفی	185
۳۰۔	رسالت	حافظ جیلانی باشاہ	193
۳۱۔	بیت المقدس	حافظ ای ایم ڈی ایچ ذاکر	197
۳۲۔	فضیلت علم	محمد نواز خان	200
۳۳۔	والتین والزیتون	ڈاکٹر محمد نعمان بادشاہ ویلور	204
۳۴۔	التصوف الاسلامی	مولوی سید نیاز احمد جمالی	207

حصۂ نظم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۔	نعت سرور کونین ﷺ	سید سراج الدین منیر حیدر آباد	211
۲۔	نعت شریف	لیس محمد یوسف شناس، ادہونی	212
۳۔	حضرت مکان	علیم صبا نویدی	213
۴۔	عظیم الشان ہے میلہ نظام الدین چشتی کا	محمد یوسف شمیم	214
۵۔	سلام بہ حضور سیدنا الانام ﷺ	خواجہ محمد بیابانی نور قادری چشتی	215
۶۔	نظم مرثیہ نما	علیم صبا نویدی	216

سلام
بہ حضور سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

خواجہ محمد بیابانی نور قادری و چشتی

اے حبیبِ خدا، اے نبی مصطفےٰ! تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام
اے رسولِ خدا، احمد مجتبیٰ! تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام
قبلۂ انبیاء، کعبۂ اصفیاء تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام
عرض کرتے ہیں آقا تمہارے گدا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

نفس و شیطاں سے ہم کو بچا لیجیے، سیدھے رستہ پہ ہم کو لگا دیجیے
ایسی نظرِ کرم ہم پہ کرنا ذرا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

مصدرِ رحمتِ بیکراں تم ہی ہو، صدرِ کون و مکاں بے گماں تم ہی ہو
تم ہی ہو مظہرِ ذاتِ نورِ خدا، تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

شربتِ وصل ہم کو پلا دیجیے، جلوۂ حق نما بھی دکھا دیجیے
بس ہماری یہی تم سے ہے التجا، تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

پاس کچھ بھی نہیں ہے حبیبِ خدا پھر بھی کیا ڈر کہ تم ہو شفیع الورٰی
لاج رکھنا ہماری بروزِ جزا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

ہے یہ امید مقبول ہو جائے گا، نور کا بھی کرم سے درود و سلام
عرض کرتے ہیں آقا یہ صبح و مسا، تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

ثنائے ذوالجلال

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ ابوالحسن قربیؔ علیہ الرحمہ

ثنا کہتا ہوں صدقِ دل سوں ہیں مولیٰ تعالیٰ کا
اگرچہ ہو نہیں سکتا ثنا اس ذاتِ اعلا کا

وہی ہے گلشنِ ہستی ہیں مالی اس کی قدرت کا
گلِ تر وجہ گل رُخ کا صنوبر قد دلارا کا

صدف ہیں ایک قطرے سوں کیا ہے لولو و لا لا
دو قطرے سوں کیا شاداب قد شمشاد بالا کا

اسی کی حمد ہیں دایم زباں بھرتی ہے عالم کی
اگرچہ کوئی ثنا کہتا ہے ماہِ مہر سیما کا

عبادت ہیں اسی کے ہیں سبھی ذرّات عالم کے
اگرچہ کوئی کیا پوجابتِ بی دست و بی پا کا

ہر یک ذرّہ اشارت ہے یہی توحید بر حق ہے
اگر توں ہے اشارت فہم کر ادراک معنا کا

اپس کی ذات کوں لا کر کہ ہووے کشف الا اللہ
بغیر از لا کے نا کہہ لے تجے اسرار اِ ّلا کا

دِسے گا وجہ اس کا ہر ذرّے سوں گر کریگا حل
یقیں سوں ثُمّ وجہ اللہ کے مشکل مُعمّا کا

ذراتِ خلق ہیں ہے غیر ذاتِ لم یزل ہرگز
تو ہر یک ذات کوں پر تو سمج اس ذاتِ والا کا

صفت ہور اسم ہر شی کا صفت ہور اسم حق کا ہے
کہ ہے اسم و مسمّٰی عکس اس اسم و مُسمّا کا

تجلّی ہے یو سب غیبِ ہویت ہور وحدت کی
اگر ہے جہل جاہل کا و گر ہے علم دانا کا

بغیر از عاجزی قربیؔ تجے چارہ ثنا سوں نیں
کہ جیوں کہنا اتھا تیوں نیں کہے کوئی حمد مولا کا

پیشکش: مولانا سیّد شاہ ہلال احمد قادری شطّاری عرف ہلال پاشاہ نائب ناظم دارالعلوم لطیفیہ۔ ویلور۔

امجد
رباعیات

کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ

یعنی دنیا میں ہر ایک اپنی عبادت اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہے۔

قائم بعبادتِ تو کہسار بدشت
مصروفِ رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا ز حباب سبحہ در کف دارد
انگشتِ شہادت است ہر خار بدشت

فَافْهَمْ فَتَدَبَّر

سر خاک پہ رکھ کر بھی سرفراز ہوں میں
سب میں مل جل کے سب سے ممتاز ہوں میں
سمجھا نہیں مجھ کو دیکھنے والوں نے
دیکھو دیکھو کھلا ہوا راز ہوں میں

اُمّیِ لقبی

نقش ست بدل ولائے اُمّی لقبی
جانم شدہ مبتلائے اُمّی لقبی
جز اُمّتی اُمّتی ورا ذکر نہ بود
اُمّی و ابی فدائے اُمّی لقبی

کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا

وہ پردہ سے حُسنِ جاودانہ نکلا
دل ہاتھ میں لے کے اک زمانہ نکلا
اے جوہریانِ عشق لوٹو لوٹو !
برسوں کا دبا ہوا خزانہ نکلا

افتتاحیہ

عصر حاضر میں افراد، اقوام اور ممالک کے درمیان خوشگوار تعلقات کی اہمیت اور افادیت روز افزوں بڑھتی جارہی ہے اور لوگ تعمیراتی امور اور ترقیاتی منصوبوں اور سائنسی علوم کے تحت ایک دوسرے سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اشخاص و افراد اور ممالک بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ رہے ہیں جن کے درمیان نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں، ایسے حالات میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات استوار کرنا، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اسلام میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ انسانی اور اخلاقی سطح پر اچھے تعلقات قائم رکھنے کی ترغیب اور تعلیم موجود ہے۔ قرآن کریم کی ہدایت ہے ولا تصعر خدک للناس (لقمان) ایک دوسرے سے منہ پھیر کر نہ رہو۔ اس آیت طیبہ میں اگر چہ کہ غرور و تکبر اختیار کرنے سے منع کیا جارہا ہے تاہم یہ مفہوم اخذ کرنا بھی اپنی جگہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص معاشرہ سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ سب کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے، اس مفہوم کی تائید کے لئے یہ آیت طیبہ معاون ہوسکتی ہے۔ تعاونو اعلی البر والتقوی ولا تعاونو اعلی الاثم والعدوان (مائدہ) تعمیر و ترقی، خیر و بھلائی اور نیکی کے میدان میں ایک دوسرے کا تعاون کرو اور ظلم و جور تخریب و فساد اور برائی میں کسی کا ساتھ نہ دو۔ واذا حییتم بتحیة فحیو ابا حسن منها او ردوها (النساء) جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو۔ باہمی میل جول اور تعلق کے لئے سلام و کلام ایک مفید اور موثر ذریعہ ہے۔ غیر مسلموں کو سلام میں پہل کرنے سے متعلق اہل علم کی دورائے ہیں۔ تاہم جہاں موقع و محل اور سماجی ضرورت ہو وہاں پہل میں کوئی حرج نہیں۔ سلام اور جواب سلام کے وقت چہرہ پر مسکراہٹ اور گفتگو میں شیرینی و لطافت اور خیر خواہی و ہمدردی کے اظہار سے معاشرہ میں دوستانہ فضا اور خوشگوار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے قولو اللناس حسنا (البقرہ) لوگوں سے اچھی بات کہو، کسی بھی سماج اور معاشرہ کے لوگوں میں اچھے تعلقات اور باہمی ربط و ضبط پیدا ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کریں اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائیں۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں خیر الناس من ینفع الناس لوگوں میں اچھا آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔

امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے ایک محبوب صحابی حضرت معاذ بن جبل کو یہ نصیحت کی۔ ''یا معاذ احسن خلقک للناس : اے معاذ! لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ''۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو نبی کریم ﷺ نے یہ تاکید فرمائی ''تم لوگوں کے لئے وہی چاہو جو تم اپنے نفس کے لئے چاہتے ہو''

واحب للناس ماتحب لنفسک

نیز ارشاد فرمایا "**لایومن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسه** : " تم میں سے کسی شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ لوگوں کے لئے بھی اسی سلوک اور برتاؤ کو پسند کرے جو اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے۔"

نیز فرمایا "**لا یرحم لایرحم**۔ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا وہ بھی رحم کے قابل نہیں"۔ نیز فرمایا تم زمین والوں پر رحم وکرم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا"۔ نیز فرمایا"جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرے گا"۔ نیز فرمایا "**الخلق عیال الله واحب الی الله من احسن الی عیاله**۔ مخلوق، خدا کا کنبہ ہے جو شخص بھی اللہ کے عیال کے ساتھ نیک برتاؤ اور حسن سلوک کرے گا تو وہ اللہ کے نزدیک محبوب بندہ قرار پائے گا۔"

تعلقات کے باب میں پڑوسیوں سے ربط وضبط کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ وہی ہم سے قریب رہتے ہیں۔ اگر اچانک آدمی پر کوئی مصیبت آئے تو سب سے پہلی مدد پڑوسیوں ہی سے مل سکتی ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات کی ہدایت فرمائی اور پڑوسیوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف دینے سے منع فرمایا۔ ایک دن حضرات صحابہ کے درمیان آپ تشریف فرما تھے کہ ایک دل نشین پیرایہ میں کہا۔"خدا کی قسم! وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ اس انداز تخاطب سے صحابہ حیران ہوگئے اور عرض کیا۔ کون یا رسول اللہ! فرمایا۔ وہ جسکا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں"۔ ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا۔"جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے"۔ نیز ارشاد فرمایا"مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہے"۔ نبی کریم ﷺ کی یہ ہدایتیں عام ہیں۔ پڑوسیوں میں ہر مذہب اور ہر عقیدہ کے لوگوں کو شامل رکھا گیا ہے اور حسن سلوک میں کسی قسم کے امتیاز کی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ حضرات صحابہ نے تعلیمات نبویؐ سے یہی مفہوم اخذ کیا۔ عبداللہ بن عمر کا ایک بیان ابوداؤد میں موجود ہے۔"حضرت عبداللہ کے گھر میں ایک مرتبہ عمدہ کھانا تیار ہوا تو وہ پڑوسیوں میں تقسیم کیا گیا، اس موقعہ پر آپ نے گھر والوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی کھانا بھیجا، کیونکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت جبرئیل مجھے ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں تو یہ سمجھ لیا تھا کہ پڑوسی کو بھی وراثت اور ترکہ میں حق دار بنا دیا جائے گا۔"

اسلام نے جہاں تعلقات کے استوار اور خوشگوار بنانے کی ہدایات دی ہے وہاں تعلقات میں فساد و بگاڑ اور آپس میں دشمنی پیدا کرنے والے اسباب اور عوامل سے بچنے کی ہدایات بھی دی ہے۔ ان اسباب میں پہلا سبب مال و دولت کی غیر منصفانہ تحصیل اور عزت ریزی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے تاکید کی کہ تم اپنے اموال کو ناجائز اور باطل طریقہ سے مت کھاؤ **ولا تاکلو اموالکم بینکم بالباطل (النساء)** نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، "تمہاری عزتیں تم پر ایک دوسرے پر حرام ہیں، خبردار کسی کی عزت پر حملہ نہ کرنا"

مال ناجائز اور غلط طریقہ سے کھانے اور عزت وآبرو پر حملہ کرنے کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ سماج کے کسی بھی طبقہ کا مال ظلم وجور اور غلط طریقہ سے نہیں کھایا جا سکتا اور نہ ہی کسی طبقہ کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔

لوگوں کی دل شکنی اور تعلقات میں خلل کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ لوگوں کا اکرام واحترام نہ کیا جائے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ہدایت دی کہ"لوگوں کے مقام اور مرتبہ کے لحاظ سے پیش آؤ اور ہر ایک کے ساتھ احترام اور اکرام سے پیش آؤ"، چنانچہ ایک مرتبہ عدی بن حاتم

آپ ﷺ سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ مجلس لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور کہیں بیٹھنے کی جگہ نظر نہیں آ رہی ہے تو وہ دروازہ ہی پر کھڑے ہو گئے، جب آنحضرت ﷺ کی نظر ان پر پڑی تو آپ ﷺ نے اپنے جسم مبارک سے چادر نکالی اور عدی کی جانب پھینک دیا تا کہ وہ اس چادر کو بچھا کر وہیں بیٹھ جائیں۔

تعلقات کے باب یہ بات بھی ہے کہ کسی فرد یا گروہ کے درمیان اچھے تعلقات کو دوام واستمرار حاصل رہتا ہے اور تعلقات میں انقطاع کی حالت عارضی اور وقتی رہتی ہے اور حالات کے تغیر اور ان کے تقاضوں کے باعث پھر سے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں، چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی قوموں اور ملکوں کے درمیان لڑائیاں ہوئی ہیں تو لڑائیوں کا زمانہ قلیل رہا ہے اور اس کے برعکس امن کا زمانہ طویل رہا ہے، جنگ عارضی چیز ہے تو امن دائمی چیز ہے اور کسی بھی سماج اور سوسائٹی کے حالات میں تغیر وتبدیلی ایک فطری اور ناگریز صورت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے سلوک اور برتاؤ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جنگ بھی کی، صلح بھی فرمائی اور امن کے ساتھ رہے۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی مختلف حصوں میں منقسم ہے۔ آپ کی زندگی کا پہلا دور وہ ہے جس میں آپ ﷺ نے نبی ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ یہ زمانہ چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں مسلم اور غیر مسلم کی اصطلاح وجود میں نہیں آئی تھی، سارے انسان قبیلوں میں منقسم تھے، قبائلی نظام رائج تھا، عربوں میں عرف وعادت اور رسم ورواج ہی کو قانونی حیثیت حاصل تھی، ان کے گردونواح میں آسمانی مذاہب میں سے یہودیت اور مسیحیت رہ گئے تھے لیکن حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات یہودیوں اور عیسائیوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ سارے سماج اور معاشرہ میں ظلم اور جہل کا عفریت سر اٹھائے ہوئے تھا، لوگوں کی جان، مال اور عزت کے لئے کوئی تحفظ نہ تھا۔ دن دھاڑے مسافروں کا مال لوٹ لیا جاتا تھا، عورتوں کی عزت لٹ جاتی تھی اور سماج میں انہیں کوئی باعزت مقام حاصل نہ تھا۔ ضعیفوں، ضرورت مندوں، یتیموں اور مظلوموں کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا۔ ہر طرف بدامنی اور انارکی پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں سب سے پہلے نبی کریم ﷺ نے اصلاح اور قیام امن کی جدوجہد شروع کی۔ انسانوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت کے خیال سے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ قبائل عرب کے سرداروں کو جمع کر کے ان کے سامنے اپنے ملک کی بدامنی کا نقشہ کھینچا اور ''حلف الفضول'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی تا کہ اس کے ذریعہ اجتماعی حیثیت سے غریبوں محتاجوں، مسافروں اور مظلوموں کی حمایت ہو سکے۔ آپ ﷺ کی آواز پر بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب، بنو اسد، بنو زہرہ اور بنو تمیم کے سلیم الفطرت اشخاص جمع ہوئے اور انجمن کے اغراض ومقاصد کو پورا کرنے کا حلفیہ عہد باندھا۔

نبی کریم ﷺ کو یہ اصلاحی اور انسانیت نواز تنظیم اتنی عزیز تھی کہ آپ منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد بھی اس انجمن کو یاد کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا: ''مجھے آج بھی ایسے معاہدے کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں''۔

آپ کا یہ فرمان موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لئے بین الاقوامی اور بین الممالکی تعلقات قائم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

بعثت نبوی سے پہلے نبی کریم ﷺ اپنی انسانیت نوازی وشرافت پسندی، ہمدردی وخیر خواہی، سچائی وصفائی، امانت داری ودیانت داری اور معاملہ فہمی کے باعث عرب قوم کی آنکھ کا تارہ بنے ہوئے تھے، ساری سوسائٹی میں آپ ﷺ کی ذات گرامی معزز ومحترم اور مرکز ومحور بنی ہوئی تھی۔ اور لوگ آپ کو اصلی نام محمدؐ سے کہیں زیادہ وصفی نام صادق اور امین سے جاننے اور پہچاننے لگے تھے، قومی اور سماجی مسائل میں آپ کا قول

قول فیصل سمجھا جاتا ہے۔آپ کی عمر شریف کے پینتیسویں سال کا واقعہ ہے کہ قریش نے خانہ کعبہ کی جدید تعمیر کی۔ جب حجر اسود کو بیت اللہ کی دیوار میں نصب کرنے کا مرحلہ آپہنچا تو ہر قبیلہ کی خواہش رہی کہ یہ سعادت اس کے حصہ میں آئے، اور یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ اور بھیانک شکل اختیار کر گیا کہ قبائل کے درمیان جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ بحث وتکرار کا سلسلہ طول کھینچا تو ابوامیہ بن مغیرہ نے کسی شخص کو حکم بنا کر فیصلہ کرنے کی تجویز رکھی اور اتفاق رائے کے ساتھ یہ بات طے پا گئی کہ کل صبح سویرے جو سب سے پہلے حرم میں پہنچے گا وہی سب کا حکم ہوگا، چنانچہ دوسرے دن حرم میں جس ذات گرامی کو دیکھا گیا وہ نبی کریم ﷺ تھے۔آپ کو دیکھنا ہی تھا سارے قبیلے والے بیک زبان ہو کر نعرہ لگائے هذا الامين رضيناه ''ہم اس امین سے راضی ہیں''۔اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے ایک حکیمانہ تدبیر یہ اختیار کی کہ ایک چادر زمین پر بچھا دی اور اس میں حجر اسود کو رکھا اور ہر قبیلہ کے سردار کو طلب کیا اور کہا تم سب مل کر اس چادر کے چاروں طرف سے پکڑ کر اوپر اٹھائیں۔سب نے حکم کی تعمیل کی پھر آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے سنگ اسود کو اٹھا کر بیت اللہ کے دیوار میں نصب کر دیا۔اس طرح سے آپ ﷺ نے اپنی معاملہ فہمی اور زیرکی کے باعث ساری قوم کو ایک بھیانک خوں ریزی سے بچالیا۔اور سارے قبیلے والے آپ ﷺ کے اس طرز عمل سے بہت ہی خوش اور مسرور ہوئے۔

نبی کریم ﷺ کی عمر شریف چالیس سال کی ہوئی تو آپؐ دنیا کے سامنے ایک پیغمبر کی حیثیت سے جلوہ نما ہوئے۔ یہاں سے آپ کی نبوی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔اور یہ دور، تیرہ سال پر مشتمل ہے۔مکہ کے سارے لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے، خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، شرک کی اس فضا میں آپؐ نے خدائے واحد کی عبادت و پرستش کی بات کہی تو آپؐ اور مکہ والوں کے درمیان اختلاف کھڑا ہوگیا۔ پھر اس اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحابؓ پر ہر طرح کا ظلم شروع ہوگیا۔آپؐ کے گھر کے سامنے کانٹے ڈال دئے جاتے تاکہ آپؐ جوں ہی باہر تشریف لائیں تو آپؐ کے پیروں میں چھپ جائیں اور آپؐ کے گھر میں گندگی اور غلاظت پھینکی جاتی تاکہ آپؐ اور آپؐ کے گھر والوں کی صحت اور سکون میں خلل واقع ہو جائے اور جب کبھی آپؐ حرم شریف میں نماز ادا فرماتے تو آپؐ کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتے تاکہ آپؐ کی جان نکل جائے، آپؐ کا گذر بازاروں سے ہوتا یا آپ میلوں میں دعوت حق دینے کے لئے چلے جاتے تو آپؐ پر حقارت آمیز اور دل آزار جملے کسے جاتے اور آپؐ کو ساحر، مجنوں اور کاہن کہہ کر پکارا جاتا۔آپؐ کے پیچھے بدتمیز اور آوارہ لڑکوں کو لگا دیا جاتا اور وہ آپؐ پر پتھر پھینکتے اور شور وغل مچاتے ہوئے آپ کو تنگ کرنے لگتے، ایسے وقت کبھی آپؐ ابوسفیان کے گھر سے قریب ہوتے تو تیزی سے چل کر ان کے گھر میں گھس جاتے تھے۔ابوسفیان اگرچہ کہ مسلمان نہیں تھے تاہم ان سے یہ شرافت اور انسانیت ظاہر ہوتی کہ وہ گھر سے باہر نکل کر آوارہ لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیتے تھے۔شاید ابوسفیان کی اس انسانیت نوازی کا صلہ تھا کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر یہ اعلان کیا جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے بھی امان ہے، من دخل في دار ابي سفيان كان امنا

مکہ والوں کا یہ جور وستم نبی کریم ﷺ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ آپؐ کے اصحابؓ پر بھی گوناگوں ستم ڈھائے جا رہے تھے۔آپؐ اور آپؐ کے اصحابؓ ہر طرح کی ذہنی اذیتیں اور جسمانی ایذائیں سہتے رہے لیکن کسی قسم کی جوابی کارروائی کو پسند نہیں کیا۔ جب بعض اصحابؓ نے اس ظلم کے دفاع کی اجازت چاہی تو آپؐ نے لڑائی کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنے جان نثاروں سے کہا تم لوگ مکہ ہی چھوڑ دو اور حبش چلے جاؤ۔ اس اجازت کے بعد بارہ مرد اور چار عورتوں پر مشتمل ایک مختصر سا قافلہ بندرگاہ جدہ سے جہاز میں سوار ہو کر حبشہ چلا گیا۔اس قافلہ میں نبی کریم ﷺ کے داماد حضرت عثمانؓ بن عفان اور ان کی اہلیہ صاحب زادی رسول حضرت رقیہؓ بھی تھیں۔اس کے بعد پھر دوسرا قافلہ مکہ سے حبش چلا گیا جس

میں ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں تھیں۔

مکہ والوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ بعض مسلمان حبشہ چلے گئے ہیں اور وہاں سکون و عافیت کے ساتھ ہیں تو ان سے رہا نہ گیا۔ قریش کا ایک وفد حبشہ پہنچ گیا اور بادشاہ کی خدمت نذرانے اور تحفے پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ ہمارے ملک کے کچھ لوگ بھاگ کر آپ کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ انہیں ہمارے حوالہ کر دیا جائے۔ نجاشی حقیقت حال کی جانکاری کے لئے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا اور ان سے مکہ چھوڑ کر اس کی مملکت میں آنے کا سبب پوچھا تو اس وقت حضرت جعفرؓ نے دربار میں ایک مختصر تقریر کی۔ اس تقریر سے جہاں عربوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت پر روشنی پڑتی ہے وہاں مسلمانوں کے اوپر ہونے والے غیر مسلموں کے ظلم و جور کا علم بھی ہوتا ہے اور تعلیمات نبویؐ کی بھی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔

حضرت جعفرؓ کی تقریر کا ما حصل یہ ہے:

’’اے بادشاہ ہم جہالت کے اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے، ایک خدا کے بجائے کئی خداؤں کو اپنا معبود بنا رکھا تھا، ہم لوگ ہر قسم کی گندگی اور نجاست میں مبتلا تھے، مردار کھاتے تھے، ہماری زبانیں فحش اور بے ہودہ باتوں سے آلودہ تھیں، ہمارے اندر انسانیت اور شرافت کی کوئی چیز نہ تھی، ہمیں اپنے ہمسایوں کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا مطلق خیال نہ تھا، ہمارے معاشرہ میں قانون نام کی کوئی چیز نہ تھی، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہماری ہی قوم میں سے ایک نیک انسان کو نبی بنایا جس کے اعلیٰ حسب و نسب اور اخلاق حسنہ سے ہم سب خوب واقف تھے انہوں نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ ایک خدا کی عبادت کریں، بتوں کی پوجا و پرستش چھوڑ دیں۔ ہمیشہ سچ بولیں، وعدہ پورا کریں، ہر قسم کے گناہ سے بچتے رہیں، ظلم سے دور رہیں، رحم کریں، غریبوں اور محتاجوں اور ضعیفوں کا خیال رکھیں، صدقہ دیں، نماز پڑھیں، روزہ رکھیں۔

ہمیں یہ باتیں بھلی لگیں تو ہم ان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ اس پر ہماری قوم ہم پر برس پڑی اور بگڑ بیٹھی اور ہم پر طرح طرح ستم ڈھائے تا کہ ہم خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت چھوڑ دیں اور ہمارے ہاتھوں سے بنائے ہوئے لکڑی اور پتھر کی مورتیوں کی پرستش کرنے لگ جائیں۔ ہم نے ان کے ہاتھوں بڑی مصیبتیں جھیلیں اور بے پناہ اذیتیں سہیں۔ اور جب مجبور ہو گئے تو آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے چلے آئے۔

نجاشی یہ تقریر سن کر متاثر ہوا اور مسلمانوں سے کہا مجھے کلام الٰہی سنایئے جو پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت کی جس میں حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کا ذکر ہے اور ان کے بندۂ خدا اور صاحب وحی ہونے کی تفصیل ہے۔ قرآن کریم کی اس سورت کو منتخب کرنے کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ نجاشی عیسائی ہے اور یمن میں پھیلے ہوئے باطل اور گمراہ کن عیسائیت کی اصلاح ہو سکے۔ نجاشی نے سورہ مریم سنی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور بہت متاثر ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے کہا محمد (ﷺ) تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا، پھر بادشاہ نے قریش کے وفد کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا اور کہا کہ میں ان مظلوموں کو تمہارے حوالہ نہیں کر سکتا۔

حبشہ میں رہائش پذیر مسلمانوں کو کسی قدر سکون کا سانس ملا لیکن مکہ مکرمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمان مسلسل تکالیف جھیلتے رہے۔ نبوت کے ساتویں سال قریش نے نبی کریم ﷺ پر ظلم و ستم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا کہ مکہ کے اکثر قبیلوں کو جمع کیا اور سب سے یہ قرارداد منظور کروالی کہ نبی کریم ﷺ کے قبیلہ بنو ہاشم سے رشتہ ناطہ توڑ لیا جائے اور ان کی لڑکیوں سے کوئی نکاح نہ کرے اور نہ اپنی بیٹی بیاہی دے۔ اور ان سے کسی قسم

کی خرید وفروخت نہ کی جائے اوران سے بات چیت نہ کی جائے۔ مکہ کی گلیوں میں کہیں بھی چلنے پھرنے نہ دیا جائے۔ یہ ساری شرطیں تحریر پر لائی گئیں اوراس معاہدہ کے کاغذ کو بیت اللہ پر لٹکایا گیا تا کہ کوئی بھی قبیلہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرے، قبائل کے اس مشترکہ اعلانیہ کے بعد نبی کریم ﷺ اور خاندان بنو ہاشم کے سارے افراد گھر بار چھوڑ کر شعب ابی طالب نامی ایک پہاڑ کی گھاٹی میں محصور ہوگئے۔ قریش نے غلہ واناج کی سپلائی بند کردی۔ بنی ہاشم کے ننھے ننھے معصوم بچے بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر اس قدر رویا کرتے کہ ان کی آوازیں گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھیں۔ تین سال تک نبی کریم ﷺ اور آپ کے افرادِ خاندان سماجی بائیکاٹ سے پیش آنے والی مصیبتیں جھیلتے رہے۔ معاہدہ کے کاغذ کو دیمک نے کھالیا، قریش اور دیگر قبائل نے لوگوں سے گھاٹی پر پہرے ہٹالے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ باہر نکلے۔

نبوت کے دسویں سال نبی کریم ﷺ کے چچا ابو طالب دنیا سے کوچ کر گئے۔ ابو طالب اگر چہ کہ مسلمان نہیں تھے تاہم اپنے بھتیجے کے زبردست حامی اور مددگار تھے۔ ان کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کو تحفظ حاصل تھا۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ابولھب کو مکہ کی سرداری حاصل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ کا یہ حقیقی چچا روزِ اول ہی سے آپ کا سخت ترین دشمن تھا جوں ہی قیادت ملی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کو بنو ہاشم کی نسل اور قبیلہ سے خارج کر دیا۔ جس کی تائید سب نے کی۔ عربوں کے عرف میں اخراج کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اب کوئی نبی کریم ﷺ کی جان بھی لے لے تو بنو ہاشم اس کا انتقام نہیں لیں گے۔ ان حالات میں نبی کریم ﷺ نے طائف کا رخ کیا تا کہ وہاں کے باشندوں کو دین کی دعوت دیں۔ طائف کی طرف جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے رشتہ دار تھے، اس لئے آپ کو بڑی امید نظر آئی کہ ننھیالی تعلق کام آئے گا۔ لیکن ماموؤں کی زمین چچاؤں کی زمین سے کہیں زیادہ بے رحم نکلی طائف والے مکہ والوں سے کہیں زیادہ سخت دل اور بے رحم نکلے اور آپ ؐ کو طائف سے نکل جانے کا حکم دیا، اس زبانی حکم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آوارہ اور شریر لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ بد تمیز لڑکے آپ ؐ پر پتھر پھینکتے ہیں جس سے آپ ؐ لہو میں نہا گئے۔

نبی کریم ﷺ طائف کی طرف پاپیادہ نکلے تھے۔ مختلف تکلیفوں اور ایذاؤں کو سہتے ہوئے پھر سوئے مکہ چل پڑے۔ طائف کا ایک باشندہ بھی اسلام سے مشرف نہیں ہوا لیکن آپ ؐ نے مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اور نہ ہی طائف والوں کے لئے بددعا کی۔ اس موقعہ پر فرشتہ کا نزول ہوا اور اس نے کہا اے نبی ؐ! آپ کہہ دیں تو طائف کے دونوں پہاڑوں سمیت اس شہر کو زمین میں دھنسا دوں، رحمت عالم ﷺ نے کہا نہیں اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو کیا ہوا، انکی آئندہ نسلیں ضرور خدا پر ایمان لائیں گی۔

نبی کریم ﷺ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گئے لیکن یہاں ایک نئی مصیبت آپ ؐ کے سامنے کھڑی ہوگئی کہ اب آپ ؐ شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ابولھب نے آپ ؐ کو قوم وقبیلہ سے باہر کر دیا تھا جس کی تائید سارے قبیلوں والوں نے کی۔ اب داخلہ کی صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ کوئی شخص آپ کو اپنی پناہ میں لے۔ نبی کریم ﷺ شہر سے باہر رُک گئے اور ایک اعرابی کی مدد سے اپنی والدہ کے ایک رشتہ دار کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ آپ ؐ کو اپنی پناہ میں لے۔ اعرابی مکہ میں داخل ہوا اور کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور عرض کیا کہ اس شخص نے جواب دیا کہ میں پناہ نہیں دے سکتا۔ میں مکہ کا اصلی باشندہ نہیں ہوں۔ حضور اکرم ؐ نے اپنی دوسری اہلیہ حضرت سودہ بنت زمعہ ؓ کے ایک رشتہ دار کے پاس اعرابی کو بھیجا تو یہ جواب ملا کہ میں بڑے خاندان اور قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں، مجھ میں یہ ہمت نہیں ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اعرابی کو حضرت خدیجہ ؓ کے ایک رشتہ دار کے پاس بھیجا تو اس نے امان دینا قبول کیا اور اپنے رشتہ داروں کو لئے ہوئے ہتھیار بند ہو کر نبی کریم ﷺ کے پاس آپہنچا

اور اپنی پناہ کے اعلان کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں اقامت کا موقعہ فراہم کیا۔ اس واقعہ کا نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر بڑا گہرا اثر ہوا کہ اپنے ہی مولد ومسکن میں اجنبی کی حیثیت ہوگئی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو معراج سے سرفراز فرمایا اور یہ بشارت دی صبح روشن جلد طلوع ہوگی، چنانچہ نبوت کے گیارہویں سال یثرب سے چند آدمی آئے۔ یہ حج کا موسم تھا۔ نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی۔ اسلام سے مشرف ہوئے۔ اپنے شہر پہنچ کر اسلام کی دعوت دوسروں کو دی۔ نبوت کے بارہویں سال یثرب کے کچھ اور لوگ آئے اور مشرف با اسلام ہوئے۔ نبوت کے تیرہویں سال کچھ لوگ بارگاہ نبویؐ سے حاضر ہوئے اور اسلام سے مشرف ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو یثرب آنے کی دعوت دی۔ آپؐ یثرب چلے جانے کا عزم کر لیتے ہیں اور اپنے جان نثاروں کو بھی یثرب چلے جانے کا حکم دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی خبر دشمنوں کو مل جاتی ہے تو وہ دار الندوہ میں ایک اجلاس بلاتے ہیں جس میں بنو عبد شمس، بنو نوفل، بنو عبد الدار، بنو اسد بن عبد العزیٰ، بنو مخزوم، بنو سہم کے سردار اور ابو سفیان بن حرب وغیرہ جمع ہوتے ہیں اور یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے خلاف کیا قدم اٹھایا جائے۔ قبیلہ بنی مخزوم کا نمائندہ ابو جہل بن ہشام یہ رائے دیتا ہے کہ عرب کے مشہور قبیلوں سے ایک ایک نوجوان کو لیا جائے اور رات کی تاریکی میں محمد ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جائے۔ وہ جوں ہی باہر نکلے تو بیک وقت سب مل کر ان پر وار کریں۔ اس اجتماعی قتل کا فائدہ یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے قبیلہ بنو ہاشم میں اتنی ہمت اور سکت نہ ہوگی کہ وہ محمد ﷺ کے خون کا بدلہ سارے قبیلوں سے لے سکے۔ اس منصوبہ کے تحت کاشانہ نبوی کا محاصرہ کر لیا جاتا ہے۔ پیکر نورؐ دروازہ کھول کر سب کے سامنے سے گذر جاتا ہے لیکن کوئی دیکھ نہیں پاتا۔ نبی کریم ﷺ حرم شریف پہنچتے ہیں۔ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ وطن کی جدائی سے دل بھر آجاتا ہے۔ آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اے اللہ! مکہ مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے بندے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے ہیں۔ ایک غیر مسلم عبد اللہ بن اریقط کی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور یثرب کی عام شاہراہ چھوڑ کر دوسرے راستہ سے یثرب کے لئے نکل جاتے ہیں۔ اس ہجرت سے نبی کریم ﷺ کی زندگی کا دوسرا دور اختتام کو پہنچتا ہے۔ جو نبوی دور اور مکی دور کہلاتا ہے اور تیرہ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد زندگی کا تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے جو ساڑھے دس سال پر پھیلا ہوا ہے اور یہ مدنی دور کہلاتا ہے۔

قوموں اور مصلحوں کی تاریخ میں یہ انوکھی مثال ہے کہ نبی کریم ﷺ ظلم کا دفاع کرنے کی بجائے اپنے وطن ہی سے ہجرت کرتے ہیں اور آپؐ کے اصحابؓ بھی اپنی زمینیں، جائداد، مکانات سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یثرب چلے جاتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز واقعہ نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کے امن پسند اور غیر متشدد ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ نبی کریم ﷺ یثرب پہنچے تو وہاں کے مسلمان اور غیر مسلمان سارے باشندے مسرور ہوئے۔ اظہار خوشی کی ایک صورت یہ بھی رہی کہ اپنے شہر یثرب کا نام بدل دیا اور آپ کی نبوی نسبت سے "مدینۃ النبی" رکھا جو آگے چل کر مدینہ منورہ ہوگیا۔ یہود تو خصوصیت کے ساتھ آپ کی آمد کے منتظر تھے تاکہ اسلام قبول کرنے میں دوسری قوموں سے سبقت اور اولیت کا شرف حاصل کیا جاسکے۔

ترک وطن کے بعد بھی مکہ والوں سے نبی کریم ﷺ کی دشمنی ختم نہیں ہوئی۔ اہل مدینہ کو لکھ بھیجا کہ تم نے ہمارے دشمن (محمد ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ انہیں ختم کردو یا شہر سے نکال دو ورنہ ہم تمہارے خلاف چڑھائی کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایسی صورت آکھڑی ہوگئی کہ اپنی جان وعزت کے تحفظ اور اپنی فکر ورائے کی آزادی کے لئے دفاعی جنگ کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

نبی کریم ﷺ جب مدینہ پہنچے تو یہاں مختلف قومیں اور قبیلے آباد تھے اور ان کے درمیان باہمی دشمنی تھی اور یہ سب ایک دوسرے سے برسر

پکارتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ کی تمام قوموں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ سارے لوگ اپنے اپنے مذہبی اور قبائلی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک متحدہ مملکت قائم کرلیں۔ اس بات کو یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین سب نے قبول کرلیا اور آنحضرت ﷺ کو اتفاق رائے کے ساتھ سردار تسلیم کرلیا۔ آپ ﷺ کی قیادت پر سب متفق ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی سرداری کو پسند نہیں کررہا تھا۔ نبی کریم ﷺ مدینہ میں متحدہ مملکت قائم کرنے کے بعد قرب و جوار میں آباد غیر مسلم قبائل سے یہ کہہ کر معاہدے کرلیتے ہیں اگر تم پر کوئی حملہ کرے تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اگر کوئی ہم پر حملہ کرے گا تو تم ہماری مدد کروگے۔ مدینہ کے شمال میں قبیلہ جھیبیہ آباد تھا۔ وہ فوجی حلیفی پر آمادہ ہوگیا۔ اسطرح مدینے کے جنوب اور شمال میں آباد قبائل نے بھی جنگی حلیفی پر رضا مند ہوگئے اور ان معاہدات کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ ان میں اس بات کی وضاحت بھی تھی یہ صرف فوجی معاہدے ہیں ان کا دینی امور اور مذہبی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان معاہدوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا اگر کوئی بھی مدینہ پر حملہ کردے تو یہ جنگ سارے قبیلوں کی جنگ ہوگی اور حملہ آور سب کا مشترکہ دشمن سمجھا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ مکہ کی طرح یہاں بھی آخر وقت تک جنگ سے پہلوتہی کرتے رہے اور امن کو ترجیح دیتے رہے۔ اور جب بھی آپ کو جنگ کرنی پڑی تو اپنی طاقت کا محدود استعمال کیا جس کا نتیجہ تھا کہ آپ کے غزوات اور سرایا جن کی تعداد ۸۲ ہے۔ جس میں مسلمان شہداء کی تعداد تقریباً ۲۶۰، اور غیر مسلم مقتولین کی تعداد تقریباً ساڑھے سات سو ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم:

رسول اللہ ﷺ کی جب وفات ہوئی تو اس وقت اس وسیع سلطنت کا رقبہ تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پرامن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں۔ تین ملین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لئے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں۔ ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں تھی۔ دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے۔ بہرحال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے میں دو سے بھی کم ہے۔"

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں، عیسائیوں، کافروں اور مشرکوں کی خاصی تعداد تھی اور ان مختلف قوموں کی وجہ سے سرکاری، سیاسی، سماجی، شہری، تمدنی، علمی اور مذہبی مسائل پیدا ہونے لگے تو وحی الٰہی کے ذریعہ ہدایات ملتی رہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے تعلق اور برتاؤ سے کئی ایک مثالیں اور نظیریں وجود میں آگئیں جو مستقبل میں اسلامی مملکت اور مسلم سربراہوں کے لئے مشعل راہ بن گئیں۔

اس مملکت میں بسنے والے تمام غیر مسلم باشندوں کو ان کے مذہبی امور میں پوری پوری آزادی دی گئی اور ان کی جان و مال اور ان کی عزت و آبرو اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا مملکت کے فرائض میں شامل رہا اور مملکت اس خدمت کے عوض غیر مسلموں سے جزیہ کے نام سے خفیف رقم لینے کی مجاز قرار پائی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے حتی یعطوا الجزیة عن ید (التوبة)

جزیہ کا قانون غیر مسلم رعایا کے لئے ایک رحمت ہے لیکن بعض کوتاہ نظر اہل قلم نے جزیہ سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پیدا کردیں۔ حالانکہ اس جزیہ کی وجہ سے غیر مسلم رعایا کو جنگ سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے اور مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور وہ سرحدوں پر لڑائی میں مصروف رہتے ہیں اور غیر مسلم امن و امان کے ساتھ شہروں میں رہتے تھے اور اپنی تجارت وغیرہ میں لگے رہتے ہیں اور جزیہ کا قانون ایسا سخت گیر بھی نہیں ہے کہ غیر مسلم رعایا کو ہر حالت میں جزیہ ادا کرنا ہی چاہئے۔ مملکت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کمزور افراد سے جزیہ معاف کردے۔ اس کی مثال عہد فاروقی سے ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں ایک راستہ سے گذر رہے تھے کہ آپ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو لوگوں سے بھیک مانگ

رہا تھا۔ اس منظر سے آپ کو تکلیف ہوئی کہ میری حکومت میں ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے، کیونکہ آپ اپنی مملکت کی رعیت کو خوش حال دیکھنے کے خواہاں اور جویاں تھے۔ آپ سائل کے قریب گئے اور پوچھا کہ تم بھیک کیوں مانگ رہے ہو؟ بوڑھے شخص نے جواب دیا میں ایک یہودی ہوں۔ جب تک میں صحت منداور جوان رہا، تجارت کرتا تھا اور جزیہ کی رقم ادا کرتا تھا۔ اب جزیہ کی رقم ادا کرنے کے لئے میرے پاس بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس واقعہ سے حضرت عمرؓ بہت متاثر ہوئے۔ بیت المال کے نگران افسر کو طلب کیا اور اسی وقت یہ حکم جاری کردیا کہ اس یہودی کے گھریلو اخراجات کا لحاظ کرتے ہوئے روزینہ مقرر کردیں اور اس سے جزیہ معاف کردیں۔ اسی موقعہ پر آپ نے یہ بات بھی کہی کہ ہم اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو چھوڑ دیں۔

اس مقام پر تقسیم زکوۃ پر بھی ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ کیسا حسن سلوک کیا ہے۔ فقہاء کی اکثریت نے اگر چہ کہ زکوٰۃ کی رقم کو صرف مسلمانوں سے مختص کر رکھا ہے تاہم بعض فقہاء نے غیر مسلموں کو بھی زکوٰۃ دینے کی تائید کی ہے۔ فقہائے موئدین میں بزرگ صحابی حضرت عمر بن الخطابؓ کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ چنانچہ آپؓ نے ایک یہودی کو زکوۃ کی رقم دلوائی اور یہ ارشاد فرمایا **ھذا من مساکین اھل الکتاب**۔ یہ اہل کتاب (موسیٰ اور عیسیٰ کی امت) کے مسکین ہیں۔

حضرت عمرؓ، کے علاوہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ بھی زکوٰۃ کی رقم غیر مسلم مسکینوں کو دینے کے حق میں ہیں

المؤلفة قلوبھم: زکوٰۃ کی رقم ان لوگوں پر بھی صرف کی جائے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، قلوب کی تالیف کا معنی دلوں کو موہ لینا۔ دلوں کو موہ لینے کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی کوئی تفریق نہیں۔ اس مد کا تعلق ملک وملت اور وقت کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہ مسئلہ عہد نبویؐ اور خلافت اسلامیہ کے مختلف ادوار میں مختلف رائے اور فیصلوں کے زیر اثر رہا ہے لہذا اس مد کو عہد نبوی کے ساتھ مخصوص کردینا یا کسی ایک خانہ میں رکھنا اس کی افادیت کے دائرہ کو محدود کردیتا ہے، اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ بعض قوموں اور ملکوں سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس رقم کے ذریعہ ضرر کو ختم کیا جائے، یا یہ رقم نومسلموں کی دینی معاشی اور شہری ضرورتوں میں صرف کی جائے یا امام شافعی کی رائے کے مطابق فاسق مسلمانوں (جو بے علم اور ضعیف الاعتقاد ہوں) کے دلوں کو موہ لینے میں صرف کی جائے یا غیر مسلموں میں اسلام کی رغبت اور اس کی قبولیت کے خاطر صرف کی جائے

" **الرقاب** " یعنی زکوۃ کی رقم سے غلاموں کو آزاد کیا جائے۔ دنیا میں عہد نبوی سے قبل غلاموں کا چلن تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ہر ممکن پہلو سے غلاموں کو آزاد کرنے کی صورتیں اور شکلیں نکالیں، چنانچہ مختلف کفارات (مثلاً قسم کا کفارہ روزہ کا کفارہ وغیرہ) کے ذریعہ غلاموں کی آزادی کی راہ ہموار کردی اور غلاموں کو آزاد کرنا بڑے اجر وثواب والا عمل قرار دیا تاکہ کسی بھی طرح انسان کی غلامی کا دور ختم ہوجائے۔ غلاموں کی آزاد کرنے کے مسئلہ میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق نہیں ہے۔ اسلامی مملکت میں رہائش پذیر غیر مسلم افراد کسی وجہ سے بھی قید ہوگئے ہوں تو ان کو آزاد کرانا مملکت کے فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور حکومت میں یمن کے گورنر کو حکم دیا کہ دشمن کے قبضہ میں جتنے بھی لوگ ہیں خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان ان کی رہائی کے لئے سرکاری خزانہ سے رقم استعمال کرو۔

موجودہ زمانے میں غلاموں کا مسئلہ تو نہیں رہا لیکن قیدیوں کی شکل میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ ایسی صورت میں انسانیت کے رشتہ سے قیدیوں کی رہائی کے لئے زکوۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے۔ اس کی تاکید کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل سند ہے۔

غرض یہ کچھ باتیں تھیں جو سورۃ توبہ کی آیت کے ضمن میں عرض کی گئیں، جس میں زکوٰۃ کی رقم کن لوگوں میں تقسیم ہونی چاہیئے، صراحت ملتی ہے۔ ان مستحقین میں غیر مسلموں کو شامل کرنے کے مسئلہ میں فقہاء کی دو رائیں ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر ہمارے سامنے اس وقت یہ پہلو ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے تعلق اور برتاؤ کو نمایاں کیا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں میں کوئی کمال و خوبی دیکھی تو ان سے استفادہ کو معیوب نہیں سمجھا۔ چنانچہ جنگ بدر میں دشمن کے بعض افراد قید کر لئے گئے اور جب ان کی رہائی مالی فدیہ کے ذریعہ عمل میں آئی تو اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ ان قیدیوں میں سے بعض کو لکھنا پڑھنا آتا ہے تو آپؐ نے ان سے کہا۔ تم میں سے ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے تو یہی تم لوگوں کا فدیہ ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پہلی لڑائی سنہ دو ہجری میں ہوئی اور یہ لڑائی مکہ والوں نے شروع کی۔ مسلمانوں نے مدافعت کی اور عظیم الشان کامیابی حاصل کی تو اہل مکہ کے دلوں میں مسلمانوں سے پھر انتقام لینے کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے دوسری جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے علاوہ ایک اور انتقامی کارروائی یہ کی کہ ایک وفد کو حبشہ بھیجا تا کہ برسر اقتدار نئے نجاشی کو سمجھا بجھا کر حبشہ میں مقیم مسلمانوں کو مکہ واپس لایا جائے اور ان پر ظلم و ستم کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو خوف زدہ اور عاجز کر سکیں۔ نبی کریم ﷺ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فوراً ایک سفیر کو حبشہ بھیجا تا کہ نجاشی کو وہاں کے مقیم مہاجر مسلمانوں کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اس سفارتی کوشش کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ایسی اہم اور راز دارانہ مہم کے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک غیر مسلم عمرو بن امیۃ الضمری کا انتخاب فرمایا۔ اس سے ایک سبق ہمیں ملتا ہے کہ جو غیر مسلم قابل اعتماد اور اچھی صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ ان سے ربط اور استفادہ کو غیر شرعی فعل نہیں کہا جا سکتا۔ نبی کریم ﷺ کے اس طرز عمل کا یہ اثر ہوا کہ آپؐ کے بعد مختلف ملکوں کی مسلم سلطنتوں کے مختلف ادوار میں غیر مسلم اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے اور بڑی عمدہ خدمات انجام دیں، مورخین نے حضرت عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ اپنے دور خلافت میں "ہرمزان" نامی ایرانی نسل غیر مسلم شخص سے سیاسی امور اور جنگی معاملات میں تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

مکہ والے نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں کیا کچھ کر گذرے یہ تاریخ انسانی کا ایک سیاہ باب ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے کبھی ان کے ساتھ برا سلوک اور برا برتاؤ نہیں کیا۔ ہجرت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ اہل مکہ سخت قحط میں مبتلا ہو گئے۔ مکہ میں کاشت نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے شہروں سے وہاں غلہ پہنچتا تھا۔ جس کی وجہ سے مکہ والوں کو غلہ نہیں مل رہا تھا۔ صرف نجد ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں قحط کے اثرات نہیں تھے اور اسی جگہ سے مکہ والوں کو غلہ پہنچ رہا تھا لیکن بعض حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ یہاں سے بھی غلہ کی سپلائی موقوف ہو گئی۔ ایسے وقت میں نبی کریم ﷺ کے حسن سلوک کے باعث یہ بندش اٹھ گئی۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ پانچ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے کچھ سوار نجد کی طرف بھیجا، تو ایک مشتبہ شخص کو گرفتار کیے ہوئے مدینہ واپس آئے۔ گرفتار شدہ آدمی کو آپؐ نے پہچان لیا۔ یہ نجد کا دولت مند سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا۔

ثمامہ تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا۔ میرا حال اچھا ہے۔ میں ایک ذو دم ہوں۔ اگر آپؐ مجھے قتل کرنے کا حکم دیں گے تو آپؐ کا یہ حکم ایک خونی کے حق میں ہوگا کیونکہ میں ایک مسلمان کا قاتل ہوں۔ اگر آپ عفو سے کام لیں گے تو آپؐ ایک سپاس گذار پر رحم کریں گے۔ اگر آپ کو مال و دولت کی ضرورت ہے تو بتلا دیجئے کتنا مال چاہیئے؟ نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر کہا۔ کیا اب بھی تمہارے لئے وہ وقت نہیں آیا

کہ بت پرستی چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرے۔ ثمامہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نبی کریم ﷺ اسے اسلام قبول کرنے کی ترغیب دیتے رہے لیکن وہ آمادہ نہ ہوا۔ کچھ دن قید و بند میں رہا۔ اس کے بعد آپؐ نے بلا فدیہ اور کسی گزند کے بغیر ثمامہ کو رہا کر دیا۔ قید و بند کے دوران نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہؓ کے حسن سلوک اور برتاؤ کا اس کے قلب پر ایسا گہرا اثر پڑا کہ وہ اسلام میں داخل ہو گیا، اور حضور اکرم ﷺ سے کہا خدا کی قسم! مجھے دنیا میں آپؐ سے زیادہ کسی اور شخص سے نفرت نہ تھی، لیکن اب مجھے دنیا میں آپؐ ہی سب سے بڑھکر عزیز لگ رہے ہیں۔ حضرت ثمامہؓ مدینہ منورہ سے اپنے وطن نجد کی طرف جانے لگے تو چلتے چلتے حضور اکرم ﷺ سے کہہ گئے۔ یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے وطن پہنچتے ہی مکہ والوں کو اناج سپلائی بند کروں گا اور ایک دانہ بھی فروخت نہیں کروں گا۔ حضرت ثمامہؓ کے اس اقدام سے مکہ والوں کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ اس صورت حال سے مجبور ہو کر اہل مکہ نے ایک وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور آپؐ سے عرض کیا۔ ''اے محمدؐ! آپ تو رحم و کرم اور احسان کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپؐ کے شہر والے بھوکے پیاسے مر رہے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں ہم پر رحم و کرم نہیں کریں گے۔ نبی کریم ﷺ نے نجد کے سردار حضرت ثمامہؓ کو خط بھیجا کہ مکہ والوں کو غلہ اور دیگر اشیاءِ زندگی بھیج دو۔

اس موقعہ پر آنحضرت ﷺ نے اس سفارشی مکتوب ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے بھی پانچ سو اشرفیاں مکہ کے سردار ابو سفیان کی خدمت میں بھیجا تاکہ یہ رقم بھوکے پیاسے لوگوں میں تقسیم ہو سکے۔

ان دنوں اہل مکہ نبی کریم ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، لیکن آپ ﷺ نے ان باتوں کی طرف توجہ نہ کی اور انسانی ہمدردی اور رحم دلی کا ثبوت دیا اور آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اپنے دشمنوں پر غلہ کی رسد بند رہے اور انہیں تنگ اور مجبور کر کے اپنا فرماں بردار بنالے۔

غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے سلوک و برتاؤ میں یہ بات بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ آپؐ دیگر مذاہب کے سرکردہ اشخاص کا احترام فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ نجران کی عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ آپہنچا تو آپؐ نے اس کو عزت و احترام کے ساتھ مسجد نبوی سے قریب ٹھہرایا اور مہمان نوازی کی۔

ایک اور مرتبہ یمن کا ایک بڑا اور مشہور عالم اسقف بن ابی الحارث ساٹھ عیسائی علماء و احبار کے ساتھ مدینہ منورہ آیا۔ اور آپؐ سے ملاقات کیا۔ نبی کریم ﷺ نے مہمان نوازی کی۔ یہ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے مسجد نبوی کا ایک گوشہ عنایت فرمایا۔

نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تمام قوموں کو خود مختاری اور مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ قرآن کریم میں عیسائیوں سے متعلق یہ حکم ملتا ہے کہ اہل انجیل کو چاہئے کہ اللہ نے انجیل میں جو حکم دیا ہے اسی کے مطابق عمل کریں۔ ولیحکم اهل الانجیل بما انزل الله فیه اسی طرح یہودیوں کو بھی مذہبی آزادی اور خود مختاری حاصل تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہودی ایک نوجوان جوڑے کو آپؐ کی خدمت میں لے آئے اور عرض کیا کہ یہ دونوں زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپؐ انہیں سزا دیجئے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے پوچھا۔ تمہاری مذہبی کتاب ''توراۃ'' میں زنا کی سزا سے متعلق کیا حکم ہے؟ یہودیوں نے کہا، زانی اور زانیہ کا چہرہ سیاہ کیا جائے اور انہیں گدھے پر اس طرح بٹھایا جائے کہ ان کا منہ گدھے کی دم کی طرف ہو رہے۔ پھر سارے شہر میں گشت کرایا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے کہا، توراۃ میں تو ایسا نہیں ہے، توراۃ لائی جائے تو دیکھ لیں۔ چنانچہ توراۃ لائی گئی اور پڑھی گئی تو قاری نے دانستہ طور پر ''رجم'' کی آیت چھوڑ دی۔ اس وقت مجلس میں نومسلم عبداللہ بن سلامؓ بھی تھے جو پہلے یہودی تھے۔

انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بتلایا کہ یہ قاری آپؐ سے کچھ آیات کو چھپا رہا ہے۔اس کے بعد سنگسار والی آیت کی نشان دہی ہوی ور آپؐ نے تو راۃ کے حکم کے مطابق مجرموں کو سزا کا حکم سنایا۔دھوکہ اور مغالطہ کے اس واقعہ سے متاثر ہو کر نبی کریم ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کا حکم دے دیا تا کہ یہود آئندہ اس قسم کا دھوکہ نہ دے سکیں۔

نبی کریم ﷺ دوسروں کے مذہبی جذبات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابی اور یہودی کے درمیان کسی موضوع پر گفتگو رہی۔یہودی نے گفتگو کے دوران یہ کہہ دیا قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو سارے عالم پر فضیلت دی۔یہ سن کر صحابی نے کہا۔کیا سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی فضیلت دی؟ یہودی نے کہا۔ہاں! اس بات پر صحابی کو طیش آیا اور انہوں نے یہودی کو طمانچہ مار دیا۔یہ معاملہ نبی کریم ﷺ تک پہنچا تو آپؐ نے صحابی سے کہا ''قیامت میں حضرت موسیٰؑ سب سے پہلے ہوش میں آئیں گے''

نبی کریم ﷺ کا نہ صرف حضرت موسیٰ بلکہ ساری مخلوقات میں افضل ہونا ایک معروف بات ہے اور تو راۃ وانجیل سے بھی نبی کریم ﷺ کا افضل ہونا ثابت ہے۔اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اس موقعہ پر حضرت موسیٰؑ کی ایک امتیازی چیز بیان کی تا کہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی فضیلتوں کو لے کر غلو و تشدد اور تعصب و تحقیر کی روش اختیار نہ کریں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہدایت دی ولا تسبو الذین یدعون من دون الله۔دوسری قومیں جن کی عبادت کرتی ہیں ان کے راہبوں کو برا بھلا مت کہو۔

غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا ایک برتاؤ یہ بھی تھا کہ جب بھی کوئی بیمار ہو جاتا تو آپؐ اس کی مزاج پرسی فرماتے اور تسلی دیتے اور صحت کی دعا فرماتے۔ایک مرتبہ ایک یہودی نوجوان کے بیمار ہونے کی اطلاع آپؐ کو ملی جو اکثر آپؐ کی خدمت میں آجایا کرتا تھا اور بڑا خدمت گذار تھا۔آپؐ اس کے گھر تشریف لے گئے۔نوجوان زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔آپؐ نے اسلام کی دعوت دی تا کہ اس کی آخرت سنور جائے۔نوجوان نے اپنے باپ کی طرف دیکھا تو باپ نے کہا اعط ابا القاسم۔بیٹا ابوالقاسمؐ کی بات مان لو۔نوجوان کلمہ طیبہ پڑھا اور اس کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔باپ نے مسلمانوں کی طرز پر تجہیز و تکفین کی اجازت دے دی۔

ایک مرتبہ ایک غیر مسلم آپؐ کے گھر مہمان بنا۔رات کمرہ ہی میں رفع حاجت کیا اور صبح ہونے سے پہلے چلا گیا۔آنحضرت ﷺ صبح ہونے کے بعد اس کمرہ میں پہنچے تو غلاظت تھی۔یہ دیکھکر آپ کمرہ کی صفائی میں لگ گئے۔اسی اثنا میں وہ شخص اپنی چھوڑی ہوئی تلوار لینے کے لئے واپس گھر آیا اور کمرہ میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر شرمندہ ہو گیا،لیکن آپؐ نے اسے کچھ نہیں کہا۔آپؐ کے اس رویہ اور برتاؤ سے بہت متاثر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ سیرت کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی عادت بنالی تھی کہ جب بھی نبی کریم ﷺ اس کے دو منزلہ گھر کے سامنے سے گذرتے تو وہ اوپر سے آپ کے جسم مبارک پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتا تھا اور آپؐ اپنا جسم صاف کرتیا ور خاموش چلے جاتے تھے۔ایک مرتبہ آپؐ کے اس کے مکان کے سامنے سے گذرے تو اوپر سے گندگی نہیں گری تو آپ حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے اس کے گھر میں داخل ہو گئے،معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہے اور بستر پر پڑا ہوا ہے۔آپؐ اس کی مزاج پرسی کی۔جلد صحت یاب ہونے کی تسلی دی۔یہ شخص اپنے دل میں نادم و شرمسار ہو گیا اور آپ کے حسن اخلاق اور حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا اوا پنی غلطی کی معافی چاہی اور مشرف باسلام ہو گیا۔

ایک مرتبہ آپؐ بازار میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ کے سامنے ایک جنازہ گذرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔لوگوں نے کہا۔یہ یہودی

کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ بھی تو ایک انسان ہے۔ ان فیہ لنفسا

ام المومنین حضرت صفیہؓ کا خاندان یہودی تھا۔ نبی کریم ﷺ سے نکاح کے بعد انہوں نے اپنے غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلق منقطع نہیں کیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اپنے یہودی رشتہ داروں میں تیس ہزار درہم تقسیم کئے۔

نبی کریم ﷺ کے ساتھ غیر مسلموں کی جانب سے برا سلوک بھی ہوتا تو آپؐ اس کے جواب میں حسن سلوک ہی کا مظاہر کرتے تھے۔ ایک یہود عورت نے آپؐ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ آپؐ نے کھانا کھالیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس زہر کے اثر کو زائل کر دیا اور آپؐ سلامت رہے۔ جب اس عورت کا جرم ثابت ہوا اور اس کے اقبال جرم کرنے کے باوجود آپؐ نے اس یہودی عورت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

غرض سیرت نگاروں نے اس طرح کے ایک نہیں ہزاروں واقعات نقل کئے ہیں جن کی روشنی میں ایک حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے سلوک اور رویہ کی وجہ سے سینکڑوں لوگ مشرف با سلام ہوئے۔

شریعت محمدیؐ کا ایک قانون، قصاص ہے۔ اور قرآن کریم نے قصاص کو زندگی کہا ہے۔ دنیا میں یہی ایک ایسا قانون ہے جو لوگوں کی زندگی کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ جب کسی آدمی کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ کسی کو قتل کرنے کے بعد لازمی طور پر وہ بھی قتل کیا جائے گا تو یہی ایک خیال اسے دوسرے کے قتل سے باز رکھے گا۔ جان کے بدلہ جان اگر یہ قانون نہ ہو تو قتل وخون کا ایک بازار گرم ہو جائے گا۔ ہر کوئی ذرا ذرا سی بات پر قتل کر دے گا، آج دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسان قتل کئے جا رہے ہیں اور انہیں قتل سے روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان بے گناہ اور معصوم انسانوں کے قتل سے روکنے والی کوئی چیز ہے تو وہ صرف قصاص ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انسانی زندگی کے تحفظ واحترام کی خاطر قصاص کو نافذ کیا اور اس باب میں کسی قسم کی رعایت اور امتیازی سلوک کو روا نہیں رکھا۔ الا یہ کہ خون بہا کی صورت جو مقتول کے وارثوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ ایک مسلمان، غیر مسلم کو قتل کر دے تو قصاص میں مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا دماء ھم کدمائنا ، نبی کریم ﷺ کے بعد مسلمان حکمران بھی اسی روش پر گامزن رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک غیر مسلم شخص کو قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ سنایا قصاص میں مسلمان کو قتل کر دیا جائے۔ اگر مقتول کے افراد خاندان دیت پر راضی ہیں تو وہ جتنی رقم کا مطالبہ کریں، ادا کیا جائے۔

نبی کریم ﷺ کی مدنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ صلح حدیبیہ ہے جس کے بڑے دوررس نتائج مرتب ہوئے۔ اور اس واقعہ سے دنیا آپؐ کی امن پسندی، صلح جوئی اور انسانیت نوازی سے پوری طرح واقف ہوگی۔ ہجرت کے چھٹے سال ذی قعدہ کے مہینے میں نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ عمرہ کے خیال سے ہتھیارات کے بغیر صرف قربانی کے اونٹ لئے ہوئے مکہ مکرمہ کا رخ کرتے ہیں۔ اور حرم سے نو میل دور حدیبیہ میں ٹھہر کر حضرت عثمانؓ کے ذریعہ طواف اور عمرہ کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ لیکن آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے حالانکہ ذی قعدہ کے مہینے میں عرب جنگ نہیں کرتے اور اپنے دشمنوں کو بھی طواف سے نہیں روکتے۔ اس امتناع اور حضرت عثمانؓ کے شہید ہونے کی غلط خبر کے باعث بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ بالآخر عروہ بن مسعود جو غیر مسلم تھے اور قریش کے حامی اور طرف دار تھے۔ ان کی افہام وتفہیم کے باعث صلح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں چند شرائط کے ساتھ دس سال کے لئے ایک معاہدہ ہو جاتا ہے۔ معاہدہ کی بعض شرطیں صحابہ کرامؓ کو ناپسند تھیں اور انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو آنحضرت ﷺ نے انہیں سمجھایا کہ بظاہر یہ صلح دب کر ہو رہی ہے مگر ہمارے لئے فتح مبین ہے، چنانچہ اس امن معاہدہ کا سب سے بڑا فائدہ مسلمانوں کو یہ ہوا کہ نبی

کریم ﷺ کے اخلاق اور آپ کی تعلیمات سے عرب کے سارے قبائل روشناس ہوگئے ۔ مورخین نے لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں اتنی کثیر تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوگئے کہ پچھلے انیس سال میں اتنے لوگ داخل نہیں ہوئے تھے۔

قریش نے دوسال کے اندر یہ دس سالہ باہمی صلح کا معاہدہ توڑ دیا۔ نبی کریم ﷺ معاہدہ کی ایک شق کے مطابق اپنے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ کی دادرسی اور تعاون اور دیگر قبائل دوست دار کی حفاظت کے خیال سے مکہ مکرمہ کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ یہ فوجی اقدام اس قدر پرامن اور انسانیت نواز رہا کہ تاریخ انسانی میں ایسی مثال نہ اس کے قبل رہی اور نہ اس کے بعد آج تک قائم ہوسکی۔ مکہ مکرمہ پر چڑھائی کے وقت آپ نے اعلان کروادیا۔

''جوکوئی ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے، جوکوئی حرم میں چلا جائے اسے قتل نہ کیا جائے، جوکوئی اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے قتل نہ کیا جائے۔ جوکوئی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اسے قتل نہ کیا جائے۔ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے جوکوئی قید ہوجائے اسے قتل نہ کیا جائے۔''

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ خون خرابے کے بغیر آسانی کے ساتھ مکہ فتح ہوا صرف دو مسلمان شہید ہوئے اور ۲۸ مقابل کام آئے۔ نبی کریم ﷺ انتہائی عجز وانکساری کے ساتھ سر جھکائے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ عثمان بن ابی طلحہ کے پاس بیت اللہ کی کنجی تھی۔ ان کو طلب فرماتے ہیں۔ وہ نگاہیں جھکائے ندامت کے ساتھ حاضر خدمت ہوجاتے ہیں۔ نبوت کے ابتدائی دور میں نبی کریم ﷺ نے عثمان سے کہا تھا کہ بیت اللہ کھول دو میں اندر جانا چاہتا ہوں۔ یہ آنحضرت کی دشمنی وعداوت میں اندھے ہوچکے تھے۔ سختی کے ساتھ انکار کردیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ دوتین بار مسلسل اصرار کرتے ہیں لیکن وہ آپ کے لئے بیت اللہ کھولنا پسند نہیں کرتے۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ جملے نکل جاتے ہیں۔ عثمان تم دیکھ لینا ایک دن بیت اللہ کی کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جس کو چاہوں گا بیت اللہ کا متولی بنادوں گا۔ عثمان کو یہ بات ناممکن سی معلوم ہوئی۔ اس وقت کے حالات بھی کچھ اسی قسم کے تھے کہ کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ مکہ واپس لوٹ آئینگے اور یہ سارا علاقہ آپ کے زیرنگین ہوجائے گا۔ عثمان نے کہا کیا قریش کے سارے لوگ ذلیل وتباہ ہوجائیں گے کہ یہ کنجی آپ کے ہاتھ لگ جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے کہا اس روز قریش اور بھی عزت واقبال والے ہوجائیں گے۔ نبی کریم ﷺ عثمان کے ہاتھ سے بیت اللہ کی کنجی حاصل کرلیتے ہیں اور اپنے دست مبارک سے خانہ کعبہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوجاتے ہیں۔ اور نماز شکرانہ ادا فرماتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ حضرت بلالؓ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذاں دیں۔ حضرت بلال حبشی اور غلام تھے۔ عرب معاشرہ میں غلاموں کو اچھی اور برابری کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ایک غیر مسلم نے اپنے ساتھی کے ساتھ سرگوشی کی کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ یہ منظر دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کس طرح ایک کالا گدھا خدا کے گھر چڑھ کر چیخ رہا ہے۔

سیرت نگاروں نے اس غیر مسلم کا نام عتاب بن اسید بتلایا ہے یہی وہ عتاب بن اسید ہیں جب وہ مشرف باسلام ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے انہیں مکہ مکرمہ کا گورنر بنادیا۔

نبی کریم ﷺ کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے اور یہ سب کے سب آپ کے سخت ترین مخالف اور بدترین دشمن تھے۔ حضور ﷺ سب سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: '' آج تم سب مجھ سے کس قسم کے سلوک کی امید رکھتے ہو؟'' سب نے بیک زبان ہوکر عرض کی۔ انت اخ کریم وابن اخ کریم. اس سلوک اور برتاؤ کی امید رکھتے ہیں جو ایک شریف بھائی اپنے بھائی کے ساتھ اور ایک شریف بھتیجا اپنے چچا کے ساتھ پیش آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ عام معافی کا اعلان فرماتے ہیں **لا تثریب علیکم الیوم فاذھبوا انتم الطلقاء** آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا اور تم سب آزاد ہو۔ رسول کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ فرماتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ! بیت اللہ کی کنجی بنو ہاشم کے حوالہ فرما دی جائے۔ لیکن آپؐ کے ایثار و قربانی، داد و دہش، عفو و درگذر اور احسان و اکرام نے اسی دشمن غیر مسلم عثمان کو بیت اللہ کی کنجی سونپ دی۔ اس غیر متوقع نوازش سے عثمان کی نگاہیں پھٹی رہ گئیں۔ اور آپؐ کے حسنِ خلق کا اثر یہ ہوا کہ وہ آپؐ کے دامن رحمت سے وابستہ ہو گئے۔ نبی کریم ﷺ کے اس حسن سلوک کا عام اثر یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے مشرف ہو گئے

حاصل کلام۔ سیاق میں نبی کریم ﷺ کی سیرۃ طیبہ کے چند گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو چکی کہ غیر مسلموں کے ساتھ آپ ؐ کا سلوک و برتاؤ کس قدر انسانی اور اخلاقی رہا۔ اور غیر مسلموں میں جو اقوام اور قبائل آپؐ سے آمادہ جنگ ہو گئے تو آپؐ نے ان کے ساتھ جنگ کی اور یہ اقدام حالات اور ان کے تقاضوں کے تحت اپنی جگہ صحیح تھا۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات میں صبر و برداشت اور عدم تشدد کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ ''اگر کوئی شخص تمہارے گال پر طمانچہ مارے تو تم اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو''۔ لیکن یہی ناصح اور مصلح نے یہ دیکھا کہ پند و نصیحت سود مند نہیں تو جنگ کی بات اپنی زبان پر لائی۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے کے لئے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ اور اپنی امت سے کہا کہ تلوار خرید و بھلے سے تمہیں اپنی پوشاک فروخت کرنا پڑے۔

آنحضرت ﷺ نے سارے غیر مسلموں کو ایک ہی صف میں نہیں رکھا اور جو غیر مسلم ''ذمی'' اور مستامن تھے ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ خود مختاری اور مذہبی آزادی دے رکھی اور جن غیر مسلموں نے ذمیت کو قبول نہیں کیا اور مستامن (امن معاہدہ) کی صورت کا بھی انکار کر دیا اور جنگ کا طبل بجا دیا تو آپ ؐ کو مقابلہ کے لئے میدان میں آنا پڑا۔ جیسا کہ مدنی زندگی میں ایسے مواقع پیش آئے۔ ان حالات میں نبی کریم ﷺ نے اپنی جنگی کارروائیوں اور مقابلہ آرائیوں کو صرف ان ہی غیر مسلموں تک محدود رکھا جو آپؐ سے برسر پیکار رہے۔ اور وہ غیر مسلم اپنے شہروں میں پوری طرح محفوظ اور مامون رہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان لڑائیوں سے غیر جانب دار رہے۔ اسلام کی دعوت پیش کرنے کے معاملہ میں بھی آپؐ نے کسی طرح کے دباؤ اور جبر کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اس کام میں بھی آپ کے پیشِ نظر صرف اور صرف غیر مسلموں کی اخروی نجات کا خیال رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو ان کے آپ کا دل بھر آجاتا اور آپ کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے اور اس رنج و غم اور سوچ و فکر کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ شاید آپؐ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں لعلک باخع نفسک علی ان لا یؤمنوا بھذا الحدیث اسفا ایسی حالت اور کیفیت میں بھی آپ کی زبان مبارک سے یہ نکلتی اللھم اھد نی قومی فانھم لایعلمون اے اللہ میری امت کو ہدایت عطا فرما۔ وہ حقیقت جاننے سے بے بہرہ ہے۔

ہر نبی کو اپنی امت سے فطری محبت ہوا کرتی ہے جس طرح ایک باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے اور باپ کبھی اور کسی حالت میں اپنی اولاد کی تباہی و بربادی دیکھنا پسند نہیں کرتا اور سارے انسان نبی کریم ﷺ کی امت ہیں اور آپؐ کے دل میں اپنی امت کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ ہونا ایک فطری تقاضہ تھا یہی وجہ ہے کہ دنیا جہاں کے پیغمبروں اور مصلحوں میں صرف آپؐ ہی ہیں جو سب سے پہلے قوم و مذہب، ملک و ملت، لسانیت و علاقائیت، رنگ و نسل اور ذات پات سے بلند ہو کر انسانی نقطۂ نظر سے سوچا اور لوگوں کو انسانی عظمت، وحدت انسانیت اور

بقیہ صفحہ نمبر 23 پر

روئیدادِ دارالعلوم لطیفیہ

اسلام نے علم وفن کی تحصیل اوراس میں اختصاص وکمال پیدا کرنے کی ہدایت دی ہے کیونکہ ہروہ علم جوانسانی زندگی کے لئے ضروری ہے اس کو حاصل کئے بغیر آدمی کے لئے کوئی چارہ کارنہیں، علم وحکمت تو مسلمانوں کی متاع گم شدہ ہے وہ جہاں کہیں اور جس کسی سے مل جائے مسلمان اس کو حاصل کرنے کے حق داراور مستحق ہیں۔اسی لئے نبی کریم ﷺ نے امت کو ہدایت دی کہ گود سے لے گور تک علم سیکھو، علوم وفنون تو مختلف ہیں لیکن ان میں دینی وشرعی علوم کی تحصیل انتہائی ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر ایک مسلمان صحیح اسلامی زندگی گذارنہیں سکتا۔یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا علم دین کی تحصیل ہر مسلمان مرداورعورت کے لئے فرض ہے۔دینی وشرعی علوم کی تعلیم وتدریس اوران کی نشرواشاعت میں اسلامی درس گاہوں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔

ان ہی مدرسوں کی تعلیم وتربیت کا اثر ہے کہ آج مسلمانوں میں دینی شعور زندہ ہے اوران کے ذریعہ دینی تعلیم کی اشاعت ہورہی ہے ۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم لطیفیہ ڈھائی سوسال سے اس خدمت میں مصروف عمل ہے۔

آغاز سال نو: ہرسال کی طرح اس سال بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے قدیم وجدید طلباء کا داخلہ ہوا بحمداللہ دارالعلوم ھذا کا نیا تعلیمی سال اور طلباء کا داخلہ ۱۱ شوال المکرم ۱۴۲۶ھ سے شروع ہوا۔

دورۂ حدیث: مورخہ ۲۵ شوال المکرم ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۸ ماہ نومبر ۲۰۰۵ روز دوشنبہ دارالعلوم کے ہال میں صحیح بخاری، صحیح مسلم کا آغاز تقدس مآب حضرت مولانا ڈاکٹر ابومحمد سیدشاہ عثمان قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کی دعاؤں کے ساتھ ہوا، اور مورخہ ۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۱ آگسٹ ۲۰۰۶ ناظم دارالعلوم کی دعاؤں پر اختتام پذیرہوا

انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس

مورخہ ۱۰ ماہ دسمبر ۲۰۰۵ء بعدنماز ظہر تین بجے دارالعلوم لطیفیہ کے ہال میں حضرت مولانا ابومحمد سیدشاہ عثمان قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ کے زیرصدارت اجلاس منعقد ہوا۔حافظ مولوی فیاض احمد لطیفی ترپاتوری کی تلاوت قرآن اور جناب محمد خلیل احمد حیدرآبادی کی نعت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔مولانا مولوی الحاج حافظ بشیرالحق صاحب نے مقاصدِ جلسہ بیان کیا اور مولانا مولوی شیخ فضل اللہ صاحب نے مہمانِ خصوصی کا تعارف فرمایا۔مولانا قاضی شاکراللہ لطیفی صاحب، مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک رہے اور خطاب فرمایا۔مولانا موصوف نے طلباء کوتندھی کے ساتھ علم حاصل کرنے اور اخلاق سنوارنے کے بارے سیر حاصل بحث فرمایا۔اس کے بعد مہمانِ خصوصی کے خطاب کو مولوی کے سی ابوبکر فیضی قاسمی صاحب نے ملیالم زبان میں ترجمہ فرمایا اور نائب ناظم دارالعلوم عالی جناب سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری صاحب نے عہدیداروں کی فہرست پیش کی اور حاضرین کا شکریہ ادافرمایا اور صدر جلسہ کی دعاؤں کے ساتھ اجلاس اختتام پذیرہوا۔

اسباب صحت : دارالعلوم کے میدان میں بعد نماز عصر مختلف قسم کے گیمس کھیلے جاتے ہیں۔ جس سے طلباء، اپنی سستی وکسلان کو دور کر لیتے ہیں۔ اوردل ودماغ کو تروتازہ بنا لیتے ہیں۔

نوید مسرت : اکثر طلباء دارالعلوم "ترولور یونیورسٹی، ویلور" کے مختلف امتحانات، افضل العلماء، منشی فاضل، ادیب فاضل وغیرہ میں شرکت کئے بحمد اللہ انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

دارالعلوم کے امتحانات: اس سال دارالعلوم کے ششماہی امتحان، اساتذہ کی نگرانی میں مورخہ ۷، ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ مطابق ۶، ماہ مئی ۲۰۰۶ء ہوئے۔ اس کے بعد مورخہ ۲۳ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۳ ماہ اگست ۲۰۰۶ء کو دارالعلوم کے سالانہ امتحانات شروع ہوئے اور ایک ہفتہ تک جاری رہے۔

عبا پوشی واعطائے اسناد: مورخہ ۱۰ شعبان المعظم ۱۴۲۷ھ مطابق ۴ ماہ ستمبر ۲۰۰۶ء روز دوشنبہ کو دارالعلوم کے مزین وخوبصورت ہال میں دارالعلوم کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ناظم دارالعلوم حضرت مولانا ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ عثمان قادری صاحب زید مجدہ' نے فرمائی جس میں مقامی وبیرونی علمائے کرام اور مقتدر علم دوست حضرات مدعو تھے۔ ناظم موصوف نے اپنے دست فیض سے فارغین کو اسناد عطا فرمایا

تقسیم انعامات : درسیات، مقالہ نویسی اور گیمس اسپورٹس میں اول دوم آنے والے طلباء کو اور ان عہدیداروں کو جنہوں نے سال بھر اپنی عمدہ خدمات پیش کئے تھے انہیں قیمتی انعامات سے نوازا گیا۔

ھدیۂ تشکر : ادارہ ان اطبا اور ڈاکٹروں کی خدمت میں تہ دل سے ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے جنھوں نے طلبائے دارالعلوم کی صحت وتندرست کا خاص خیال رکھا۔ نیز ادارہ مدیران اخبار کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جو اپنی اولین فرصت میں دارالعلوم کی کارروائیاں شایع کرنے میں خصوصی توجہ کی۔ بالخصوص ادارہ سالنامہ اللطیف کی کتابت، طباعت اور اشاعت کا کام بڑے خلوص کے ساتھ انجام دینے والے جناب کاتب محمد شریف برکاتی آمبوری اور عالی جناب سید علیم الدین المعروف علیم صبا نویدؔی صاحب مدراس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

ہم بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں کہ ان تمام عقیدت مندوں کو دنیا وآخرت میں سرخ روئی عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!!

(افتتاحیہ کا بقیہ صفحہ ۲۱ سے آگے)

حقوق انسانیت سے روشناس کیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے برتاؤ اور سلوک کی ہلکی سی جھلک پیش کرنے کے بعد یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی امت اجابت (مسلمان) کا یہ اخلاقی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ بھی امت دعوت (غیر مسلم) کے ساتھ اس سلوک اور برتاؤ کا مظاہرہ کرے، جو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت دعوت کے ساتھ کیا تھا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ بہ اجمعین.
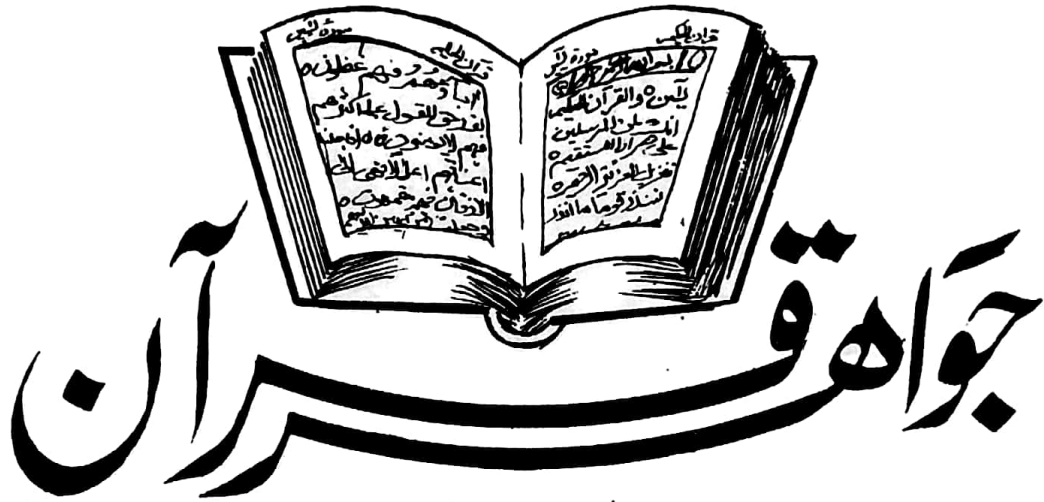
مولوی حافظ ابوالنعمان ڈاکٹر بشیر الحق قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی، استاذِ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور

قرآنِ کریم تاریخ کی کتاب نہیں ہے، لیکن اس نے تاریخ کے بعض ایسے گوشوں کو نمایاں کیا ہے، جن کے اندر انسانوں کے لیے عبرت و نصیحت اور تعلیم موجود ہے۔ قرآن کریم میں بعض شخصوں کا ذکر بھی ہے۔ ان میں سے ایک حضرت لقمان علیہ السلام بھی ہیں۔ ان کے نام سے ایک مستقل سورت بھی اکیسویں ۲۱ پارہ میں ہے۔ جس میں حضرت لقمانؑ کے پند و نصائح اور وصیتوں کا ذکر ہے۔ جو انھوں نے اپنے فرزند کو کی تھیں۔ یہ نصیحتیں ایسی ہیں کہ ہر دور کے انسان کے لیے مفید ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت لقمانؑ کی شخصیت اور سیرت سے متعلق کوئی تفصیلات نہیں ہیں۔ صرف ان کی حکیمانہ باتیں نقل کی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں ان کی سیرت کا ایک پہلو یہ نمایاں ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ حکمت و بصیرت آدمی تھے اور اللہ تعالیٰ ان کی ذاتِ گرامی سے متعلق بہ صراحت فرما رہے ہے کہ ہم نے لقمانؑ کو حکمت عطا کی ولقد اٰتینا لقمان الحکمة۔

حضرت لقمانؑ تاریخ کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں دنیا ضبط و تحریر اور تحقیق و تدوین سے ناآشنا تھی اور لوگ عموماً اہم اہم باتوں کو زبانی یاد رکھنے اور سننے سنانے کے عادی تھے۔ علم و قلم اور تحقیق نیز تاریخ کا آغاز اسلام سے ہوا۔ جس نے دنیا کو تحریر و کتابت، علم و قلم اور تحقیق و تصحیح کی اہمیت و افادیت سے روشناس کیا۔ حضرت لقمانؑ کے بارے میں مفسرین اور مورخین کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ جن کی روشنی میں قطعی اور فیصلہ کن بات کہنی مشکل ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت لقمانؑ کو اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپ صاحبِ کتاب نہیں تھے۔ یعنی لقمان علیہ السلام نبی تھے رسول نہ تھے۔ کان لقمان نبیا غیر مرسل۔

جمہور مفسرین کا قول ہے کہ حضرت لقمان ولی تھے، نبی نہ تھے۔ اللہ نے انھیں حکمت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ انہ کان حکیماً وولیاً ولم یکن نبیا۔

عبداللہ ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت لقمان ایک حبشی غلام تھے۔ وھب بن منبہ کا قول ہے کہ حضرت لقمان بادشاہ تھے۔ شدّاد بن عاد جب دنیا سے رخصت ہوگیا تو اس کے بھائی لقمان بن عاد کو حکومت ملی۔ اللہ سے حضرت لقمان کو ادراک اور حاسہ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی جو اس زمانے میں کسی اور انسان کو نہیں دی گئی۔

صاحب "معارف القرآن" نے ابن عباسؓ، قتادہؒ، مقاتلؒ، ابن کثیر اور وہب بن منبہ کے اقوال کی بنیاد پر جن باتوں کی وضاحت کی ہے، ان کا ماحصل یہ ہے:

حضرت لقمان، حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے یا خالہ زاد بھائی تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی، حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا۔ حضرت داؤدؑ کے نبی ہونے سے پہلے آپ ہی لوگوں کو شرعی احکام اور مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔ بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب نبی بنائے گئے تو آپ نے درس و افتاء کا کام چھوڑ دیا۔ حضرت لقمان سے حکمت کے اقوال بکثرت منقول ہیں۔ اللہ نے حضرت لقمان کو نبوت اور حکمت دونوں میں سے کسی ایک چیز کو اپنانے کا اختیار دیا تھا۔ آپ نے نبوت کے مقابلہ میں حکمت کو پسند کیا۔ کسی شخص نے پوچھا اے لقمان! آپ نے نبوت کے مقابلہ میں حکمت کو کیوں اختیار کیا تو جواب دیا: نبوت ایک عظیم ترین ذمہ داری ہے اگر یہ چیز مجھے اختیار کے بغیر دے دی گئی ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ ایسی صورت میں نبوت کے فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ خود ہی میرا کفیل ہو جاتا۔ اگر میں اپنے اختیار سے نبوت حاصل کر لیتا تو مجھ پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہو جاتی۔

حضرت لقمان ایک مجلس میں پند و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے۔ ایک شخص آیا اور آپ سے مخاطب ہو کر پوچھا، کیا آپ وہی شخص نہیں ہیں جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتا تھا؟ حضرت لقمان نے کہا: ہاں میں وہی شخص ہوں۔ اس آدمی نے پوچھا، پھر آپ کو یہ عظیم مرتبہ کیسے حاصل ہوا؟ میں دیکھ رہا ہوں آپ کے وعظ کو سننے کے لیے دُور دُور سے لوگ آکر جمع ہوئے ہیں اور ہر کوئی آپ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے؟

حضرت لقمان نے جواب دیا: مجھے یہ مرتبہ چند چیزوں پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے حاصل ہوا۔ اگر تم بھی ان باتوں پر عمل کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی یہ مرتبۂ بلند عطا فرمائے گا۔ اس کے بعد حضرت لقمان نے درج ذیل باتیں کہیں:

۱۔ اپنی نگاہ کو نیچی رکھو۔ یعنی غیر محرم کی طرف نگاہ نہ کرو۔ ۲۔ اپنی زبان پر قابو رکھو۔
۳۔ رزقِ حلال پر قناعت کرو۔ ۴۔ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو۔
۵۔ ہمیشہ سچ بولو۔ ۶۔ وعدہ پورا کرو۔
۷۔ مہمان کی عزت کرو ۸۔ پڑوسی کی حفاظت کرو۔
۹۔ فضول کلام اور فضول کام چھوڑدو۔

"ارض القرآن" کے مصنف علامہ سید سلیمان ندوی کی یہ تحقیق کہ حکیم لقمان اور بادشاہ لقمان دو الگ الگ شخص نہیں تھے، بلکہ ایک ہی شخصیت ہے اور حضرت لقمان ایک ماہر طبیب اور حاذق حکیم تھے۔ اور ان کا تعلق قومِ عاد سے تھا۔ اور حضرت ہود علیہ السلام پر جو ایمان لائے تھے۔ حضرت لقمان ان اہلِ ایمان کی نسل سے تھے اور اللہ نے انھیں حکومت اور سلطنت عطا کی اور آپ کا شمار یمن کے بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اور اہلِ عرب میں جو صحیفہ لقمان معروف ہے وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے۔

حاصلِ کلام! مختلف اہلِ قلم کے مذکورہ بیانات سے حضرت لقمان کی شخصیت کے متعدد اور مختلف پہلو سامنے آرہے ہیں۔ صحیفہ لقمان کے لفظ سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ مجلہ اور صحیفہ تحریری شکل میں تھا۔ اگر یہ روایت کا حامل ہوتا تو اس کے لیے صحیفہ کا لفظ مستعمل نہ ہوتا اور اہلِ عرب میں لکھنے کا رواج حضرت ابو سفیانؓ کے باپ حرب کے زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شعراء میں امراء القیس، طرفہ اور سلمی بن ربیعہ وغیرہ کے اشعار میں لقمان کا ذکر ہے۔ صاحبِ "ارض القرآن" نے سلمی کے ایک شعر سے لقمان کے بادشاہ ہونے پر دلیل قائم کی ہے:

اھلکن طسما وبعدہ غذی بھم وذا جدون
واھل جاس ومارب "وحی لقمان" والتقون

زمانے کے حادثات اور انقلابات نے قبیلہ طسم اور ذا جدون اہل جاس اور اصحاب مارب اور لقمان کے قبیلہ کو ہلاک کر دیا

صحیفۂ لقمان سے متعلق ایک روایت 'سیرۃ ابن ہشام' میں منقول ہے کہ مدینۂ منوّرہ کا ایک شخص سوید بن صامت بعثتِ نبویؐ کے دسویں سال حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ آیا۔ اس موقعہ پر آنحضرتؐ خیمہ خیمہ، قبیلہ قبیلہ گھوم گھوم کر اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ سوید نے جب آپؐ کی باتیں سنیں تو آپؐ سے عرض کیا: اسی طرح کا کلام میرے پاس بھی ہے۔ آپؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ تو اُس نے کہا: صحیفۂ لقمان۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس صحیفہ سے کچھ سنانے

کے لیے کہا۔ اس شخص نے صحیفہ کے بعض حصے آپؐ کے گوش گزار کیے تو آپؐ نے فرمایا: یہ عمدہ کلام تو ہے لیکن میرے پاس اس سے بھی عمدہ کلام موجود ہے۔ یہ کہتے ہوئے سوید کو قرآن کی آیات سنائیں تو سوید بہت متاثر ہوا اور کہا: بے شک۔ یہ کلام تو صحیفۂ لقمان سے بھی عمدہ تر ہے۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ عرب کے خواندہ لوگوں میں صحیفہ لقمان معروف تھا اور وہ تحریری شکل میں موجود تھا۔

حضرت لقمان کی شخصیت کا افادی پہلو یہ ہے کہ ان کی گراں مایہ نصیحتوں اور حکیمانہ وصیتوں کی اہمیت اور افادیت آج بھی پوری طرح برقرار ہے۔ جو انھوں نے اپنے فرزندِ دلبند کو کی تھی۔ حضرت لقمان کے صاحب زادے کے نام کی صراحت کہیں نہیں ملتی اور نہ ہی ان کی شخصیت پر کوئی روشنی ملتی ہے۔ پند و نصائح میں نماز کی پابندی کی وصیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت لقمان کے صاحب زادے موحد اور مومن رہے ہیں۔ نصائح میں شرک سے اجتناب کی تلقین بھی ہے۔ اس سے حضرت لقمان کا مطمعِ نظر اسبابِ شرک سے اجتناب اور ایمان پر ثبات و استقامت کی تعلیم و تاکید ہو۔

جناب شاہ بلیغ الدین صاحب نے اپنے "مجموعہ مضامین" "روشنی" میں شکرگزاری اور احسان شناسی سے متعلق حضرت لقمان کے صاحب زادے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس سے ابن لقمان کی زیرکی و چالاکی اور شرافت طبعی پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت لقمان ایک امیر کے ہاں ملازم تھے۔ وہ شخص حضرت لقمان کا عاشق و دلدادہ تھا اور حضرت لقمان کے بیٹے کو اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔ نذر گزارنے والے، مال بیچنے والے جو کچھ لاتے تھے اس میں جو چیزیں سب سے اچھی ہوتی تھیں انھیں وہ حضرت لقمان کے بیٹے کو دے دیتا تھا۔ اس بچہ کو اچھی اچھی مٹھائیاں اور میوے کھلاتا عمدہ سے عمدہ لباس پہنانا اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔

ایک دن ایک مصاحب ایک نہایت ہی خوب صورت میوہ لایا، جو خربوزے کی طرح لگتا تھا لیکن خربوزے سے کہیں زیادہ خوب صورت اور خوش رنگ تھا۔ حضرت لقمان کا بیٹا اس وقت امیر کی گود میں بیٹھا تھا۔ امیر نے فوراً پھل کاٹ کر اس کی ایک قاش اس بچہ کو دی۔ بچے نے نہایت شوق اور رغبت سے کھالی۔ اب وہ امیر قاشیں کاٹ کاٹ کر بچے کو دے رہا تھا اور بچہ نہایت شوق سے کھا رہا تھا۔ امیر حیران ہو رہا کہ یہ کیسا مزے دار پھل ہوگا کہ یہ بچہ اتنے شوق سے کھا رہا ہے۔ آخری قاش رہ گئی تو اس نے پھل کا مزہ چکھنے کے لیے اُسے اپنے منہ میں ڈال لیا۔ قاش منہ میں رکھی ہی تھی کہ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ وہ پھل نہایت کڑوا تھا۔ بالکل زہر کی طرح۔ اب تو امیر کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ فوراً پھل

تھوک دیا، کافی دیر تک پانی سے کلیاں کرتا رہا کہ منہ کی کڑواہٹ دور ہو جائے۔
طبیعت سنبھلی تو امیر نے بچے سے پوچھا: بیٹا اتنا کڑوا پھل تم اتنے شوق سے کس طرح کھاتے چلے گئے؟
وہ حضرت لقمان کا فرزند تھا بولا: آقا! ہر روز آپ مزے دار اور شیریں پھل اور مٹھائیاں کھلاتے رہے اور میں کھاتا رہا۔ آج اگر ایک کڑوا پھل کھانا پڑ گیا تو کیا میں اتنے دنوں کا احسان بھول جاتا۔!

یہ کڑوا پھل کھا کر
منہ بناتا تو
بڑی احسان فراموشی کی بات ہوتی۔

حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو جو نصیحتیں اور وصیتیں کیں ہیں ان کا سرسری مطالعہ اور جائزہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:
یٰبنی لا تشرك بالله: میرے بیٹے! اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرا۔ شرک کا لغوی معنی ہے شریک ہونا الشِرکۃُ دو یا دو سے زائد حصوں کا اس طرح مل جانا کہ آپس میں تمیز نہ ہو سکے۔ شرک کو باب افعال میں لے جائیں تو یہ معنی ہوگا۔ شریک ٹھہرانا۔ اشرك بالله اللہ تعالےٰ کے لیے شریک ٹھہرانا۔ شرک کا شرعی معنی یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔

حضرت لقمان نے اپنی نصیحتوں میں سب سے پہلے عقیدہ کی اصلاح و درستگی کی تعلیم و تلقین کی ہے۔ جس سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کو اعمالِ صالح کی جانب توجہ دینے سے پہلے اپنے عقیدہ کو صحیح اور درست کر لینا چاہیے۔ اگر عقیدہ صحیح نہیں ہے تو عملِ صالح کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات اور ساری مخلوقات کا خالق و مالک اور متصرفِ حقیقی ہے تو صرف اللہ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اسی سے یہ بات بھی بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ تخلیق اور حقیقی ملکیت اور تصرفِ حقیقی میں کسی کو شریک قرار دینا گویا اللہ تعالےٰ کے مقام و مرتبہ میں کسی مخلوق کو رکھنا ہے۔ اور یہ بڑا ظلم ہے۔ اور ظلم کا معنی ہی یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے مقام اور محل میں نہ رکھنا۔ وضع الشئ فی غیر محله۔ شرک ہی وہ بھیانک غلطی ہے جس کے لیے رحمٰن و رحیم کی بارگاہ میں عفو نہیں ہے اس کے علاوہ ہر غلطی کی معافی ہے۔ ان الله لا یغفر ان یشرك به و یغفر ما دون ذلك۔

حضرت لقمان کی دوسری وصیت یہ ہے: یٰبنی انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السمٰوٰت او فی الارض یات بها الله

یہ دوسری نصیحت بھی عقیدہ سے متعلق ہے اور یہ پہلی نصیحت سے مربوط اور منسلک ہے۔ اللہ تعالےٰ کی وحدانیت اور الوہیت پر اعتقاد کی تعلیم کے بعد اللہ تعالےٰ کے علم وقدرت اور تصرف پر اعتقاد کی تعلیم دی گئی اور حضرت لقمان اپنے صاحب زادے کے قلب وذہن میں یہ بات بٹھا دینا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کا علم اور اس کی قدرت کائنات اور اس میں موجود ساری مخلوقات پر محیط اور حاوی ہے اور کوئی بھی چیز خواہ رائی کے دانہ کے برابر ہو اور وہ کسی چٹان کے نیچے یا زمین یا آسمان میں کہیں بھی چھپی ہوئی ہو' وہ اللہ تعالےٰ کی نظر سے اوجھل نہیں ہے اور اللہ تعالےٰ اسے ضرور نکال لائے گا۔ لہذا انسان کی چھوٹی سے چھوٹی نیکی ہو یا بدی وہ اللہ تعالےٰ سے مخفی نہیں ہے اور حساب وکتاب کے وقت تمہاری ایک ایک نیکی اور ایک ایک گناہ کو تمہارے سامنے عیاں کر دے گا۔

یٰبنی اقم الصلوٰۃ

حضرت لقمان کی تیسری وصیت عمل سے متعلق ہے۔ عمل کی کئی ایک شکلیں اور صورتیں ہیں۔ لیکن حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے اقامت صلوٰۃ کی تلقین کی ہے۔ جس سے سارے اعمال میں نماز کی امتیازی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ کسی صحابی نے نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اعمال میں کونسا عمل افضل ہے۔ آپؐ نے فرمایا الصلوٰۃ فی وقتھا: نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا۔

توحید کے اعتراف واقرار کے بعد ایک موحد اور مومن کے لیے احکام الٰہی کی ادائیگی میں جو حکم مسلسل اور پے درپے پیش آتا ہے وہ نماز کا حکم ہے۔ تمام آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کی سیرت میں نماز کو غیر معمولی رتبہ حاصل ہے شریعتِ محمدیؐ میں نماز ایک ایسا عمل ہے آدمی کا دین اسی سے قائم ہے۔ چناں چہ سیّدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کا ستون کہا ہے اور فرمایا۔ جس نے نماز قائم کی اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے نماز ترک کی اس نے اپنے دین کی بنیا د ہلا دی۔ الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامھا اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین۔

آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن اور کافر کے بیچ فرق وامتیاز کرنے والی ترکِ نماز ہے: الفرق بین لعبد والکفر ترک الصلوٰۃ۔ نیز ارشاد فرمایا، ہر چیز کی ایک علامت ہوتی ہے اور ایمان کی علامت نماز ہے: لکل شیٔ علم وعلم الایمان الصلوٰۃ۔

نماز کی فرضیت پر عہدِ آدم سے لے کر عہدِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم تک اجماع ہو چکا ہے اور امتِ محمدیؐ کے ہر دور میں نماز کی فرضیت پر اجماع رہا اور اجماع میں کسی کا انکار منقول نہیں ہے اور امت کا اجماع اور تواتر کے ساتھ عمل بھی ایک

حجت شرعی ہے۔ اس زاویۂ نظر سے بھی سارے اعمال میں نماز کی غیر معمولی عظمت عیاں ہو جاتی ہے۔

وامر بالمعروف ونہی عن المنکر

عقیدہ کی اصلاح اور نماز کی ترغیب کے بعد حضرت لقمانؑ کا اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا رہے اور بدی سے روکتا رہے۔ انسانی زندگی کو خوشگوار اور پُر امن بنانے کے لیے، سماج اور سوسائٹی میں خیر و نیکی کو فروغ دینا اور برائیوں کا انسداد کرنا بھی انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔ سماج کے ہر طبقے اور ہر فرد کی اخلاقی اور شہری ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حد اور بساط کے مطابق اس کام کو انجام دیتا رہے۔ اگر لوگ ظلم و برائی کو دیکھتے ہوئے خاموشی اور کنارہ کشی اختیار کرلیں تو سارے سماج میں وحشت و بربریت اور معصیت کی فضا عام ہو جائے گی اور انسانیت دم توڑ دے گی۔ اسی لیے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی: من رای منکم فلیغرہ بیدہ والا بلسانہ ولا بقلبہ۔

معاشرہ کے ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی برائی اور بدکاری دیکھے تو اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اس برائی کو ختم کردے۔ اگر اس کے پاس قوت نہیں ہے تو اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ برائی کے خاتمہ کے لیے کوشاں رہے اور اگر اس کے پاس بولنے کی سکت اور ہمت نہیں ہے تو کم از کم اپنے دل میں برائی سے نفرت کرے۔

امت مسلمہ کو خصوصیت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہنی چاہیے جو انسانوں کو خیر و بھلائی کی دعوت دیتی رہے اور نیکی کو قائم کرتی رہے۔ اور بدی کو دور کرتی رہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

ایک موقعہ پر رحمت عالمؐ نے نہایت دل نشین پیرایہ میں لوگوں کو یہ تاکید فرمائی کہ ظالم اور مظلوم کی مدد کرو: انصر اخاك ظالما او مظلوما؛ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد کرنے کی بات تو ہماری سمجھ میں آگئی لیکن ظالم کی مدد بھلا کیوں کر کی جا سکتی ہے؛ آپؐ نے فرمایا: ظالم کو ظلم کرنے سے منع کرنا ہی اس کی مدد ہے۔

دعوت اور اصلاحِ خلق کے کام کو انجام دینے کی وصیت کے ساتھ ساتھ حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو یہ وصیت کی کہ اس فریضہ کو انجام دینے میں تم پر جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کرو۔ یہ بات عزیمت اور حوصلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر کوئی اس میدان کا شہ سوار نہیں ہو سکتا۔ اس مقام پر اصلاحِ خلق کی راہ میں پیش آنے والے مصائب سے قطع نظر ما اصابك (جو بھی مصیبت پڑے) کو عموم کے خانہ میں رکھا جائے تو یہ مفہوم بھی اپنی جگہ پر صحیح ہوگا کہ زندگی میں پیش آنے والے ہمہ جہتی مشکلات پر صبر کرو۔ انسان کو بھی مصائب پہنچتے ہیں۔ وہ عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو خود انسان

کے ہاتھوں کا نتیجہ ہے : ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم: بعض وہ ہیں جو اللہ تعالٰی کی طرف سے بندہ کو پہنچتے ہیں۔ جن سے انسان کی آزمائش مقصود ہے: ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ: مصائب خواہ کسبی ہوں یا قدرتی، جو لوگ صبر کا پیکر بن جاتے ہیں اُن کے لیے منجانب اللہ بشارت ہے: وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ولا تصعر خدک للناس

حضرت لقمان نے اپنے فرزند کو چوتھی وصیت یہ کی کہ لوگوں سے اپنا منہ پھیر کر بات نہ کر اور اپنی گفتگو کے دوران چہرہ پر بشاشت اور اپنائیت اور مسکراہٹ قائم رکھو:

صعر ایک بیماری ہے جس میں اونٹ اپنا منہ ایک ہی جانب پھیرے رکھتا ہے۔ جیسے کسی انسان کو لقوہ کی بیماری ہو جائے تو اس کا منہ اور چہرہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ کسی شخص کا منہ پھیر کر بات کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ متکلم مغرور اور متکبر آدمی ہے یا اس کے دل میں مخاطب کی شخصیت سے نفرت وحقارت اور عداوت ہے۔ یہ انتہائی بد خلقی اور بد مزاجی کی علامت ہے کہ لوگوں سے بات چیت کے دوران چہرہ پر بل لائیں اور منہ ٹیڑھا کریں اور بے توجہگی کا مظاہرہ کریں اور لب ولہجہ سے تحقیر وتذلیل کا اظہار کریں۔ اس قسم کے رویہ سے اپنے اور بیگانے سبھی متنفر اور دور ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا آدمی جو اس قسم کی گفتگو کا عادی ہو سماج اور معاشرہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ حسنِ معاشرت اور اخلاق وشرافت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ منہ پھیر کر بات کرے تو بھی اس کے ساتھ کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کی جائے۔ اس طرزِ عمل سے آدمی کی اخلاقی حیثیت اور شرافت نمایاں ہوتی ہے اور وہ سوسائٹی میں اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ حکماء نے کہا ہے کہ دوست اور دشمن کے سامنے اپنے چہرے کو کشادہ رکھو۔ حافظ شیرازی نے بڑی حکیمانہ بات کہی:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

زندگی کا آرام صرف دو حرف میں ہے دوستوں کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آؤ اور دشمنوں کی خوب خاطر ومدارت کرتے رہو۔

ایک مرتبہ سرِ راہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کوئی شخص تند اور سخت لہجہ میں ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرنے لگا اور آپ کی ہر بات کو کاٹتے چلا گیا۔ کسی نے یہ منظر دیکھ کر حضرت مسیحؑ سے کہا: اے ابن مریمؑ! یہ آپؑ کے ساتھ سخت کلامی اور بد اخلاقی سے پیش آرہا ہے اور آپؑ ہیں کہ اس کے ساتھ لطف ونرمی اور خندہ روئی کے ساتھ بات کر رہے ہیں۔ آپؑ بھی اس کے ساتھ سخت رویہ

کیوں نہیں اختیار کرتے؟ یہ سُن کر حضرت مسیحؑ نے کہا: کل اناء بیترشح بما فیہ : پیالہ سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔ اس کے اندر جو چیز ہے وہی باہر آئے گی۔ اس کی بد خلقی اور سخت کلامی سے میں بداخلاقی اور درشت کلامی کا مظاہرہ نہیں کرسکتا۔ ممکن ہے میرے چہرے طرزِ عمل سے اپنا طرزِ عمل بدل لے۔

لوگوں سے منہ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت کے تحت یہ ضمنی اور ذیلی مفہوم اخذ کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ زندگی کے امور و معاملات اور مسائل میں لوگوں سے منہ پھیر کر الگ تھلگ نہیں رہنا چاہیے اور سب کے ساتھ حسنِ ربط قائم رکھنا چاہیے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے ممتاز اور ممیز قرار دینے کے لیے لوگوں کو سے میل جول کو ناپسند کرتے ہیں اور الگ تھلگ رہنے سہنے کو اپنے لیے ایک عزت و وقار تصور کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بھی کسی درجہ میں کبر و نخوت کا آئینہ دار ہے۔

ولا تمش فی الارض مرحا ان اللہ لا یحب کل مختال فخور

حضرت لقمان کی پانچویں وصیت یہ ہے کہ اے فرزند! زمین پر اکڑ کر اتراتے ہوئے ناز سے نہ چلو۔ اللہ تعالےٰ فخر کرنے والے تکبر کرنے والے آدمی کو ناپسند کرتا ہے۔ لہذا اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔

مرح الرجل آدمی کا بہت خوش ہو کر اترانا، ناز سے چلنا چلنے میں اکڑنا۔ بڑ

مختال وہ آدمی جو دوسروں سے خود کو افضل اور برتر خیال کرے فخر کے معنی ہیں۔ بڑائی ظاہر کرنا

فخور وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی عظمت و فوقیت ظاہر کرے۔ خواہ وہ زبان سے ہو یا چال چلن سے یا رہن و سہن سے ہو یا کسی پہلو اور جہت سے ہو۔

آدمی کے چال کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ طبعی طور پر کسی شخص کی چال دھیمی اور آہستہ ہوتی ہے تو کسی شخص کی چال تیز ہوتی ہے۔ چال کا کوئی ضابطہ نہیں ہے کہ جس پر سارے لوگوں کا کاربند رہنا چاہیے۔ راہ چلنے کا مسئلہ ہر شخص کی صحت وعدم صحت، ضرورت وعدم ضرورت، عجلت و عدم عجلت اور خوف وغیرہ کی کیفیات اور حالات پر منحصر ہے۔ البتہ اتنی بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ راہ چلنے میں دوسرے راہ گیر کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ چال میں فخریہ انداز تصنع نہیں ہونا چاہیے بلکہ سنجیدگی و شائستگی اور وقار مظاہرہ ہونا چاہیے اور چال میں میانہ روی اور اعتدال کی شان ہونی چاہیے۔

بعض مفسرین نے حضرت عمرؓ کی یہ ہدایات نقل کی ہیں کہ آپؓ نے ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو آپؓ نے محسوس کیا کہ اس کے اندر تصنع ہے۔ آپؓ نے اسے تاکید کی کہ سر اٹھا کر چلو۔ ایک دوسرے شخص کو لاغری اور ناتوانی کے انداز میں چلتے دیکھا جو درحقیقت ناتوان نہیں تھا۔ آپؓ نے یہ چال وانداز ترک کرنے کی تاکید کی۔

چال میں اعتدال اور توسط کی تلقین سے یہ مسئلہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کے سارے امور و مسائل میں میانہ روی و اعتدال کی روش اپنانا چاہیے۔

واغصص من صوتك ان انكر الاصوات الحمير

حضرت لقمان کی چھٹی اور آخری وصیت یہ ہے کہ اے فرزند! تم اپنی آواز کو پست رکھا کرو۔ بلند آواز سے چیخ چیخ کر بات چیت کرنے سے پرہیز کرو۔ بڑی آواز کے ساتھ کرخت لہجہ میں بات چیت کرنا ایسا ہی ہے جیسے گدھے کی چیخ و پکار۔

آواز کی شیرینی و لطافت اور نرمی و ملائمت سے لوگوں کے دلوں پر صاحب تکلّم کی شخصیت کا اچھا اثر ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص چیخ چیخ کر بلند آواز سے بات کرتا ہے تو لوگوں کے دلوں پر اس کی شخصیت کا برا اثر ہوتا ہے اور لوگ اس آدمی سے کراہت کرتے ہیں۔ آواز کو پست کرنے کا مطلب یہ تو نہیں لیا جا سکتا کہ آدمی ہر حال میں اپنی آواز کو پست ہی رکھے اور کبھی بلند آواز سے بات چیت ہی نہ کرے۔ آواز کا تعلق اقتضائے حال کے مطابق ہے۔ جہاں آدمی کی خفگی و ناراضگی اور تنبیہ و تاکید اور اصلاح کرنی ہو وہاں کسی قدر بلند آواز میں بات کرنی ہی چاہیے۔ اس صورتِ حال میں بلند آواز مذموم نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ اپنا رعب اور دبدبہ ظاہر کرنے کے لیے بڑی آواز میں بات چیت کرتے ہیں یا اپنی مالکانہ اور حاکمانہ حیثیت اجاگر کرنے کے لیے چیخ چیخ کر زور زور سے بات چیت کرتے ہیں، یہ آواز مذموم ہے۔

غرض قرآن کریم میں موجود حضرت لقمان کے پند و نصائح کا مختصر خلاصہ بیان کرنے کے بعد ان کی بعض بعض وہ نصیحتیں جو فارسی کی پہلی کتاب میں منقول ہیں ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ایسے اخلاقی اصول ہیں جن پر ہر شخص کو عمل کرنا چاہیے۔

اے جانِ پدر! اللہ تعالیٰ کو پہچان، لوگوں کو تو جو بھی نصیحت کرتا ہے اس پر تو خود عمل کر، ہر بات اپنے اندازہ اور حیثیت کے مطابق کر، ہر آدمی کے مقام اور مرتبہ کو پہچان، لوگوں کے حقوق کو پہچان، اپنا راز کسی پر ظاہر مت کر، تکلیف و ضرورت کے وقت دوست کو آزما، فائدہ اور نقصان کی حالت میں دوست کا امتحان کر، نادان اور بے وقوف لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر، عقل مند اور سمجھ دار آدمی کو اپنا دوست بنا، خیر و فلاح کے کاموں میں جدوجہد کر، اپنی بات دلیل اور حجت کے ساتھ بیان کر، دوستوں اور رشتہ داروں کو عزیز رکھ، ماں باپ کی زندگی کو نعمت خیال کر، استاد کو بہترین باپ سمجھ، دوست اور دشمن کے سامنے اپنا چہرہ کشادہ رکھ، اپنی آمدنی کا خیال کرتے ہوئے خرچ کر، سارے کاموں میں میانہ روی اختیار کر، بہادری اور جواں مردی

اختیار کر، اپنی زبان پر قابو رکھ، جسم اور لباس کو پاک و صاف رکھ، تنہا الگ تھلگ نہ رہ، لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہ، سواری اور تیر اندازی سیکھ لے، ہر شخص کے ساتھ اس کی حیثیت اور اس کے اندازہ کا لحاظ اور خیال رکھتے ہوئے ہر کام کر، رات کے وقت بات کرے تو آہستگی کے ساتھ کر، جب دن میں بات کرے تو ہر طرف نگاہ دوڑا، کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا اپنی عادت بنالے، جو چیز تجھے پسند نہیں ہے وہ دوسروں کے لیے پسند نہ کر، ہر کام عقل اور تدبیر کے ساتھ کر، کسی بھی علم و فن میں مہارت حاصل کئے بغیر استادی مت کر، دوسروں کی چیزوں پر نگاہ نہ رکھ، بد اصل اور کم ظرف لوگوں سے وفا کی امید نہ رکھ، کوئی کام بھی بغیر سوچے سمجھے نہ کر، جس کام کو تو انجام نہیں دیا ہے اس کو میں انجام دیا ہوں ایسا مت کہہ، آج کا کام کل پر نہ ٹال، اپنے بزرگوں کے ساتھ مزاح مت کر، بزرگوں کے ساتھ لمبی گفتگو مت کر، ضرورت مندوں کو ناامید اور مایوس نہ کر، گزری ہوئی تلخیوں اور لڑائیوں کو یاد مت کر، دوست اور دشمن کے سامنے اپنی دولت کو ظاہر مت کر، کسی شخص کی غیر حاضری میں اس کے عیوب بیان مت کر، خود نمائی اور خود ستائی سے پرہیز کر، لوگوں کے سامنے اپنی ناک اور اپنے منہ میں انگلی نہ ڈال، لوگوں کے سامنے دانتوں میں خلال مت کر، ہزل آمیز گفتگو نہ کر، کسی شخص کو لوگوں کے سامنے شرمندہ مت کر، لوگوں کے سامنے چشم و ابرو سے کسی کو اشارہ مت کر، زبان سے نکلی ہوئی بات جس سے شرمندگی لاحق ہوئی ہو پھر دوبارہ زبان پر مت لا، اپنی تعریف لوگوں کے سامنے نہ کر، عورتوں کی طرح بناؤ سنگار مت کر، بات چیت کرتے ہوئے بے ضرورت ہاتھ مت ہلا، وفات یافتہ لوگوں کو بدی سے یاد نہ کر، جہاں تک ہو سکے اختلاف اور دشمنی سے بچ، نیک لوگوں کے حق میں بدگمانی نہ کر، کسی کام میں بھی جلدی نہ کر، غصہ کی حالت میں بھی سنجیدہ گفتگو کر، سورج نکلنے کے وقت نہ سو، راہ چلتے وقت اپنے بزرگوں سے آگے نہ نکل، دو آدمی یا چند لوگ بات چیت میں مشغول ہوں تو ان کے درمیان مت بول جب تک اُن کی بات چیت مکمل نہ ہو جائے، کسی سے بات چیت کرتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ نہ کر، مہمان کے سامنے کسی شخص پر غصہ نہ کر، لوگوں کے ساتھ راستہ پر مت بیٹھ، کسی فائدے کو حاصل کرنے کے لیے یا نقصان سے بچنے کے لیے اپنی عزت و آبرو نہ کھو، تکبر نہ کر، عاجزی اختیار کر،

اللہ تعالیٰ کے ساتھ صدق و سچائی کے ساتھ زندگی کر،
اپنے نفس کی مخالفت کرتے ہوئے زندگی بسر کر،
لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرتے ہوئے زندگی گزار،
بزرگوں کی خدمت کرتے ہوئے زندگی گزار،
چھوٹوں کے ساتھ شفقت کرتے ہوئے زندگی بسر کر،
اللہ والوں سے موافقت کرتے ہوئے زندگی گزار،
دشمنوں کے ساتھ حلم و بردباری کا معاملہ کرتے ہوئے زندگی بسر کر،
اہلِ علم کے ساتھ تواضع کا رویہ اختیار کرتے ہوئے زندگی بسر کر،
جاہلوں کے ساتھ حکمت و نصیحت کے ساتھ زندگی بسر کر،

(بقیہ صفحہ نمبر 42 پر)

جواہر الحدیث

ان لنفسک علیک حقا

مولوی حافظ ابو النعمان ڈاکٹر شبیر الحق قریشی[1] قادری ایم اے، پی ایچ ڈی

انسان کی زندگی سے تین چیزیں جڑی ہیں۔ ۱۔ بدن۔ ۲۔ روح۔ ۳۔ نفس۔ انسان کا بدن مادی اور کثیف ہے اور اس کی روح غیر مادی اور لطیف ہے اور اس کا نفس کثیف اور لطیف کے درمیان ہے۔ انسان کے اچھے اعمال سے لطافت قبول کرلیتا ہے اور اس کے بُرے اعمال سے کثافت قبول کرلیتا ہے۔ اس کے اندر روح کی پاکیزگی کو بھی سمولینے کی استعداد ہے اور جسم کی گندگی اور حیوانیت سے متاثر ہونے کی استعداد بھی ہے۔ نفس مختلف معانی میں استعمال ہوتے رہتا ہے۔ ان میں سے نفس کا ایک معنی ہے انسان کی شخصیت اور اس کی ذات، قرآنِ کریم اور احادیث میں نفس کا ذکر مختلف معانی اور مقاصد کے تحت کیا گیا۔ اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل اور بے شکل رہی۔ پھر اس نطفہ کو ایک وقت خاص تک رحم مادر میں رکھا گیا۔ پھر اس کے بدن میں اپنی روح پھونک دی۔ اور اس میں سننے (کان) اور دیکھنے (آنکھ) اور سوچنے سمجھنے (دل اور دماغ) کی قوتیں رکھ دیں اور یہ قوتیں اور صلاحیتیں ظاہری بھی ہیں اور باطنی بھی ہیں۔ ان میں سے پانچ حواس ظاہری ہیں۔ ۱۔ ذائقہ (چکھنے کی قوت)۔ ۲۔ باصرہ (دیکھنے کی قوت)۔ ۳۔ شامہ (سونگھنے کی قوت)۔ ۴۔ لامسہ (چھونے کی قوت یعنی لمس و احساس)۔ ۵۔ سامعہ (سننے کی قوت) یہ وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعہ آدمی مختلف چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے۔ مثلاً ذائقہ کی قوت یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے کسی چیز کو چکھ کر مختلف ذائقوں کا علم حاصل کرلیتا ہے کہ یہ چیز میٹھی ہے اور یہ چیز کڑوی ہے۔ باصرہ کی قوت یہ ہے کہ آدمی آنکھوں کے ذریعہ مختلف صورتوں اور شکلوں کا علم حاصل کرلیتا ہے اور شامہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ناک سے سونگھ کر یہ علم حاصل کرلیتا ہے کہ یہ چیز خوشبودار ہے اور یہ چیز بدبودار ہے۔ لامسہ یہ ہے کہ آدمی چھو کر کسی چیز کی سختی و نرمی اور گرمی و سردی کا علم حاصل کرلیتا ہے۔ اور سامعہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے کانوں کے ذریعہ آوازوں کا علم حاصل کرلیتا ہے اور آواز کی

لطافت و شیرینی اور اس کی سختی و کرختگی کا علم حاصل کر لیتا ہے۔ ان حواس کی صحت پر معلومات کی صحت ہے۔ اگر یہ حواس کسی خرابی کا شکار ہو جائیں تو ان سے حاصل ہونے والے معلومات بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ جیسے لامسہ یعنی احساس کی قوت بدن کے کسی عضو سے ختم ہو جائے تو آدمی کسی کے سرد و گرم اور نرم و سخت ہونے کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور درد و تکلیف کا احساس بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آدمی کی زبان خراب ہو جائے تو وہ میٹھی چیز چکھ کر کڑوی اور کسیلی چیز کہہ دیتا ہے۔

یہ حواس انسان کو صحیح معلومات عطا کرنے کے باوجود ان سے صحیح نتائج حاصل کرنے کے لیے ایک اور قوت کی ضرورت ہے اور اسی قوت کا نام دل رکھا گیا ہے اور یہ سارے اعضاء اپنی اپنی معلومات دل تک پہنچاتے ہیں اور یہ دل ہی جو ان معلومات میں تصرف و تدبر کرتے ہوئے انسان کو ہر چیز کا صحیح علم اور صحیح ادراک عطا کرتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے انسان کے سارے اعضاء میں دل کو مرکزی اور کلیدی حیثیت عطا کی اور یہاں تک فرمایا کہ انسان کا دل ہی اصل ہے، اسی کی صحت و درستگی سے سارے اعضاء کی صحت قائم ہے۔ اگر وہ خراب ہو جائے تو سارے اعضاء خراب ہو جائیں گے۔ اور ان سے حاصل ہونے والی معلومات میں بھی فساد پیدا ہو جائے گا اور ان سے صادر ہونے والے اعمال بھی خراب ہو جائیں گے۔ وفی جسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب۔

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ جب وہ صحیح رہتا ہے تو سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو وہ ہے انسان کا دل۔

اللہ نے انسان کو مذکورہ پانچ حواسِ ظاہری کے ساتھ ساتھ اور پانچ حواسِ باطنی بھی دیے ہیں:

۱۔ حسِ مشترک (یہ ایسی قوت ہے جس میں تمام صورتیں اور محسوسات، حواسِ خمسہ ظاہری کے ذریعے سے منقش ہو جاتی ہیں۔ اور حسِ مشترک کا مقام جوفِ پیشانی میں ہے۔)

۲۔ خیال (وہ صورت جو آدمی بیداری میں تصور کرے یا خواب میں دیکھے۔)

۳۔ متصرفہ (تصرف کرنے والی قوت۔)

۴۔ واہمہ (وہم کی قوت جس سے جزئیات معلوم ہوتی ہیں اور ان جزئیات کا تعلق محسوسات سے ہوتا ہے اور وہم عقل کے زیرِ اثر نہیں ہے۔)

۵۔ حافظہ: حواس خمسہ ظاہری سے جو معلومات حاصل ہوتے ہیں، یہ قوت ان سب کو محفوظ رکھتی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر مذکورہ ظاہری و باطنی حواس ودیعت کیا۔ پھر اس کے اندر اپنی روح ڈالی اور ایک حسین روپ بخشا اور ایک بچّہ کی صورت میں ماں کے پیٹ سے باہر لایا اور اپنی صفات میں سے صفتِ علم، قدرت، ارادہ اور اختیار کی ایک خفیف سی جھلک اس کے اندر رکھ دی اور اس کی روح کو اپنی صفات کا مظہر اور عکس قرار دیا۔ یہی وہ گوناگوں نعمتیں اور صلاحیتیں ہیں، جن کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہوا اور وہی زمین میں اللہ کا نائب قرار پایا۔

آمدم بر سرِ مطلب ! انسان کا نفس کیا ہے؟ نفسِ انسانی کی طبعی اور غیر شرعی خواہشات اور شہوات کا نام ہے اور وہ اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ شہوات کی طرف مائل ہونے والا ہے اور انسان کو ہر طرح کی خواہشات میں الجھائے رکھنے والا ہے۔ اسی لیے بعض صوفیا نے کہا ہے کہ نفس اپنی ذات کے اعتبار سے سراسر ظلمت ہے اور اس کے اندر لطافت و نظافت اور طہارت صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے رحم سے اور اعمالِ صالحہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آدمی توفیقِ الٰہی سے محروم ہوجائے تو اس کا نفس فسق و فجور اور گناہ و معصیت کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اور اس کا نفس آدمی کو ہر لمحہ اور ہر آن برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ نفس کی اسی کیفیت اور حالت کو امارہ کہا گیا ہے۔ چناں چہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ بیان قرآن میں ہے:

وما ابرئ نفسی ان النفس الامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی: میں اپنے نفس کی برأت نہیں کررہا ہوں نفس تو بدی پر اکساتا رہتا ہی ہے اِلّا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔

ایسے نفس کی اصلاح اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے۔ امام بوصیری علیہ الرحمہ نے نفس کے مزاج اور کیفیت کو ایک شعر میں بیان کیا ہے: ؎

والنفس کالطفل ان تہملہ شبّ علی حب الرضاع وان تفطمہ ینفطم

نفس شیر خوار بچّہ کی طرح ہے اگر ماں سختی سے دودھ نہ چھڑا دے تو وہ جوان ہوکر بھی دودھ پیتا رہے گا اور اگر اس کے ساتھ دودھ چھڑانے میں سختی سے پیش آئیں تو اس کی عادت چھوٹ جائے گی۔

نفس کی ایک دوسری کیفیت یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہے کہ جب کبھی اس سے گناہ صادر ہوجاتا ہے تو وہ شرمسار اور نادم ہوجاتا ہے اور ملامت کرنے لگتا ہے۔ اور توبہ و استغفار کی جانب مائل ہوجاتا ہے۔ ایسے نفس کو نفس لوّامہ کہا گیا ہے۔ ایسے نفس کی اللہ نے قسم کھائی: ولا اقسم بالنفس اللوّامہ۔

نفس کی ایک تیسری حالت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ نفس اخلاقِ رذیلہ سے پاک وصاف رہتا ہے۔ شہوات اور خواہشات کے تقاضوں کی کشمکش سے بے نیاز اور مطمئن رہتا ہے۔ اسی طمانیت کے باعث ایسے نفس کو نفسِ مطمئنہ کہا گیا ہے۔ **یاایتھاالنفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیہ مرضیہ**: یہ نفس طمانیت کی نعمت سے بہرور ہونے کے علاوہ مزید اور دو نعمتوں سے فراز ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے رب سے راضی و خوشنود ہے اور دوسری یہ کہ خود ربِ کریم اُس سے راضی و خوشنود ہے۔ اس کی یہی گوناگوں خصوصیتیں ہیں جن کے باعث یہ بشارت ملی: **فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی**: اے نفس مطمئنہ تو میرے صالح بندوں میں شمار ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔

یہ نفس کا اعلیٰ اور ممتاز مقام ہے کہ وہ ہر قسم کی آرائش سے پاک وصاف ہے اور رب تعالیٰ کا محبوب ہے اور وہ جنّت کا مستحق ہے۔

قرآن کریم میں نفس کا ذکر متعدد مقامات پر مختلف پہلوؤں اور زاویوں سے کیا گیا ہے۔ ان میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نفس کا تزکیہ کیا جائے: **قد افلح من زکّھا**: جو شخص اپنے نفس کو پاک صاف کر لے گا وہ یقیناً فلاح پائے گا۔ نفس کو رذیل کرنے والی خصلتیں عموماً بخل، تکبّر، تعلّی، بغض، کینہ، حسد، حرص، ہوس، ریاکاری اور شہرت پسندی وغیرہ ہوا کرتی ہیں۔ ان خصلتوں اور عادتوں کو ختم کرنا ہی تزکیۂ نفس کہلاتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کے نفوس کا تزکیہ بھی فرماتے تھے۔ اسی کام کو بنوامیہ کے دور سے حضرات صوفیاء نے شروع کیا۔ ان حضرات نے دیکھا خلفائے اسلام کی ساری توجہ علم وفن، صنعت وحرفت، تہذیب وثقافت، زبان وادب کی طرف ہو گئی۔ لوگوں کے نفوس کی اصلاح اور تربیت کا کام سرد پڑ گیا ہے۔ لوگ حرام وحلال کے علم سے بخوبی واقف ہیں، لیکن اس کے باوجود حرام میں مبتلا ہیں۔ لوگ فضائل مثلاً عاجزی، اخلاص، ایثار، قناعت، ضبطِ نفس صبر، تحمل، سخاوت، سیر چشمی، عفو وغیرہ سے واقف ہیں لیکن فضائل سے آراستہ نہیں ہیں۔ بلکہ رذائل سے مانوس ہیں۔

اس لیے سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کے نفوس کو طبعی شہوات اور ناجائز خواہشات، غیر شرعی مرغوبات اور حیوانی عادات سے چھٹکارا دلایا جائے اور ان کے نفوس کو فضائل سے آراستہ کیا جائے۔ چناں چہ اس طائفہ کی جدوجہد کے باعث لوگوں کے نفوس بدل گئے، خیالات بدل گئے، ان کا ضمیر بدل گیا، جس کے اثرات

اسلامی معاشرہ میں ہر سو پھیل گئے اور کئی صدیوں تک اس کے اثرات قائم و دائم رہے۔

نفس کے اندر صالحیت و نورانیت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی صحبت اور ہم نشینی اختیار کی جائے۔ قرآن نے بھی ہدایت دی ہے کہ صادقین کے ساتھ رہو: کونوا مع الصدیقین، نفس صالح صحبت سے صالح بن جاتا ہے اور فاسد صحبت سے فاسد بن جاتا ہے۔[۵]

صحبت صالح ترا صالح کند　　صحبت طالع ترطالع کند

صحبت کی یہی وہ اثر آفرینی ہے کہ چند ساعات صالحین کی صحبت میں رہنے کو سو سالہ عبادت سے بہتر قرار دیا گیا:[۶]

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

بعض بزرگوں نے کہا: جو شخص اللہ کی معیت چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اہلِ تصوف کی معیت میں رہے۔
من اراد ان یجلس مع اللہ فلیجلس مع اھل التصوف:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: برے ساتھی سے گوشہ نشینی بہتر ہے۔

حضرت قربی ویلوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

گمراہ لوگوں کی صحبت میں رہنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آدمی درندوں کی صحبت میں رہے۔ کیوں کہ ان درندوں کی صحبت میں رہنے سے صرف جسم زخمی ہوگا اور مرہم پٹی سے جسم چنگا ہو جائے گا۔ لیکن گمراہ لوگوں کی صحبت میں رہنے سے دین و ایمان کا نقصان ہوگا اور یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی مشکل ہے۔

در صحبت اژدھا و نہنگ و شیر مردم در بودن از صحبت آنہا بہتر است زیرا کہ در صحبت اژدھا و شیر زخم بر تن است و آن سہل است و در صحبت ایں مردودان زیان دین و ایمان آن است و آن مشکل است۔

تزکیہ نفس کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ آدمی کو خود ہی اپنے نفس کا نگران اور محافظ ہونا چاہیے اور اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ ایک حدیث میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تم خود ہی اپنے اعمال کا حساب کر لو قبل اس کے کہ آخرت میں تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے۔

حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔

سورہ حشر میں بھی یہ بات کہی گئی کہ آدمی کو یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس کا نفس کس قسم کے اعمال آخرت کے لیے بھیج رہا ہے۔ ولتنظر نفس ما قدمت لغد۔

احتساب نفس اور اعمال کا جائزہ کو صوفیاء کی زبان میں محاسبہ کہا گیا ہے۔ یہ محاسبہ آدمی کو بُرے اعمال سے محفوظ رکھتا ہے اور نیک اعمال کی جانب متوجہ کر دیتا ہے۔ بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک تاجر تجارت کے معاملہ میں اپنے شریکِ تجارت سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے اور ہر روز حساب و کتاب پر نظر رکھتا ہے، کہیں اس کا شریک تجارت میں نقصان نہ دے۔ اسی طرح آدمی کو ہر روز اپنے نفس کے اعمال کا حساب اور جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور دیکھتے رہنا چاہیے کہ نفس کس قسم کے اعمال انجام دے رہا ہے۔ اسی محاسبہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال درست نہیں ہیں تو نفس ملامت کرنے لگتا ہے اور آدمی دوسرے دن اصلاحِ اعمال اور صالح اعمال کی جانب راغب اور مائل ہو جاتا ہے۔

تزکیہ نفس کے باب میں بعض غالی حضرات نے تعذیبِ نفس کے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے ہیں جو ایک معنی میں نفس پر ظلم کہنا چاہیے۔ مجاھدات اور ریاضتوں میں بھی اعتدال اور توازن کی سخت ضرورت ہے۔ اسلام سے پہلے جو مذاہب دنیا میں رائج تھے انھوں نے عبادت اور نفس کشی کے غیر فطری انداز اور طریقے اپنا لیے، جس کی مثالیں آج بھی عیسائیوں میں تجرد اور رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگی کی شکل و صورت میں ملتی ہیں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں ایسے تصوّرات کے امکانات کو بھی ختم کر دیا۔ چناں چہ ایک مرتبہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم ایک گھر میں تشریف لے گئے تو آپ کی نظر میں ایک رسّی پر مرکوز ہو گئیں جو چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ آپ نے دریافت کیا تو گھر والوں نے بتلایا فلاں عورت رات بھر عبادت میں مشغول رہتی ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس رسّی سے لٹک جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ رسّی کھول دو۔ عبادت اس وقت تک کرو جب تک طبیعت میں نشاط رہے۔

اس مقام پر تین صحابیوں کی گفتگو اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تاکید کا بیان بے محل نہ ہوگا:

ایک صحابی نے کہا: اما انا فاصلی اللیل ابدا میں ساری رات نماز پڑھوں گا۔

دوسرے صحابی نے کہا: انا اصوم النھار ابدا ولا افطر: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہیں چھوڑوں گا۔

تیسرے صحابی نے کہا: انا اعتزال النساء فلا اتزوج: میں نکاح نہیں کروں گا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان تین اصحاب کی گفتگو کا علم ہوا تو بلا بھیجا، اور پوچھا کیا تم لوگوں نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ انھوں نے اعتراف کیا۔ آپ نے فرمایا: اما واللہ انی لاخشاکم واتقاکم لہ: بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ لیکن میں رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ چھوڑ بھی دیتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہذا تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم پر تمہارے نفس کا حق ہے۔ تمہارے جسم کا حق ہے۔ تمہاری آنکھ کا حق ہے۔

احتساب نفس اور اعمال کا جائزہ کو صوفیاء کی زبان میں محاسبہ کہا گیا ہے۔ یہ محاسبہ آدمی کو برے اعمال سے محفوظ رکھتا ہے اور نیک اعمال کی جانب متوجہ کر دیتا ہے۔ بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک تاجر تجارت کے معاملہ میں اپنے شریکِ تجارت سے ہمیشہ چوکنا رہتا ہے اور ہر روز حساب و کتاب پر نظر رکھتا ہے، کہیں اس کا شریکِ تجارت میں نقصان نہ دے۔ اسی طرح آدمی کو ہر روز اپنے نفس کے اعمال کا حساب اور جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور دیکھتے رہنا چاہیے کہ نفس کس قسم کے اعمال انجام دے رہا ہے۔ اسی محاسبہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال درست نہیں ہیں تو نفس ملامت کرنے لگتا ہے اور آدمی دوسرے دن اصلاحِ اعمال اور صالح اعمال کی جانب راغب اور مائل ہو جاتا ہے۔

تزکیہ نفس کے باب میں بعض غالی حضرات نے تعذیبِ نفس کے عجیب و غریب طریقے اختیار کر رکھے ہیں جو ایک معنی میں نفس پر ظلم کہنا چاہیے۔ مجاھدات اور ریاضتوں میں بھی اعتدال اور توازن کی سخت ضرورت ہے۔ اسلام سے پہلے جو مذاہب دنیا میں رائج تھے انھوں نے عبادت اور نفس کشی کے غیر فطری انداز اور طریقے اپنا لیے، جس کی مثالیں آج بھی عیسائیوں میں تجرد اور رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگی کی شکل و صورت میں ملتی ہیں۔

نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں ایسے تصورات کے امکانات کو بھی ختم کر دیا۔ چناں چہ ایک مرتبہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم ایک گھر میں تشریف لے گئے تو آپؐ کی نظر میں ایک رسّی پر مرکوز ہو گئیں جو چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ آپؐ نے دریافت کیا تو گھر والوں نے بتلایا فلاں عورت رات بھر عبادت میں مشغول رہتی ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس رسّی سے لٹک جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ رسّی کھول دو۔ عبادت اس وقت تک کرو جب تک طبیعت میں نشاط رہے۔

اس مقام پر تین صحابیوں کی گفتگو اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تاکید کا بیان بے محل نہ ہوگا:

ایک صحابی نے کہا: اما انا فاصلی اللیل ابدا۔ میں ساری رات نماز پڑھوں گا۔

دوسرے صحابی نے کہا: انا اصوم النہار ابدا ولا افطر: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہیں چھوڑوں گا۔

تیسرے صحابی نے کہا: انا اعتزال النساء فلا اتزوج: میں نکاح نہیں کروں گا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان تین اصحاب کی گفتگو کا علم ہوا تو بلا بھیجا۔ اور پوچھا کیا تم لوگوں نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ انھوں نے اعتراف کیا۔ آپؐ نے فرمایا: اما واللہ انی لاخشاکم واتقاکم لہ: بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ لیکن میں رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ چھوڑ بھی دیتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہذا تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم پر تمہارے نفس کا حق ہے۔ تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے۔

اور تمہاری بیوی کا حق ہے۔ تمہاری پڑوسی کا حق ہے۔ تم سے ملنے آنے والوں کا حق ہے روزہ بھی رکھو، نماز بھی پڑھو اور عبادت بھی کرو اور سو بھی جاؤ اور کھاؤ پیو۔

نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تفہیم کے ذریعہ حقوق کی نشاندہی کر دی اور ان کی ادائیگی ہی کو عبادت قرار دیا۔

انسان کی زندگی میں نفس ہی نہیں اس کی روح اور اس کا جسم بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ جسم اور روح کے حقوق اور ان کی حیثیت اور کیفیت سے متعلق قرآن و حدیث میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں۔ اللہ نے انسان کو ارضی مادّوں سے ایک پتلا بنایا پھر اس کے خشک ہونے کے بعد روح ڈالی: ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون: ہم نے انسان کو خشک مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی تھی، پیدا فرمایا۔

علامہ سیوطی نے روح سے متعلق یہ جملہ کہا ہے: الذی یحیی بہ البدن: روح ایک ایسی لطیف اور غیر مرئی اور غیر مادی چیز ہے جو انسان کے بدن میں داخل ہونے سے جسم زندہ ہوتا ہے۔

انسان کے جسم میں دو نفس ہیں۔ ایک نفسِ حیاتی اور دوسرا نفسِ حساسی۔ نفسِ حیاتی کو روح حیاتی کہا جاتا ہے اور یہ جب تک انسان کے جسم میں موجود رہے گی انسان زندہ رہے گا اور جب یہ جسم سے نکل گئی تو انسان مر جائے گا۔ اور نفسِ حساسی کو روح حساسی کہا جاتا ہے اور یہ سارے جسم میں پھیلی رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے انسان رنج والم اور درد و تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ اور جب یہ جسم سے نکل گئی تو حواس خمسہ معطل ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کا نام نیند ہے۔ نیند کی حالت میں روحِ حساسی کا تعلق جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ انسان کے جسم میں روحِ حیاتی اصل اور اہم ہے۔ اور روح حساسی فرع اور اس کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روح حیاتی جسم سے نکل جانے کے بعد روح حساسی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جسم سے روح کی جدائی کا نام ہی موت ہے۔ موت انسان کی دنیاوی زندگی کے فنا و عدم اور خاتمہ کا نام نہیں ہے بلکہ انسان کی زندگی کے دوسرے رخ اور پہلو کا نام ہے۔ اور اس زندگی کو برزخی حیات کہا جاتا ہے۔ موت کے بعد انسان کے اندر علم، ادراک، شعور و احساس کی صلاحیتیں نہ صرف موجود رہتی ہیں بلکہ دنیاوی زندگی سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر رہتی ہیں۔ کیوں کہ برزخی زندگی میں روح جسم سے قید سے آزاد رہتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں جسم اصل ہے اور روح اس کے تابع رہتی ہے۔ آدمی کے مرنے کے بعد روح اصل ہے اور جسم اس کے تابع رہتا ہے۔ دنیا میں جو بھی اثر روح تک پہنچتا ہے وہ جسم کے ذریعہ اور واسطہ ہی سے روح تک پہنچتا ہے۔ مادی اثر ہو یا غیر مادی اثر۔ مثلاً سردی یا گرمی ہے۔ اس برودت اور حرارت سے پہلے جسم متاثر ہوتا ہے، پھر روح متاثر ہوتی ہے۔ آدمی اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے تو پہلے زبان، ذہن و دل متاثر ہوں گے۔ پھر ذکر اللہ کا اثر روح میں سرایت

کرجاے گا ۔ انسان کو برزخی زندگی میں جو بھی راحت اور تکلیف پہنچے گی پہلے اس کا اثر روح پر ہوگا، پھر اس کا بدن متاثر ہوگا۔ چناں چہ احادیث میں میت کے لیے عذاب اور ثواب دونوں ثابت ہیں اور اس ثواب اور عقاب میں روح اور بدن دونوں شریک ہیں ۔ جس طرح انسان کی دنیاوی زندگی میں جسم اور روح دونوں کی معیت رہی ہے اسی طرح برزخی زندگی میں بھی دونوں کی معیت قائم رہے گی ۔ اس دنیا کا بدن چوں کہ مادی ہے تو وہ پوری طرح ختم ہوکر رہ جائے گا' جو روح کے تابع رہے گا۔

غرض انسان کے جسم و روح اور نفس میں حقائق و معانی اور دقائق کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اور انسان کا حقیقی زیور اس کے اعمال صالح ہیں اگر وہ اعمال صالح کا خوگر بن جائے تو ساری مخلوقات میں اشرف رہے گا اور اس کی روح اور اس کی ذات اور اس کا نفس سراپا نور ہی نور ہے ۔ واٰخر دعونا الحمد للہ رب العلمین ۔

بقیہ "جواھر القرآن" صـ 34 سے آگے ....

اللہ تعالیٰ سے دعا کہ وہ راقم اور قاری کو مذکورہ پندونصائح پر عمل کی توفیق عطا فرمائے !!

آمین ! بجاہِ سید المرسلین

واٰخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں (بالخصوص) ایسی ہیں جن کو رد نہیں کرنا چاہئے قبول ہی کر لینا چاہئے ۔ (۱) تکیہ (۲) تیل اور (۳) دودھ ۔ (ترمذی شریف)

فتویٰ

ادارہ

نابالغ لڑکے اور بالغ بے ریش لڑکے کی امامت کا مسئلہ کوئی نیا نہیں ھے۔ فقہی مسائل سے واقفیت نہ ہونے کے باعث ھر جگہ یہ مسئلہ کھڑا ہوجاتا ھے۔ امور شرعیہ میں اھلِ علم کی جانب رجوع کرنے کی بجائے عوام خود ھی جواز اور عدمِ جواز کا فیصلہ صادر کرتے ھیں جو بھی مسئلہ سامنے آجائے تو اھلِ علم کی طرف رجوع کرنا ھی صحیح اقدام ھے جیسا کہ قرآنِ کریم کی ھدایت ھے: "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون"۔

علامہ شیخ عبدالرحمن بن عیسیٰ المرشدی سے پوچھا گیا کہ جس لڑکے کی عمر بیس۲۰ سال ھو چکی ھے اور اس کے چہرے پر داڑھی مونچھ کے بال نہیں نکلے ھیں تو کیا وہ امرد [نا بالغ لڑکا جس کے ابھی داڑھی مونچھ نہ نکلے ھوں] کی حد سے خارج ھے اور اس کی امامت درست ھے؟ علامہ نے کہا: شیخ احمد بن یونس جو متاخرین علمائے احناف میں سے ھیں، ان کا فتویٰ ھے کہ وہ امرد کی حد سے خارج ھے اور اس کی امامت بلا کراھت جائز ھے۔

استاذی المحترم حضرت مولانا مولوی ابوالمعالی علوی قدس سرہٗ سابق استاذ دارالعلوم لطیفیہ ویلور نے ربع صدی قبل اسی مسئلہ کے استفسار پر ایک فتویٰ تحریر کیا ھے۔ وھی قارئین "اللطیف" کی خدمت میں پیش ھے۔

ڈاکٹر حافظ بشیر الحق عفی عنہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک اٹھارہ ۱۸ سالہ بالغ نوجوان جسے ابھی ریش نہ

نہ آئی ہو کیا وہ فرض نمازوں کے لیے امام بن سکتا ہے یا نہیں جب کہ لوگوں کی خواہش اس سے نماز پڑھانے کی ہے جو قاری و حافظ بھی ہے؟ بینوا وتوجروا۔ السائل: مصطفیٰ حسین

حامداومصلیا صورتِ مسئولہ میں جس بالغ کی عمر اتنی ہے کہ اس کی داڑھی موچھ نکلنے کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور اب تک نہیں نکلے ہیں تو اس کی امامت بلاکراہت درست ہے۔ جیسا کہ ردالمحتار میں ہے: سئل علامۃ الشیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ المرشدی عن شخص بلغ من السن عشرین سنتہ وتجاوز حد الانبات ولم ینبت عذارہ فھل یخرج بذلک عن حد الامردیتہ وخصوصًا قد نبت لہ شعرات فی ذقنہ تؤذن بانہ لیس من مستدیری اللحی فھل حکم فی الامامۃ کالرجال الکاملین ام لا اجاب سئل العلامۃ الشیخ احمد بن یونس المعروف بابن الشبلی من متاخری علمائے الحنفیہ عن ھٰذہ المسئلۃ فاجاب بالجواز من غیر کراھتہ وناھیک بہ قدوۃ وکذالک سئل عنھا المفتی محمد تاج الدین القلعی فاجاب کذالک۔

اور جس بالغ کی عمر اتنی ہے کہ اس کے داڑھی و موچھ نکلنے کا زمانہ ختم نہیں ہوا ہے تو اس کو امرد کہتے ہیں۔ جس کی امامت مکروہِ تنزیہی ہے۔ درمختار کے کتاب الصلوٰۃ باب الامامۃ میں ہے: وکذا تکرہ خلف امرد۔ ردالمحتار میں ہے: الظاھر انھا تنزیھیہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ (دستخط) علوی ابوالمعالی

مدرس دارالعلوم لطیفیہ

مکانِ حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ

حضرت قطبِ ویلور نے اپنے ایک محب صادق الاعتقاد امام الدین مہکری میر منصف ضلع میسور کے نام یہ خط فارسی میں تحریر کیا ہے جس میں فاضل بزرگ مکتوب نویس نے تلاوتِ قرآن کو سلوک کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے اور اہل اللہ کی صحبت کی اثر آفرینی کو اجاگر کیا ہے۔ اور بعض کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے اور صحابیت کے مقام و مرتبہ کو واضح کیا ہے۔ ناظرینِ اللطیف کے لیے اس خط کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

مترجم: ڈاکٹر بشیر الحق قریشی قادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد سلام مسنون واضح خاطر ہو کہ

التفات نامہ جو نہایٔ الفت و کرم کے ساتھ اس فقیر کے نام تحریر فرمایا تھا باصرہ نواز ہوا۔ اور غیر اللہ کے گدلے پن اور تیرگی سے پاک وصاف اور مبرا رہنے کی وجہ سے قلب کو خوشی و مسرت حاصل ہوی۔ اللہ آپ اور آپ کی شان و شوکت اور عظمت میں برکت عطا فرمائے۔

آپ نے کتاب تذکرۃ الاولیاء کے خریدنے سے متعلق اور ترجمۂ قرآن ’موضح القرآن‘ سے متعلق دریافت کیا تھا، اس سے قلبی سرور حاصل ہوا۔ آپ کے لیے بشارت اور خوشخبری ہے۔ اس سے یہ حقیقت نمایاں ہوی کہ اس دَورِ غفلت نشان میں سعادتمند اشخاص دنیوی امور و اشغال کی کثرت کے باوجود حق تعالےٰ کی جانب خواہش اور میلان رکھتے ہیں۔ اور گوناگوں و متفرق تعلقات کے اقتضا انھیں توجہ الی الحق کی دولت کے حصول میں حائل اور مانع نہیں ہے کل اناء یترشح بما فیہ: پیمانہ سے وہی چیز چھلکتی ہے جو اس میں موجود ہے۔

سعادت آثار!

گڈیاتم کے شیر خان نامی صاحب ایک ماہ قبل کتاب ”تذکرۃ الاولیاء“ پانچ روپیہ قیمت سے فروخت کرنے

کے لیے آئے تھے۔ لیکن کتاب قدیم شکستہ، کتابت کی غلطیوں اور مختلف کاتبوں سے تحریر کی ہوئی تھی جس کی وجہ سے نہیں خریدا۔ وہ صاحب رانی پیٹ تشریف لے گئے ہیں، اگر واپس آئیں تو حاصل کر کے آپ کو روانہ کروں گا۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ کو غنیمت جانیں جو دل کے زنگ کو زائل کرنے میں اور رنگ عطا کرنے میں صیقل اور اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور ان سے دل روشن و منور ہو جاتے ہیں۔

مولوی شاہ عبدالقادر صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے برادر محترم ہیں انھوں نے "موضح القرآن" کے نام سے قرآن حکیم کا اردو ترجمہ تحت اللفظ کیا ہے اور اس کے مطالب و معانی جا بجا حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے اور یہ ترجمہ اپنی نظیر آپ ہے۔ کم و بیش ستائیس ۲۷ روپیہ میں مدراس میں دستیاب ہو رہا تھا لیکن اب یہ عنقا ہے۔ تاہم مدراس خط بھیجا ہوں اگر مل جائے تو آپ کو روانہ کروں گا۔

کرام اطوار!

اللہ تعالیٰ کی نظر انسان کے دل پر ہوتی ہے نہ کہ اس کے جسم پر۔ لہٰذا قرآن کریم کی تلاوت کے وقت دل کی توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب رہنا ضروری اور لازمی ہے اور یہ کیفیت کلام اللہ کے مطالب اور معانی فہم و ادراک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور بالخصوص تلاوت کے دوران معانی و مطالب کا ذہن میں مستحضر رہنا ایسا ہی سمجھو جیسا کہ بدن کے لیے روح اور تھیلی میں زر۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ذکر، مراقبہ اور تلاوتِ قرآن ہے اور اس میں بہترین راستہ تلاوت ہے اور حضرات صحابۂ کرامؓ کا سلوک زیادہ تر اسی راستہ سے ہوا۔ زبان نبوتؐ نے ارشاد فرمایا: انی ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی: میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں قرآن کریم[۱] اور اہل بیت[۲]۔

تلاوت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو بغیر واسطہ سنیں۔ یہ ادنیٰ مقام ہے اور ہر قصہ اور ہر خطاب کا مخاطب اپنی ذات خیال کریں، یہ درمیانی مقام ہے اور اس میں اپنے افعال و صفات کا مشاہدہ کریں، یہ اعلیٰ مقام ہے اور جب اس نہج اور کیفیت کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کی جائے تو اس کے فوائد و نتائج اور ثمرات کی امید رکھیے اور فیوض و برکات کی فراوانی اور کثرت کا مشاہدہ کیجیے۔

ہاں! یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ قلوب کی اصلاح و تربیت میں صحبت کو بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابیٔ رسولؐ کے مقام اور مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا اور ایک غیر صحابی کو احد کی مقدار میں دیا ہوا صدقہ ایک صحابی کے مٹھی بھر گیہوں کے صدقہ کے اجر و ثواب میں ہمسری اور برابری نہیں کر سکا۔ ایک شخص سے عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ سے یہ دریافت کیا: ایھما افضل معاویۃ ام عمر بن عبدالعزیز؟ معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا عمر بن عبدالعزیز؟ فرمایا: الغبار الذی دخل انف فرس معاویۃ مع رسول اللہ علیہ وسلم خیر من عمر بن عبدالعزیز! رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی و صحبت میں

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پہنچا وہ بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے۔ یعنی غیر صحابی علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور ولایت میں کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، وہ ایک صحابیٔ رسولؐ سے افضل نہیں ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی صاحبِ دل کی مصاحبت و ہم نشینی عطا فرمائے تو اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں۔ لہٰذا آپ کسی مرشدِ کامل کی صحبت نصیب ہونے تک کیمیائے سعادت بالخصوص خود شناسی، خدا شناسی، حقیقتِ دُنیا اور کیفیتِ آخرت کے موضوعات و مباحث کا مطالعہ جاری رکھیں اور موضح القرآن، زاد الآخرت (امام غزالی) اور تذکرۃ الاولیاء کی تلاش و جستجو میں رہیں۔ یہاں کے حالات اچھے ہیں اور تمام احباب و متعلقین بخیر و عافیت ہیں۔

حضرت قیوم جل جلالہٗ سے آپ کی خیریت و خوبی اور فلاح و بہبودی کا خواہش مند ہوں اور اس خواہش میں علاقۂ میسور کے مسلمانوں کے جم غفیر کی خیریت و خوبی شامل ہے۔ اور آپ کے حق میں دعا کرنا ان تمام مسلمانوں کے حق میں دعا کرنے کے مصداق ہے۔ آپ کا سایۂ زندگی قائم رکھے۔

اللہ کی نصرت اور تائید تمہارے ساتھ رہے گی تم جہاں کہیں رہو۔

بقیہ "باب النقوش (تعویذ) ص 148 سے آگے

پانی میں گھول کر کپڑے سے چھان کر استعمال کریں۔ یہ بھی پاک روشنائی ہے۔ اس سے بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر ناجائز تعلقات کو چھڑانے اور دشمن سے حفاظت وغیرہ ایسے کاموں کے لیے کالی روشنائی سے لکھنا افضل ہے۔ اور اس طرح زکوٰۃ کے لکھے ہوئے نقوش کو مناسب ڈھنگ سے پانی میں بہا دیں یا زمین میں دفن کر دیں۔

اس راہ میں آگے اور بہت سی باتیں ہیں، جس کو ضرورت مند ناظرین کسی ایک اچھے باعمل دیندار عامل سے رجوع فرمالیں۔ یہاں پر ہم نے تو صرف ناواقفِ محض کو قدرے تعارف کرایا ہے اور بس ورنہ یہ تو وہ چیز ہے کہ بغیر رہبر و استاد کے ایک قدم بھی چلا نہیں جا سکتا

واللہ اعلم بالصواب

بِسۡمِ اللّٰہِ جَلَّ جَلَالُہٗ مَالِکَ الۡمُلۡکِ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَحۡدَہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ

جواہر السلوک

ترجمہ: مولانا سید احمد محی الدین قادری الحافظی

فائدہ نمبر ۲۷

حضرت قبلہ مولانا مولوی رفیع الدین نقشبندی قندھاری اعلیٰ اللہ مقامہ نے مؤلف رسالۂ سلوک قادریہ کا خلاصہ ان چار اقسام پر کیا ہے:

اول ولایتِ مسلم عوام الناس: جو ارشادِ باری تعالےٰ: اللہ ولی الذین آمنوا یخرجوھم من الظلمت الی النور۔ اللہ جل شانہٗ جن اولیاء کو اندھیروں سے اجالوں کی طرف ظہور میں لایا، جس میں پوری اُمتِ مرحومہ اس دَورِ ولایت میں داخل کردی گئی اور یہی مشغلہ اس تعلق سے ولایت اول میں قائم ہے اور وہ اسی طور پر موجود ہے۔

ولایتِ دوم: اس کو ولایتِ صغیر کہ وہ اللہ جل شانہٗ کے مخصوص ہستیاں منتخب ہوئیں اور یہ مرتبہ اس دَور کا ہے جب کہ اللہ جل شانہٗ "سب کچھ صرف میں ہی ہوں" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دَورِ ولایت میں ذات اور صفات کی تجدید تمثیلی طور پر ظہور میں آئی اور توحید اس کی صفتِ ذاتی ہے اور تمام خارجی اعتبارات میں مشغول ذاتِ الٰہی ہیں۔

ولایتِ سوم: اس درجہ میں خصوصیت یہ ہے کہ ولایت کی بلندی اور ہر معیار املاک کا استنباط اس کارفرمائی کے قرب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس ولایت کے درجات صرف تصوّر یعنی موہوم خیال اور تنزیہ میں ذاتِ حق کا ادراک اور بلند و بالا پھر وحدانیت کی کیفیت میں اعلیٰ علیین کا خاکہ ہے۔

ولایتِ چہارم: اس دَور اور عالم کے مخصوص اعتبارات انبیاء علیہم السلام سے معنون ہیں اور اس میں خیالی طور پر غلو کیا گیا ہے اور یہ غیر حق کے اعتبارات ہیں۔ اور پہلی ولایت کے اظہار میں ہر مرتبہ سامنے آگیا ہے اور بعدِ ظہور اس کا مرتبہ ولایتِ دوم جو صرف احاطۂ تصوّر کے دائرئے حدود میں باشتراک عمل اور اللہ جل شانہٗ کا خود کا عین ہیں ممکن ہے جسے عالمِ امکان کے اعتبارات میں ایقان کے منازل کا واجبی طور پر جو اس نوعیت کا خاصہ ہے اجازت دیتا ہے اور یہی اس کا مفہوم ہے کہ اس منزلت میں سلوک اشیاء کے نمود میں حق کا موجود ہونا عملی کی پہچان کا ایک حربہ بدست ہونے کا وسیلہ پیش کرتا ہے کہ یہاں دو وجود ایک ذات سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور حقیقت میں مادّیات اللہ جل شانہٗ کی صفت معلوم ہے کہ علیم اور موجودات بمنزل معلوم اس کی اپنی پاکی اور تخلیق کی آئینہ دار ہے۔ لہٰذا یہاں پر دو وجود ایک ذات کا موقف بر حق ہے۔ اگرچہ کہ وجود غیر اس تعلق سے اسی کی شانِ کریمی کی گرفت میں ایک ہی منزلت تسلیم کرتے ہیں اور ولایت سوم میں حق کے

تصوّر کو تنزیہ انداز میں اس کی بلندی کی پھر وحدت الوجود کی صفاتِ عالیہ کا کنز جانتے ہیں اور جو بھی ذہنِ انسانی ہیں گشت کرے وہ صرف ایک تنزیہی اعتبار رہے اور اس کی ذات عالی مبّرہ و منزّہ ہے اور انداز میں اذہان کے اردگرد رواں دواں ہے اور اس گشت میں ٹھہراؤ نہیں ہے اور اس ولایت کو ولایتِ مثبوت سے موسوم کیا گیا ہے اور عامۃ الخلق ان میں فرق سے اس طرح پڑھتے ہیں کہ یہ ولایت "ہمہ اوست" کی منزلت کا اظہار کرتی ہے اور عالمِ احدیت خود اس کی موجودگی کی شہادت ہے اور موجودات کا تحمل خود اللہ جل شانہٗ کا منشاء اور اس کی قدرت کی تحمل میں بلکہ اپنے نور میں محلل کرتا ہے۔ صرف چند ایک طور پر متشرق ہیں کہ مادّیات میں کس درجہ موجودات کا محل وقوع ہے۔ اس تعلق سے بھی بے خبر ہیں۔ ولایتِ چہارم میں بھی کس درجہ ان موجودات کا اطلاق ہے۔ اس پر بھی تنزیہی اعتبار قائم ہے بگر تنزیہی موقف تمام مخلوق سے بہ نسبت انبیاء علیہم السلام کی حد تک تشبیہی اعتبارات ہیں، جو اُن کو حاصل ہیں۔ لہٰذا خیال کا تعلق اللہ جل شانہٗ کی ذات گرامی سے منسوب کرنا ایک فعلِ عبث اور غلط خیال ہے۔ اور اس کے شایانِ شان نہیں ہے اور اس کی اپنی ذاتِ بابرکات کے درجہ شانِ کریمی تک رسائی اور پھر اس کو بے تعلق جاننا کوئی عقل مندی کی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی انہیں کوئی کیف و سرور دستیاب ہو سکتا ہے اور نہ ایمان میں ہی تقویت ہو سکتی ہے۔ محض اس ہستی کے لیے جو مقامِ سلوک پر فائز ہے اور سلاسلِ قادریہ اور اس کے آئین کا متبع ہے۔ اس طور پر کہ قدیم تحقیق کرنے والے اور علماء اور صالحین جیسا کہ اس تعلق سے حضرت قطبِ ربّانی محبوبِ سبحانی شیخ کائنات سید عبدالقادر جیلانی اعلی اللہ مقامہٗ کو ربّ العزت کی جانب سے مجاز اور کارکردگی کا حکم عطا کیا گیا اور سلوک کے پورے اعتبارات اور سلوک کی پوری کیفیت یعنی اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ کاملہ کی سیر اور خود اس کے ذات کی حقیقت کی شناسائی حضرت قبلہ کی کہاوتوں اور ہدایات میں مندرج ہیں۔ اگر اللہ کا فضل شاملِ حال ہے تو پھر مسئلہ تجدد امثال کی عقدہ کشائی وحدت الوجود کے گرہ کو کھول دے گی اور دقیق مسئلہ "میں سب میں سب مجھ میں اور سب کچھ میں" اَلْکُلّ فِی الْکُلّ اور پھر دوسرا عکس حیثیت سے مجھ میں موجود ہے۔ اس کا اظہار خود بخود سیر کرنے والے پر ظاہر ہوگا اور پھر راہبرانِ راہ طریقت اپنے وابستہ دامانِ سلاسل پر اس کی تفہیم اور تعلیمی اعتبارات میں روشناس اور واضح کر سکتے ہیں۔ خصوصیاتِ لامتناہی بس اس کے بعد اس بات کو تحت الشعور میں اس طرح ترتیب دیں۔

مسئلۂ معیّت

تجدد امثال یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کو صفات اور ذات کے اعتبارات میں وجود مکمل جامعہ الصفات میں مدغم جاننا اور اَلْکُلّ فِی الْکُلّ

دراصل یہ ایک صوفیائے کرام کی دانست میں بلند تر موقف ہے اور یہ مسئلہ ترجمان نبزی کے قلم کا آشکار ہے اور
وابستگیٔ حق دراصل ہے پن کا تجلی ہے جو کائنات کی موجودگی جب کہ اس رفعت اور پاکیزگی کو وجودِ باری تعالیٰ سے
اظہارِ شہود جو موجودات میں ہے وہ دراصل تقیدات میں مضمر ہے۔ لہذا " وابستگی" یعنی معیّت جو ذات الٰہی ہے
درحقیقت ایک نازک اور رکیک موقف ہے۔ اللہ سے وابستگی سے احتراز لحد ضروری ہے ورنہ شرکِ جلی کے
مراجعات کا قوی اندیشہ ہے اور پھر صفاتی وابستگی کے ادراک میں پریشانی لاحق ہونا ضروری ہے جو موجب اعتراض ہے۔

اوّل یہ کہ قرآنِ مجید اور احادیث نبویؐ میں جو ایمانیات کا اندراج ہے وہ از خود ہے اور نہ ہی صفات و
ذات بلکہ قرآنِ حکیم کی اس آیت پاک کا حوالہ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُم (اور وہ تمہارے ہی ساتھ ہے تم
جس مقام پر بھی ہوتے ہو) اور اس کی کریمانہ صفت یہ ہے کہ ہر شئے پر قادر ہے۔ اب اس طرح کن اعتبارات
میں کچھ کر سکتے ہیں اور صفات کو ذات سے علاحدہ کر سکتے ہیں۔

دوم یہ کہ پہلے زمانہ میں کسی نے بھی اس معاملے میں تاویل نہیں کی۔ چناں چہ حافظ ابن حجران نے یہ تحریر کیا
ہے کہ تاویلی مخالفت میں جو کی گئی ہے وہ ادوار میں ایک بہتری پیدا کرنے سے متعلق ہے اور جس کی نسبت صحابۂ کرامؓ
نے بھی اپنے ارشادات میں واضح فرمایا ہے۔

سوم صفات اور ذات ہر دو ایک دوسرے سے مستنبط ہیں اور بیان کرنے والے بھی اس تعلق سے
اتفاق کئے ہیں کہ صفات کی زیادتی اور صفات کا موجود ہونا بالکل یک طرفہ ہے اور وہ بالکل ایک ہی ذات کا پرتو ہے
اور حق دار ہونا ثابت ہے اور وہ اللہ جل شانہٗ کے ارشاد سے متعلق کہ میں ہر شئے کا علیم ہوں فقط جو باالتزام
میری اپنی ذات سے متعلق جو اس طور مستقل اور صفاتی پرتو ہیں انفس پر طاری ہوتے ہیں اور جب بھی اشتہا ہو یہ کارفرما
ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ صفات وابستگی لازم و ملزوم ہیں۔ جن کو اپنے اندازوں میں کارفرما ہونا لازم ہے۔ اب یہاں
تاویل بالکل بے محل ہے اور اس سے کوئی بھی فائدہ حاصل ہونا قطعاً ناممکن۔ اپنے ہاتھوں اس جانب کشاکش خود بخود
اپنے سامنے چہرہ کی غمازی کرتی ہے اور اپنے پیروں کے نیچے کشتی خود بخود موجود ہے اور بیٹھک کا آسرا ہے محققین اور کلام
کرنے والے ماہرین اور مفکرین اور ساتھ ساتھ حضرت شیخ عبدالوہاب شعراوی اپنی تصنیف "الیواقیت الجواہر" جو
عقایدِ صحیحہ سے متعلق بہت ہی بڑھ چڑھ کر قلم زد فرماتے ہیں کہ ۹۵ھ میں اس مسئلہ سے متعلق جو سپردگی یا وابستگی سے متعلق
ہے، شیخ بدرالدین علائی حنفی و شیخ مولائی شادلی کے درمیان ایک نشست کا انعقاد ہوا۔ شیخ ابراہیم علائی نے اس موضوع بحث

پر ایک الگ ہی طور پر تحریر فرمایا ہے اور ان کے اصول اس بارے میں ضبطِ تحریر کئے گئے ہیں۔ کذانی کے اصل الاوصول میں تفصیل اس مسئلہ سے متعلق ایسی ہونا چاہیے چونتیس اصل الاوصول اور تصنیف کتاب الواقیت والجواہر اور دیگر اس سے وابستہ رجوع کئے گئے ہیں اور پھر بیانِ مسئلہ ذات باری تعالےٰ کے صفات تفریدہ جو صفات اور ذات کے ثبوت اور خصوصیات اور ذاتِ واجبیت اور پاک وطاہر اور پھر وجود باریٔ تعالےٰ "وَمَا کَانَ اَوجِسۡمًا جَوھَرًا" اور ہیں وجود میں موجود ہوں اور میرا وجود میں موجود ہونا، خود میرے صفات کے جوہر ہیں۔ کَانَ اَوعَرضًا اور پھر میرا پھیلاؤ اس محل وقوع پر کوئی شئے مجھ سے وابستہ نہیں ہے اور ان تحدیدات میں بقا محتاج برب قیوم کائنات کا پالن ہار قائم بالذات اور حقیقتِ قیام ہونا ضروری ہے۔ اور تجدد امثال سے متعلق۔

اللہ جلّ شانہٗ کے ارشاد سے متعلق کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِی شَانٍ ہر روز کے ہر لمحہ میں ایک انوکھی شان سے تجلّیاتی پرتو کا ظہور اور دیگر تجلّیات کا ظہور وجود کی شہادت کی عکاسی ہے۔ جو ہر صفت میں ایک علاحدہ شانِ کریمی کا خاصّہ ظہور میں نمودار کرتی ہے۔ اور پھر ہر آن ایک علاحدہ صفت کا شہود ہوتا ہے اور ہر صورت میں اظہارِ صفت کے بعد عدم المعدوم کا خاصہ ہے ثبوت کو روشناس کراتا ہے اور اسی طرح صفاتِ متجلّی یکے بعد دیگرے متواتر ترسیل میں آتے رہنا تجلّی کو تکرار نہ ہونے کا موقف پیش کرتے ہیں۔ کہ ظہورِ صفات ایک موقف پر پیش آتے ہیں اور پھر معدوم کے بعد دوسری صفت نمایاں اور دوسری شان سے متجلّی ہوتی ہے۔ دو وجودِ فنا اور بقا کے خواص ایک دوسرے کے متعاقب روشن ہوتے ہیں۔ اور موجود فنا کی تاثیر یہ ہے کہ عدم المعدوم میں وجود باقیات کی غمازی کرتے ہیں۔ حضرت مولانا جامی علیہ الرحمہ اپنی تالیف "اشعۃ اللمعات" میں ارشاد فرماتے ہیں: اللہ جل شانہٗ تجدد امثال کے اندازوں میں سے ایک آئینہ کے نمود میں دوبار صورت کو نمایاں فرماتے ہیں۔ اور دو آئینوں میں ایک ہی مرتبہ دیدار ذات کا اظہار نہیں ہوگا۔ ابوطالب مکی قدس سرہٗ (پاک کرے اللہ ان کے رازوں کو) ارشاد فرماتے ہیں:

لایتجلّٰی الی الحق سبحانہ فی صورۃ واحدۃ لشخص واحد مرتین ولا فی صورۃ واحدہ لاثنین والا بالزم لتکرار فی تجلی دھو عبثٌ وتجلی لواحد الحقّ عن العبث

اور اللہ جل شانہٗ ہرگز متجلّی نہیں ہوتا ایک ہی صورت میں جو ایک ہی وجود میں موجود ہو دو مرتبہ اور نہ ہی ایک ایک ہی صورت میں ظاہر ہوتا ہے البتہ دو صورتوں میں جب کہ تکرار بواسطۂ تجلّی ہو اور یہ فعل عبث ہے جب کہ ایک ہی مرتبہ اس تعلق سے بلندی منسوب ہو اور وہ ذاتِ واحد برحق ہے۔

سوال: اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ عدم المعدوم میں تجلّی کو تکرار لازم آجائے کہ معدوم اس طرح الطال کا خیال کرتے ہوئے دنیا میں بنظرِ تکلّف اور آخرت میں بھی یہاں تک کہ اس طور پر مکلّف ہونا جزا کے وقت بے تعلق سوائے غیریت کے اور کچھ نہیں کہ دورانِ عمل ہوئے اور ردوم اس کا حشر جسدِ انسانی اور اعمال کی جزا ثابت ہوا ہے بحدِ شرع اور کشف کے عاید کردہ اعتبارات میں؟

جواب: اس طرح دیا جانا ہوگا کہ حکم کا ثبوت جس کا ذکر اتحادِ ذات سے منسوب ہے اور ذات و حقیقت ہی ہے اور اس کے منافی آواز اور احوال منشائت نہیں ہے جو اس پر کارفرما گردانا جائے۔ پس بشر کی حقیقت بلکہ ہر ذرّہ کی حقیقت جو کائنات میں جو ذاتِ الٰہی کی جانب معنون کی گئی اور حقیقت کچھ بھی نہیں صرف علمِ توحید میں وہ حدت جو تعالیٰ یعنی بلندی کے ہے وہ صرف نفی میں ہے کا جواب جو اللہ جل شانہٗ کے ہونے پن کا اثبات پیش کرتی ہے، وہ صرف شناسائی سے متعلق جو معلوم کا کھوج پیش کرتی ہے اس کو علم قدیم میں حق تعالےٰ کے موجود اور رحمتوں کا فیض حق تعالےٰ کے وجود سے جاری و ساری ہے۔ اس صورت میں اس کی قابلیت جاری و طاری رہتی ہے اور اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: اولاً انسان کے ذکر کو بے شک جیسا کہ میں نے اس کو ظاہر کیا اور اس کے وجود سے پیشتر اور پھر اس وقت کوئی شئے بھی موجود نہیں تھی اور پھر اس ظہور کا پتہ لگانا کہ اس کو ہم نے بے موقعنی اعتبارات میں ظاہر کیا اس موجب پر کہ "ہر شئے اس کی اپنی اصالت پر لوٹ جاتی ہے" اور ہر دم اس طرح کہ اس کی اصل نفی یعنی عدم المعدوم کی سرشت ہے اور وہ بالذات اس طور باہمد گیر حاصل کرتا ہے لیکن اس صفت پر کہ اللہ جل شانہٗ ہی کی ذات بقائے دوام ہے۔ دمبدم اس ہی کی تجلّی کی بو اس کی موجود رکھتی ہے جو فنا سے محفوظ ہو کر اپنے وجود میں لطف و سرور رہونا ثابت ہو کر جہت وجود کا آشکار ہوتا ہے اور کسی وقت بھی اللہ جل شانہٗ کے وجود سے علاحدہ ہو کر جب کہ صرف اس اثر میں قائم رہتا ہے۔ ہر چند اس اصول کے سبب سے اس پر کسی قسم کی آگہی نہیں ہوتی اور یہ اشارہ کہ اللہ جل شانہٗ ارشاد فرماتا ہے بلکہ اللہ نے اس کے نفس کو ایک جدید موضوع پر خلق کیا ہے: مثنویِ شریف:

ہر نفس دنیا میں ایک نیا رنگ اختیار کرتا ہے
ارے او بے خبر تجھ کو تیرے باقی رہنے کا علم نہیں
تری عمر ہر لمحہ اس طرح نئی دریافت میں متلاشی ہے
اور وہ تیرے جسم میں سرگردانی کا خاصہ لی ہوئی ہے

اور آگ اس طرح بلاتی ہے کہ ہر ربط کا رخ آواز دے رہا ہے

اور نظر میں صرف آگ ہی آگ ظاہر ہو رہی ہے

اور یہ وسعت تیزی سے ہے اور یہ کاریگری ہے

اور یہی تیری صورت کے نکھار کی آئینہ دار ہے

پس تیرے لیے ہر لمحہ وصل اور پھر واپس ہے

ختمی مرتبت نے ارشاد فرمایا کہ دنیا صرف ایک ساعت کے لیے ہے

اور ہر دم اس سے آواز "کیا میں نہیں ہوں" آ رہی ہے

ترے وجود کے پرزے بالکل بوسیدہ ہوتے جا رہے ہیں

اور اگر تجھ پر اظہار نہیں ہوتا ہے تو یہ اور بات ہے

لیکن عدم سے آنا البتہ تجھ پر ظاہر ہے

انسان کے جسم کے اندرونی حصے میں جان کا ہونا ظاہر ہے جو وجود انسانی ہے

اور غیب سے اس طرح سے ہے جیسا کہ پانی کا بہاؤ ہے

اور اس طرح سے ہزار ہا ادوار آتے رہتے ہیں

اور پھر گم نامی کی جانب اس طرح معدوم ہو جاتے ہیں

اور ہر روز جو بھی وجود ہوتا ہے وہ نہیں کے مانند ہو جاتا ہے

اور اس طرح کہ پانی اندرونی طور پر تموج کے بعد عدم ہو جاتا ہے

اور ہر روز مسرت ایک نئے طرز پر نمودار ہوتی ہے

اور زمانے کی روش پر روز ایک دوسرا اثر دکھاتی ہے

الحاصل فرمانِ قہر پنہانِ وحدت با ظہار نفاذ فرمان یہ ہے کہ ظہور کے آئینہ میں اس برتر ہستی کے ظاہر میں کوئی بھی چیز اپنی ہیئت کے لحاظ سے اپنے وجود کا ثبات نہیں رکھتی یہاں تک کہ زمانے کے تصوّر سے بھی یہ بات پہچان میں آتی ہے کہ موجوداتِ موہوم الاتصال ہے اور اس کا معنوی انداز ملاحظہ کا محتاج نہیں ہے اور اللہ جل شانہٗ کے عنایات اور لطف وکرم اور تجلیات مراحم اور کبھی نہ ختم ہونے والے نوازشات ان ماحولیات میں شامل ہیں اور وہ یہ کہ صحیفہ کاملہ کے

تنزیل کے فضل وکرم جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ناسوتی بدن جس کے سبب سے مخلوقات کو آپ کے کلمات سے جو اللہ جل شانہٗ کی جانب سے عطا ہوئے اللہ کے منشا اور تعبیر کا خلاصہ ہے۔ حالاں کہ اس جامعۃ الصفات نسخۂ انسانی کی روشنی میں "وَفِی اَنفُسِکُم اَفَلَا تُبصِرُونَ" یعنی میں نفوسِ انسانی میں جاگزیں ہوں۔ لیکن اب تک تم نے نہیں دیکھا اور عدم ثبات و بیانات کے استقرار کے باوجود اس طرح یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ وجودِ بشر میں مکیں ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ بھی نہیں ہے۔ اس اطلاع کی مطابقت اور اندیشہ اس معاملہ ایسا ہے کہ سچے طلب گار کا اس طرح پا جانا:

بقا کے ملک کے مالک سوائے واحد قہار کے اور کوئی بھی نہیں ہے
اور اس کا قہر ہے کہ اس کی وادی میں اور کوئی دوسرا مالک نہیں ہے
اور جو کچھ اس عالم کے غیاب میں ہے وہ صرف غائب ہی غائب ہے
اور جو کچھ کہ ہے اور ہوگا یہ ہمارے ذہنِ رسا سے بعید تر ہے
اور وہ جو موجود ہو کر شمار کیا جاتا ہے وہ موجود ہے لیکن دیکھنے کی بصارت نہیں ہے
لیکن حجاب کرنے والوں کی نظر کے لیے صرف واسطہ کا شناختی اشارہ ہے
ماحولیات کی امثالی مناسبت صرف ایک حال پہ صرف آمد و رفت کی تیزی میں
سامنے اور پوشیدہ اس طرح کہ چراغ کی روشنی اور بھڑکنے والے شعلہ اور نکھرتا ہوا پانی اور ساکت حالت میں موجود پانی اس کے حکم کا تعمیلی خاصّہ ہے۔

اس گلستان میں موجود ہر وہ وجود جو صفات اور ذات کا مظہر ہے اللہ جل شانہٗ کے کمالِ تخلیق اور جوہرِ مطلق کا شاہ کار ہے۔ اور یہاں وجود کے اعتبارات میں صرف میں اور تو کے اعتبارات میں نازاں اور متکبر ہیں۔ ہمارا وجود اللہ جل شانہٗ کی صفات سے مہکتا ہے اور اسی کا وجود ہماری سرشت میں محلل ہے اور اہلِ نظر کے نزدیک خودستائی کا جوزعم ہے اور اس کو مرکزیت دیے ہیں حقیقت میں ان کے یہ ذاتی اغراض ہیں اور خود ان کے اپنے یہ جوہر نہیں ہیں۔ اور ان میں کے بعض اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ بابرکات پر تجدیداً اور مثالی طور پر صفات سے اکتفا نہیں کرتے ہیں۔ اہلِ نظر کے نزدیک جواہر و اغراض دراصل ایک اصطلاحی معنوں میں شمار ہوتے ہیں اور اس کو امکانات کا خاصّہ سمجھتے ہیں اور اس طرح جوہر کا اطلاق جو ذات کا جوہر ہے جو لغات کے معنوں میں کوئی اہم خصوصیت کا حامل نہیں ہے

اوراس طرح بحیثیتِ مجموعی جیسا کہ محققین کے کلام میں جو ہدایات ہیں ہماری دانست میں یہ بات آجانا چاہئے کہ اُن کے سوا اور کوئی بھی تجدد امثال سے باخبر نہیں ہے۔ لیکن شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین جو محققان توحید اور بعض اشاعرہ اور بعض متکلمین ہیں وہ اس عالم میں جو بھی موجودات ہیں اس پر یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ صرف شناسائی کی غرض سے تمثیلی اعتبارات میں وجود کو مختلف انداز میں ظہور دیا ہے اور آٹھ صفات میں سات توحیدی ایقانات ترتیب دیا ہے اور ہر زمانہ میں ہر شئے میں تغیر اور زمانہ کو عدم کی جانب فنا کرتا ہے اور جس شخص کو وجود میں لاتا ہے وہ سابقہ شخص کے مماثل اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ یہ صرف نظر بازوں کی حد تک ظاہر ہے اور اس طرح متکلمین کی نظر میں اُن کا احتیاج اس طرح سے غیر موثر ہے اور خلاء میں یہ بھی امکانات نہیں ہیں جو فلسفیانہ نظریات سے اللہ جل شانہٗ کی تخلیق کو اس کے وجود کی ابتداء کا ذریعہ جانتے ہیں اور تجدید کے نظریات میں بھی جو کائنات علم المعدوم ہے اس کے برعکس صرف اس کی پاکی پر نظر ہے۔ جو عالمین کا وجود لازم آنا ضروری نہیں ہے۔ اور کائنات کا اس طرح سے موجود رہنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ لہذا اللہ جل شانہٗ کا ارشاد۔ بس اپنے صفات کے اظہار کے لیے اس کائنات میں غرض اور موجودات کی حاجت روائی کے لیے اس تعلق کو عوام سے مربوط کر دیا اور اس طرح وجود میں جو تخلیق کا جوہر ہے وہ اسباب وعلل کے ذریعہ پہنچا دیا۔ اس لیے کہ موجودات کی بقاء کے لیے بلا اظہار محال ہے۔ اور لیس ”اور ہیں“ عوالم کو اس کا محتاج بنا دیا اور ”ہیں ہی“ کا لفظ بہر طور ہر لمحہ ایک نئی شان کا مصداق گردانا اور اسی طور پر ہر آن ایک نئی شان کا ظہور عمل میں آیا اور اسی تجدد کے سبب یہ بات کائنات کی تخلیق کا باعث ہوی۔ اور یہی ایک سبب ہے جو استغنار کے اعتبارات میں منافی ثابت ہوی اور مؤلف ”ھدیۃ الانوریہ“ فرماتے ہیں اور یہ اشارہ اس انداز سے کیا گیا۔ بے شک یہ کہنا کہ زمانوں کو دوام حاصل نہیں ہے اور بولنے والوں کے بولنے کی وجہ اس طرح ہے کہ وہ صرف سبب کے محتاج ہیں جو انھوں نے باحتیاط تمام اس طرح بولنے پر لزوم عاید کر لیا اور عالم نے جو استغنا برتا ہے وہ اتصال ہے جو عدم پر فائز آتا ہے اور اس طرح اس کی بلندی ظاہر ہوتی ہے اور ”میں عدم میں موجود ہوں“ اور یہ موجودگی میرے بقاء کے لیے مشروط ہے اور یہی جوہر تخلیق مجھ میں موجود ہے اور یہی تجدید محتاج اثر تھی اور پھر یہی جوہر اسی طرح بقاء ذات کا مظہر ہے اور اس طرح میری ذات شرطِ ذاتِ الٰہیہ ثابت ہوی۔ اور اسی میں اصل الوصول استغنار کا پرتو شامل ہے جو میرا منشاء ہے۔ شرح السید السند فی شرح المؤلف حسبانیہ جو نسطایہ میں ایک

متعارفانہ درجہ کا حامل ہے وہ موجودات کے ہر ذرّہ میں موجود ہے۔ اسی معرضہ میں تجدد امثال کی کیفیت کے قائل ہیں اور فریقین ہیں کا ہر ایک غلطی کا مصداق گردانا گیا اور وہ ہستیاں اگرچہ کہ عدم بقاء سے متعلق معرض حق پر ہیں لیکن اُن سے بھی خطا کے ارتکاب سے متعلق اس طرح کہ اس حقیقت اور وجودِ مطلق اللہ تعالےٰ کے تقدس اور جوہر تخلیق کے ثبوت پہ بے شمار موجودات میں ظہور پذیر ہیں اور اس متبادل کیفیت سے جو تجدد سے متعلق ہے قائم ودائم ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس بساطِ عالم میں کتنے جواہر تخلیق اس جامع الصفات میں موجود ہیں اور کن اجزاء کا اجتماع بغرض خلق اس طور پر اپنے تجدد کے لیے درپیش ہوا ہے جو نفوس میں مشترک اور علی الترتیب زینتِ تخلیق ثابت ہوا ہے کہ ایک ہی آن میں ان خصوصیات کی ترتیب اور ہر آن کا انتشار جو ظہورِ ترتیب کا خاصہ تھا عمل میں لایا گیا اور یہ تمام وکمال ایک ہی جھٹکے میں بے ثبات اور معدوم ہوا ہے۔ چناں چہ یہ عناصر تخلیق جو ابتداءً پانی ہی پانی تھا اور آج ہوا بنا ہوا ہے۔ پس اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان موجودات کی نمود و نمائش صرف ایک ہی جوہر سے ہے کہ وہ ایک وجود میں نظر آتا ہے جو پانی کی ہے اور دوسرے دن اس کی ہیئت اور ہو جائے گی اور پھر اس حال میں موجودات بلکہ جو بھی پانی کی صورت میں نمایاں ہوا ہے اور پھر اس موجود کا مقصد دوسرا ہے اور جو اب اس بانکے اور نظر نواز نگاہ کا پرتو بنا ہوا ہے۔ وہ حسن وجمال دوسرے لباس میں موجود ہوگا۔ جیسا بھی ہوگا دیکھنے والا نظر باز ایک متبادل لباس اور اس مثالی وجود کا تعاقب مثالی کو ایک دروغ طور پر دیکھے گا اور وہ ربّ العزت کے حکم سے ایک صورت پتلا زبن پائے گا : ۵

نہ تو کوئی کمی ہوئی اور نہ کوئی زیادتی ! 　　موجیں اس کے اوپر سے گزر گئیں اور پھر آ گئے

کائنات جو ایک عبارت ہے اور اسی طرح سے 　　دو زمانے نہیں تھے بلکہ وہ ذات باقی تھی

عالم گم نامی کا تھا۔ اگرچہ کہ عقیدہ صرف عالم کے بدلنے کا تھا۔ اس کے راز اور قائم وغائب اور اس کے صفاتی خصوصیات وہ سب اس کی ذات کی شناسائی سے متعلق تھے اور یہاں پہ صرف مغالطہ اس امر کا ہے وہ راز سربستہ جو حقیقت ہیں وہ صرف ذاتِ خداوندی کے خلق کرنے کا خاصّہ ہے۔ کہ تمام عناصر کو جمع کر کے ایک ہی طور پہ مخلوق گردانا اور اس موجودات کا تعین کو بے حساب موجودات میں ظاہر کیا اور بے شمار ہستیاں اس گُر سے ناواقف ہیں اور صرف یہ خیال ہی خیال ہے جس کا کوئی اصلا نہیں ہے۔ حالاں کہ یہ ظہور نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جو ایک واحد ہستی اور اس کے مراتب جو "ہو جا" کے پابند ہیں۔ تو پھر یہ آواز اور موجود کا ایک چناں چہ

خارج از وجود ہے۔ اور اس طرح ان کا اخراج جیسا کہ حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں اس طرح اظہار میں لائے۔
سو طرح سے یہ خیال آتا ہے کہ ہے عقل خود بے خبر ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا ایک خیال ہے، جو اندرونی طور پر ظاہر ہے۔ کائنات کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ یہ صرف خیال ہی خیال ہے لیکن اس عالمِ خیال کے اندر ایک حقیقت چھپی ہوی ہے اور اہلِ نظر کے خیال میں جو اون کے جانچنے کی حد ہے وہ ایک چیز کا ہونا جائز قرار دیے ہیں اور دیگر موجودات سے متعلق اور کوئی مفہوم ہمدست نہیں ہوتا ہے اور یہ کائنات جو ایک صفاتی اعتبارات میں معرض وجود میں موجود ہے وہ صرف ذات اور صفات کا اجتماعی ظہور ہے اور اس سے ہٹ کر اور کوئی بات بعید از عقل ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان کو بات کرنے والا حیوان کہا جاتا ہے اور حیوان کو ایک محسوس کرنے والا جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے اور اس تخلیق کے جواہر کو تین دور دو راجزاء کے مرکب سے موجود کیا جانا اور یہ موضوع کا ہونا نہیں کے برابر اور اس ذات کا وجود منجانب اللہ ہے اور الحاصل ان تحدیدات میں وجود جو کہ اپنے تئیں اور جن کو اس تذکرہ سے ظاہر کیا ہے اس طرح بین بین خفیہ انداز میں کہا کہ یہ وجود جو کہ یہ وجود بھی منجانب ایک ہستئ مطلق کا پیش خیمہ ہے کہ ان کو بھی اپنے وجود اور منشاء سے قائم المرام و وجود کا ایک کا مظہر ہے اس مقام پر اور دیگر تفصیلات کو رسالہ میں درج کرنے کے لیے اور کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جیسا کہ اس کے لیے شروح فص شیثیی و نقد المنصوص و اشعۃ اللمعات و شروحِ رباعیاتِ جامی اور پھر اس سے متعلق اور دیگر جو ما حصل ہیں اور اس سے جو ربط وجودات خاصّہ ہیں اور ایسے ہی "ہے کوئی اللہ کی مثال والا" جو اللہ جل شانہٗ کی بلند مثالی سے متعلق اور جو بھی اذہان جو اس کے ہر اعتبار میں ایک نیاپن لے کر موجود ہونے والا جو افراد یا اسی طرح اس کا وجود بالموجود ہو یا پھر آواز جو ایک مادّے میں موجود ہو جو شرح فص مشبیہ میں ظاہر کیا گیا اور صاحب التحقیق الجامع بین الفرق والجمع مراۃ الکثریٰ الواقعۃ فی العالم موجودہ فی الواحد الحقیقی اذا ہو الوجود الحق المطلق کو الفطرت فی البحر والشمر فی الشجر والشجر فی النواۃ کما یعلم ان مدلول الانیما ولاہیّہ وان اختلف حقایقہا و کثرت انہا تکرار لان المفتوحہ مع اسمہا تاکیدًا وخبر باعین واحدہ فہذہ الکثرۃ الوجودیہ الحلیقۃ الاسمایتہ کثرۃ شہو فی عین واحدہ کما ان الہیوایہ توخذ فی حد کل صورۃ وای مع کثرۃ شہواہ فی عین واحدلہ العین وھو الوجود المطلق کذالک کثرۃ شہودہ فی عین واحدۃ بہی الحیولیٰ فمن عرف نفسہ بہذ العرفۃ ای عرفنا مثل ھذہ العرفۃ عینا واحدۃ ذات کثرۃ مفعولہ وکثرۃ شہودہ فی عین واحدۃ فقد عرف ربہٗ کذالک فانہٗ تعالیٰ علی صورۃ متعلقہ کما جاء فی الحدیث الصحیح

ان اللہ خلق آدم علی صوتہ بل ہو عین ہویتہ التی اختفت فیہ حقیقتہ التی تسترت
بہ ولہذا ای لکون معرفتہ النفس ماذکرناہ وہی لایحصل الابکشف والذوق ماعثرای بما اطلع احد من
العلماء علی معرفتہ النفس وحقیقتہا الا الالہیون من الرسل والصوفیہ اذا لایحمل عطایا الملک الا مطایا الملک! انتہی پھر جاننا
چاہیے کہ آصف بن برخیا درعرش بلقیس جو کچھ کہ صرفہ میں آیا اور وہ علم کا کمال تھا جو علم اس جدید تخلیق میں ہے۔ چناں چہ
صاحبِ نقد النصوص جو فیض سلیمانی میں ہے۔ اس طرح فرماتے ہیں: اس بات کا علم بے شک آصف بن برخیا اور
پورے علم کے ساتھ عالم الکون والفساد الہیہ اور ملکوت قوت جو بلقیس کے عرش سے جس کی صورت اللہ کے حکم سے ہے
اور ساتھ ساتھ اس کی تائید غیبی یہ تصرف صرف عالم الکون والفساد اور پھر الہامیہ اور قوت جو ملکوتی ہے اور صورتِ
مادیہ جو تجدید سلیمانی کے نزدیک اور اس کی نقل اس کے حرکات سے ہے اور اس کو مائل بجانب مرتبہ کیا گیا۔ ناظرین کے
نزدیک یہ محال ہے کہ یہ ایک زمانہ سے متعلق ہے اور اس کی حرکت صرف دیکھنے سے اور اس کا اس آیت سے جو دیکھنے سے
ہے اور قوت بصارت کا اس میں دخل ہے۔ جو وقت واحد میں جو حکم الٰہی اور ہرگز بلقیس کا سلیمانؑ کے نزدیک جو اس
تعلق کا مکان سے امکان تک ہو سکے اور سلیمانؑ پر اس کا انکشاف بھی نہیں ہوا اور پھر اس کے مکان تک البتہ اللہ
کا کہنا ہے ماالیس کیا تم نے نہیں دیکھا استقرار سے ہے جو تمہارے قبضۂ امکان میں بے شک ہمارے عطا کئے
ہوئے تصرف سے ہے اور یہ تصرف عالم الابد سے جو قدرت الہیہ کی جانب سے سرفراز ہوا اور تمہارے مراتب کا خاص موقف
ثابت ہوا۔ یہ اللہ جل شانہٗ کی خصوصیت ہے کہ جس کو چاہا اس انداز سے سرفراز فرمایا اور اس کی عبارت سے نوازا۔ اگر
عالم قدرت سے یہ معاملہ اور اس کے نزدیک قدر ہے اور پھر وہ مالک ہے مگر کرم اسی کا ہے اور اسی طرح سلیمانؑ پر بھی
کرم فرمایا اور جو حیثیت اللہ کے نزدیک۔ اور اللہ ہی کے لیے موہوب ہے اور بعض اصحاب اس عطاءِ خاص سے
جو بڑے تصرف کے لیے سرفراز فرمایا جاتا ہے اور یہ عام کا کمال ہے اور ہر دم ایک نئی تخلیق ہو۔ پس اس میں اللہ کا
فضل شامل ہے اور نفسِ رحمانی کا دخل ہے۔ اس کے ہمیشہ کا وطیرہ رہا ہے۔ جو کون ومکاں میں پانی کے بہاؤ کی طرح
رواں دواں نہر کے ذریعہ اور اس میں تجدد کا بلن جو ہمیشہ جاری وساری ہے۔ جو ظاہری صورتیں اس طرح سے
وجودِ الہیہ کا تعیُّن کردہ ہے اور اس کا ثبوت علم ہے جو قدیم ہے اور تجدد کبھی ملاپ سے ہٹ کر نہیں ہے جو ہمیشہ ہمیشہ
جاری وساری ہے اور اس انداز سے بھی کہ تعیُّن اول وجود الہیہ کے حکم سے بعض مواقع پر اتصال کے اعتبارات میں
جو موقع پر واقع ہوتا ہے اور وہ موخر ہوتا ہے اور وہ اس طرح سے کہ وہ عام کا ظہور ہوتا ہے اور پھر وہ عین العلی جو عام کا ظہور

ہوتا ہوتا ہے۔ اس کے قائم ہونے کا مقام جیسا کہ اس موقعہ پر آصف نے کہا ہے۔

اس طرف قبل اس کے کہ اس مقام پر میں قیام کیا دیکھا کہ اس میں صرف نفس کا تصرف ہوا اور آصف پر جو جن کا فضل ہوا وہ یہ ہے کہ میں پیشتر ہی اس مقام پر آگیا جہاں وہ بود و باش اختیار کیا ہوا تھا اور یہ مقام تعیشات سے بھرپور آصف اس عمل میں آزمودہ کار تھا اور اس طور پر کہ جنّی تصرف کرتا اور عرش کے بیچ قدم رکھ کر اور پھر دراز کا بنایا ہوا۔ پس کام پر آگیا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے نزدیک جیسا کہ ملان کا قول اس طرح سے ہے جیسے اللہ جل شانہٗ کا قول ہے اور جو بھی چیز مطلوب تھی وہ وہاں پر موجود تھی۔ پس اس طرح جو بھی مکمل ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر زمانے میں اشیاء موجود پائے گئے۔ لیکن یہ سب اللہ جل شانہٗ عین جسدِ انسانی کے اعضاء و جوارح اور نسوں میں اس طرح سے بسا ہوا ہے اور اسی انسیت کے سبب وہ اکملیت کے ساتھ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وزیر اکسایا۔

سوائے بزرگانِ دین کی صحبت کے اکملیت ممکن نہیں　　اللہ کے مقبول بندگان کا تقرب حاصل کر

لکڑی جب تک صحبت تامہ حاصل نہ کرے　　اور جب تک خدا کا قرین نہ ہو زندگی نا ممکن

اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے دور کے قطب تھے اور تصرفات پر حاوی اور اللہ کے نائب اور عادات و خوارق جیسا کہ اقطاب و خلفاء سے صادر ہوا کرتے ہیں اور وہ وزیر کہ جو اقطاب کی ودیعت تامہ اس طرح سے ہر وہ شئے جس کا استعمال ضروری ہوتا ہے وہ کیا جاتا ہے۔ صاحب نقدالنصوص فی نقش الفصوص مذکور میں اس طرح لکھتا ہے کہ حضرت ہر چیز پر معجزات کے ذریعہ قابض تھے اور ہر عمل میں کرامت ظاہر ہوا کرتی تھی لیکن وہ اپنے کردار میں مضبوط تھے۔ حسبِ عطا جس طرح سرکار مدینہؐ معجزۂ شق القمر پر قادر تھے اسی طرح جس کا جو حال ہوتا تھا دوائی بھی اسی طرح دی جاتی تھی اور جس کوزہ میں دوا دیا جاتا اسی طرح دی جاتی تھی اور جن اندازوں سے بھی بڑھ کر اولیاء اور انبیاء مظہر ذات ہوتے ہیں اور وہ جو کرتے ہیں اصل میں اللہ جل شانہٗ کرتا ہے۔ حالاں کہ قلم لکھنے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن وہ مختار نہیں ہوتا۔ پس انسان سے جو بھی کرامات اور معجزات ظاہر ہوتے ہیں اور بسا اوقات اللہ جل شانہٗ انسان کو ایسے اختیارات دیتا ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے ایسی گفتگو فی الحیثیت کفر کے مترادف ہے۔

ہر دل کے پاس اس کی اپنی نوعیت سے ایک کرامت کا قادر ہے ؛ اگرچہ کہ ہر ایک کا جوہر اس کی اپنی شناسائی کے اعتبارات اس کی اپنی سرشت کے اعتبارات میں عطا کئے گئے۔ آدم علیہ السلام کے وجود اور ان کے اپنے رتبے کے اعتبارات اور ہیں اور موسیٰؑ اور مریمؑ کے موجودات کا موقف علیحدہ علیحدہ ہے اور ہر ایک اپنے اعتبار میں اللہ جل شانہٗ کی قدرت اور

اس کی عظمت کا اظہار کیا ہے ۔ ہر ایک کو شانِ کریمی کے صفات کا ماحصل ہے ۔ ہر ایک اپنے اعتبار میں وجود بالذات کے منشاء اور مزاج سے اس کائنات میں موجود ہوا ۔ اس کائنات کا ظہور اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ہر اک ایک دوسرے سے منفرد پیدا ہوا ہے

مولف نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عین واحد ہے یعنی وجود حق اور اس کی ہستی مطلق اسی طرح کتنے ہزار طور پر ظاہر ہوے اور صفاتِ کاملہ بعد ظہور معدوم ہو جاتے ہیں اور اس تمثیل پر کہ نام نامی اسم گرامی کا منشاء صرف تخلیقِ عالم ہے کہ اس سے صرف ایک ہی احدیت ثابت ہوتی ہے اور موجود و قائم بالذات ہے اور اس تیزی سے احساس کے سبب اگر ایسا نہ ہو تو پھر زمانہ کے اعتبارات میں تعیّن اور مکانیت کے اعتبار میں غائب پایا جائے گا اور اس کی مثال ایسی ہے کہ مشرق میں معدوم اور زمانہ کی روح کے اعتبارات میں مغرب میں بھی موجود اور یہی اس کے ذات وصفات کا خاصّہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور شمال وجنوب ہر اسمات میں افق پر ظاہر نظر آتا ہے ۔ اسی طور کہ خدا کی حد میں لامتناہی ہیں ۔ اور اسی طور صفات ممکنہ ایک تصویر کش اور بہر صورت اور صفت کہ مشرق میں بھی موجود اور اگر یہ چاہے کہ مغرب میں بھی موجود ہوے اور مغرب میں غائب ہو جاے ۔ اور اس طرح کہ اس کے نور کا عکس اگرچہ کہ اس جہت میں وہ پوشیدہ ہے چنانچہ دریا ہی کو لیجیے مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب ان اسمات میں موجزن ہے اور اس کا اس طرح سے رُخ کرنا دریا کے وجود کا ثبوت ہے ۔ اس وجہ سے کہ دریا ہمیشہ بہاؤ کے سبب موجود اور قائم ہے ۔ خدا کا نور ہر وقت قائم ودائم تجلّی ہے اور اس کا انعکاس اس طرح قائم ودائم ہے ۔ جس کا احساس ہی خدا کا ہر ہے اور اس کا وجود عین توحید ہے ۔ ان ہی جہاتِ مقدسہ کے سبب خدا انتہا ہے

• حضرت صفیہ کا بقیہ ۱۲۹ سے آگے

ان سوالات کی وضاحت فرمائی تھیں ۔ لوگوں کو معلومات فراہم کرتی رہیں ۔ اللہ اور اللہ کے رسول ؐ کی رضا جوئی اور دین اسلام کی خدمت میں زندگی گزارتی رہیں ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دَورِ خلافت میں آپؓ کا سالانہ وظیفہ بارہ ہزار درہم مقرر فرمایا اور اتنی ہی رقم دوسری ازواجِ مطہراتؓ کی مقرر تھی ۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ حکومت تھا ۔ ۵۰ھ ہجری اس وقت حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر ۶۰ یا ۶۱ سال کی تھی ۔ آپؓ کی وفات ہوی اور مدینہ کے قبرستان جنت البقیع میں راحت فزا ہیں ۔

سولھویں　　قسط 16

تصنیفِ لطیف ماہرِ علومِ دین طریقت واقفِ رموز معرفت وحقیقت، حافظِ قرآن مجذوبِ مجذوب حضرت شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز للمتوفی ۱۲۸۹ھ

لوادر الدقائق	ترجمہ	جواہر الحقائق

ترجمہ و تشریح

حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید افسر پاشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی ۔ شفاء ڈسپنسری ۔ ویلور

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

حمد تیری اے خدائے لم یزل　　ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل

نام تیرا میرے دل کی ہے دوا　　ذکر تیرا روح کی میری شفا

جب زباں پر محمدؐ کا نام آگیا　　دوستو زندگی کا پیام آگیا

آپؐ کی مدح انساں کیا کر سکے　　عرش سے جب درود و سلام آگیا

ہر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیے جو ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے اور ہزاروں ہزار بار درود و سلام اس دربارِ گہربار، خلاصۂ کائنات فخرِ موجودات، محسنِ اعظم، فخرِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن کی بدولت وطفیل اسلام کا بول بالا ہوا اور شرک وضلالت، کفر وجہالت کا منہ کالا ہوا۔

الحمدللہ! زیرِ نظر کتاب "نوادر الدقائق" ترجمۂ "جواہر الحقائق" کی یہ سولہویں قسط ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جو کتاب "جواہر الحقائق" کے فائدہ نمبر چھ (۶) کے بقیہ حصہ کا ترجمہ ہے۔

اس ترجمہ کے تعلق سے عرض ہے کہ اس کے اندر اتنی رعایت اور کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی اور با محاورہ ہو اور جہاں عبارت دقیق اور مشکل ہوتی ہے وہاں عبارت کا خلاصہ یا حاصلی ترجمہ کر دیا ہے۔ پھر بھی بعض مشکل اور ادق الفاظ کے افہام و تفہیم میں دشواری محسوس ہونے پر حتی الوسع تو سین کے اندر اس کی تسہیل کر دی ہے جو راقم الحروف مترجم کی طرف سے ایک خفیف اضافہ اور فائدہ ہے اور جہاں "تشریح" کا مستقل عنوان ہے وہاں مترجم کی جانب سے مزید افہام و تفہیم کی ایک ادنیٰ تشریح اور کوشش سمجھیں۔

زیرِ نظر کتاب "نوادر الدقائق" ترجمۂ "جواہر الحقائق" کی یہ سولھویں قسط الحمدللہ! درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے:

۱	نفوسِ ارضیہ و سماویہ۔	۲	نفسِ معدنی۔
۳	نفسِ نباتی۔	۴	نفسِ حیوانی۔
۵	قویٰ حیوانی۔	۶	ظاہری حواسِ خمسہ۔
۷	باطنی حواس خمسہ۔	۸	قوائے مُدرِکہ۔
۹	قوائے محرّکہ۔	۱۰	نفسِ انسانی اور نفسِ ناطقۂ انسانی۔
۱۱	تشریحِ مترجم۔	۱۲	قوتِ نظری۔ قوتِ عملی۔
۱۳	تشریحِ مترجم۔	۱۴	تشریحِ مترجم۔
۱۵	نفسِ انسانِ کامل۔	۱۶	خلاصۂ کلام۔

زیرِ نظر کتاب نوادر الدقائق کی یہ سولہویں قسط جو دراصل "جواہر الحقائق" کے ترجمہ پر مشتمل ہے، اس کی پندرھویں قسط میں نفوس کے اقسام پر سیر حاصل بحث چل رہی تھی کہ ان کی پانچ قسمیں ہیں اور پھر ان پانچوں قسموں کی تفصیل بتاتے ہوئے حضرت قطبِ ویلور قدس سرہٗ نے فرمایا کہ

نفوسِ ارضیہ و سماویہ (نفوسِ سماویہ و ارضیہ کی تحقیق و تفصیل تو آپ نے ابھی سنی اب آگے سنیئے۔)

واضح ہو کہ نفوسِ ارضیہ کسی دن مرکبات میں جب کہ باپوں کے یعنے مذکر فلکیات اثرانداز اور کارگر ثابت ہوتے ہیں اور مادری عناصر یعنے اثر قبول کرنے کے لائق ہوتے ہیں تو (ایسی حالت میں) نر عنصر مادہ عنصر کے اطراف گھومنے لگتا ہے۔ تو جس طرح یہ عناصر آپس میں گھومتے ہیں اسی طرح یہ افلاک (آسمانیں) بھی عناصر کے اطراف گھومتے ہیں۔ پھر جب عناصر آسمانوں (افلاک) کی ان

حرکتوں گردشوں اور نزدیکیوں نیز ستاروں کی خصوصیتوں کی وجہ مختلف وضع قطع اختیار کرتے ہیں تو ان ہی عناصر کے امتزاج اور ملنے سے دُنیا میں ایک نئی کائنات کا وجود عمل میں آتا ہے۔

نفسِ معدنی جب نفسِ کل جوش مارتا ہے اور اس میں ہیجانی کیفیت و جوش بیداری پیدا ہوتی ہے تو وہ اس زمین و آسمان کے درمیان بہترین کائنات میں کسی خاص دن چھپ کر ایک جدید فیض (نیا فیض) بہم پہنچاتی ہے۔ اس فیضِ جدید کا حکم عنصری خواص سے عناصر اجزاء کا انسلاخ ہے یعنی اس کے خواص کا (اجزا کے مخصوص عناصر) کا سہارا پکڑنا فائضہ کی صورت میں اور تمام چھوٹے اجزا کا اکٹھا کرنا ایک ہی فیض اور ایک ہی حکم ہے اس فیض جدید کا نام نفسِ معدنی ہے۔

پھر اس (نفسِ معدنی) کے کہتے ہیں دو خادم ہوتے ہیں۔ (۱) ایک خفّت (۲) دوسرا ثقل۔

نفسِ نباتی اور جب معدنی نفوس اپنی پوری طاقت سے ظاہر ہوتے ہیں تو نفسِ کل پھر جوش مارنے لگتا ہے اور بہترین معدنی صورتوں میں سے کسی خاص شکل کے ساتھ مل کر شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب وہ ایک جدید (نیا) فیض پہنچاتا ہے۔ اس فیض جدید کا حکم معدنی جسم میں "جذب عناصر" (یعنے عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتا کھینچ لینا ہے۔) اور تغذیہ اور تنمیہ (یعنی غذا پہنچانے اور جسم کو بڑھانے اور افزائش کرنے میں) تصرف کرنا ہے۔ اس اعتدال کے ساتھ کہ ان کے نصیب میں ہے۔ (جو مقدّرات و مصلحتِ خداوندی ہے) اس کے مطابق پوری مصلحت اور برابری کی تقسیم عمل میں آسے۔ اس فیض جدید کا نام نفسِ نباتی ہے۔

اور نفسِ معدنی اپنے دونوں خادموں (خفت اور ثقل) کے ساتھ نفس نباتی کا بھی خادم یعنی خدمت گار ہے۔

اور ایسے ہی اس نفسِ نباتی کو علاوہ ان خداموں کے مزید آٹھ (۸) خدام (خدمت گار) اور بھی ہیں۔ چناں چہ (۱) غاذیہ (غذا پہنچانے والے خادم (۲) نامیہ (بڑھوتری یعنے بڑھانے والے خادم) یہ دونوں خادم شخصی بقاء کے واسطے ہیں۔ اور (۳) مُولّدہ (پیدا کرنے والے اور مصوّرہ (نقش و تصویر بنانے والے) یہ دو نوع قسم و نوع (یعنے مذکر، مؤنث اور شکل و صورت کی پہچان) کے لیے ہیں۔

غرض یہ چاروں قوتیں اور صفتیں (جسم انسان کے اندر) مخدومہ کی حیثیت رکھتی ہیں (اور باقی) چار قوتیں یعنی (۵) جاذبہ (غذا اور پروٹین کو جسم کے متناسب الاعضاء حصوں اور مقامات میں پہنچا کر جذب کرنے والی قوت) اور (۶) ماسکہ (غذا اور اس سے بننے والے مادہ کو جسم کے اندر روکنے والی قوت) اور (۷) ہاضمہ (غذا کو ہضم کرنے والی قوت) اور (۸) دافعۂ ثقل (یعنے ثقیل و غلیظ اشیاء اور مادّوں کو جیسے بول و براز، بلغم اور پسینہ وغیرہ کو باہر نکالنے والی قوت) یہ چاروں قوتیں (جسم انسان کے اندر) خادمہ کی

حیثیت رکھتی ہیں۔

نفسِ حیوانی اور جب نفوس نباتیہ یعنے نباتی نفوس کثرت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں تو (ایسی صورت ہیں) نفسِ کل پھر جوش میں آتا ہے اور غلبہ پاتا ہے اور اس میں ابال آتا ہے تو وہ بہترین نباتی صورتوں اور شکلوں میں ایک خاص شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس سے ایک جدید فیض (نیا فیض) پہنچتا ہے اور اس فیضِ جدید کے اثرات (یہی) ارادی حس و حرکات ہیں اور اس فیض جدید کا نام نفسِ حیوانی ہے۔ پھر اس حیوانی نفس کے لیے نفس نباتی اپنے خدام کے ساتھ خادم ہے۔ (یعنے نباتی نفس اپنے خادموں کے ساتھ مل کر حیوانی نفس کے حق میں خادم ہے۔)

قوائے حیوانی و نیز اس حیوانی نفس کو ان خداموں کے سوا بھی مزید دوسرے چودہ (۱۴) خدام اور بھی ہیں (اور وہ ہیں) (۱) خوف یعنے (ڈر) (۲) غضب یعنے (غصّہ) اور ان دونوں قوتوں کو قوائے حیوانیہ کہتے ہیں۔

ظاہری حواس خمسہ اور (۳) سمع (سننے کی قوت) اور (۴) بصر (دیکھنے کی قوت) اور (۵) شمّ (سونگھنے کی قوت) اور (۶) ذوق (چکھنے کی قوت) اور (۷) لمس (چھونے کی قوت) ان پانچوں حسّیات کا نام حواس خمسۂ ظاہری ہے

باطنی حواس خمسہ اور (۸) حسّ مشترک (ایسی حسّ جو دوسروں میں بھی شامل ہوسکے) اور (۹) خیال اور (۱۰) مُتصرفہ (یعنے قبضہ کرنے اور تصرف میں لانے کی قوت) اور (۱۱) وہم اور (۱۲) حافظہ یہ سب قوتیں حواسِ خمسۂ باطنی کہلاتی ہیں۔

قوائے مُدرکہ پھر ان دونوں قسموں یعنے حواس خمسۂ ظاہری اور حواس خمسۂ باطنی کو قوائے مدرکہ (یعنے سمجھنے والی قوت) بھی کہتے ہیں۔

قوائے مُحرکہ اور (۱۳) باعثہ (یعنی کسی سبب اور وجہ سے اچانک پیدا ہونے والی قوت) اور (۱۴) فاعلہ (کام کرنے والی قوت) ان دونوں کا نام قوائے محرکہ بھی ہے (یعنے ہلانے اور حرکت میں لانے والی قوت ہے۔)

اور قوائے مُدرکہ اور قوائے محرکہ کا دوسرا نام قوائے نفسانیہ بھی ہے۔ (نیز نفوسِ ملکیہ یعنے فرشتوں کے انفاس اور نفوسِ جنّیہ یعنے جنوں کے انفاس بھی ہیں۔ جن کی تفصیل الگ سے ہے۔)

نفسِ انسانی اور نفسِ ناطقۂ انسانی اور جب نفوسِ حیوانی (اپنے اندر) کثرت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں تو نفسِ کُل ایکبارگی پھر جوش مارتا اور اُبلنے لگتا ہے۔ (اور جس کے نتیجہ میں) بہترین حیوانی شکلیں صورتیں ظاہر ہوتی ہیں اس کے بعد (اس سے) جدید فیض (نیا فیض) پہنچتا ہے۔ اس فیض کا جدید اثر یہ ہے کہ (اس سے) عقل، دل، نفس (روح) اور تمام

حیثیت رکھتی ہیں۔

نفسِ حیوانی اور جب نفوس نباتیہ یعنے نباتی نفوس کثرت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں تو (ایسی صورت ہیں) نفسِ کل پھر جوش ہیں آتا ہے اور غلبہ پاتا ہے اور اس ہیں ابال آتا ہے تو وہ بہترین نباتی صورتوں اور شکلوں ہیں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سے ایک جدید فیض (نیا فیض) پہنچتا ہے اور اس فیضِ جدید کے اثرات (یہی) ارادی حِس و حرکات ہیں اور اس فیض جدید کا نام نفسِ حیوانی ہے۔ پھر اس حیوانی نفس کے لیے نفس نباتی اپنے خدام کے ساتھ خادم ہے۔ (یعنے نباتی نفس اپنے خادموں کے ساتھ مل کر حیوانی نفس کے حق ہیں خادم ہے۔)

قوائے حیوانی و نیز اس حیوانی نفس کو ان خادموں کے سوا بھی مزید دوسرے چودہ (۱۴) خدام اور بھی ہیں۔ (اور وہ ہیں) (۱) خوف یعنے (ڈر) (۲) غضب یعنے (غصّہ) اور ان دونوں قوتوں کو قوائے حیوانیہ کہتے ہیں۔

ظاہری حواس خمسہ اور (۳) سمع (سننے کی قوت) اور (۴) بصر (دیکھنے کی قوت) اور (۵) شمّ (سونگھنے کی قوت) اور (۶) ذوق (چکھنے کی قوت) اور (۷) لمس (چھونے کی قوت) ان پانچوں حسّیات کا نام حواس خمسۂ ظاہری ہے۔

باطنی حواس خمسہ اور (۸) حِسِّ مشترک (ایسی حِس جو دوسروں ہیں بھی شامل ہوسکے) اور (۹) خیال اور (۱۰) مُتصرفہ (یعنے قبضہ کرنے اور تصرف ہیں لانے کی قوت) اور (۱۱) وہم اور (۱۲) حافظہ یہ سب قوتیں حواسِ خمسۂ باطنی کہلاتی ہیں۔

قوائے مُدرکہ پھر ان دونوں قسموں یعنے حواس خمسۂ ظاہری اور حواس خمسۂ باطنی کو قوائے مدرکہ (یعنے سمجھنے والی قوت) بھی کہتے ہیں۔

قوائے مُحرکہ اور (۱۳) باعثہ (یعنی کسی سبب اور وجہ سے اچانک پیدا ہونے والی قوت) اور (۱۴) فاعلہ (کام کرنے والی قوت) ان دونوں کا نام قوائے محرکہ بھی ہے (یعنے ہلانے اور حرکت ہیں لانے والی قوت ہے۔)

اور قوائے مُدرکہ اور قوائے محرکہ کا دوسرا نام قوائے نفسانیہ بھی ہے۔ (نیز نفوسِ ملکیہ یعنے فرشتوں کے انفاس اور نفوسِ جنّیہ یعنے جنّوں کے انفاس بھی ہیں۔ جن کی تفصیل الگ سے ہے۔)

نفسِ انسانی اور نفسِ ناطقۂ انسانی اور جب نفوسِ حیوانی (اپنے اندر) کثرت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں تو نفسِ کُل یکبارگی پھر جوش مارتا اور اُبلنے لگتا ہے۔ (اور جس کے نتیجہ ہیں) بہترین حیوانی شکلیں صورتیں ظاہر ہوتی ہیں اس کے بعد (اس سے) جدید فیض (نیا فیض) پہنچتا ہے۔ اس فیض کا جدید اثر یہ ہے کہ (اس سے) عقل، دل، نفس (روح اور تمام

لطائف خمسہ اور خیالات وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں اور واقع ہوتے ہیں اور وہ تمام دوسری کیفیات وحالات کا وقوع وظہور بھی ہے۔ جو ان میں ہر ایک کے ساتھ خاص ہے اور اس فیضِ جدید کا نام (اصطلاح میں) انسانی نفس اور نفسِ ناطقۂ انسانی بھی ہے۔

تشریحِ مترجم

نفسِ انسانی اور نفسِ ناطقۂ انسانی کا دوسرا نام قلب بھی ہے جو درحقیقت روحِ انسانی ہے۔ جس کی تشریح وتحقیق ایک مشکل اور ادق مسئلہ ہے۔ عقل ونقل والوں نے اس باب میں اپنا اپنا اختلاف پیش کیا ہے جو آخر تک وہ اس کا صحیح حل نکتہ کے یافت ودریافت سے عاجز ہیں قاصر ہیں بسرورِ انبیاء سرکار مدینہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم کی زبان رسالت مآب سے بحکم الٰہی: قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً کا ارشادِ گرامی ہی سننے میں آیا اور بس۔ مزید تحقیق وجستجو سے باز آجانے ہی کی تاکید ہے کہ:۔

من العلم قلیلاً کو بھی دیکھو بعد اتیتم
نہ مانو گے تو اک دن بھاؤ بھاؤ گے جو تی تم

اور بزبان حال ؎

بہ طبعم ہیچ مضمون بزلب بستن نمی آید
خموشی معنئی دارد کہ در گفتن نمی آید

کا سبق ہی دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جو جس قدر اہم، قوی اور طاقتور ہوگا، اسی قدر وہ لطیف، والطف بھی ہوگا۔ چناں چہ مثال کے طور پر دیکھیے کہ مٹی کا تودہ ایک ثقیل وکثیف چیز ہے اور اس کی کثافت وثقالت کا اندازہ اس سے لگائیے! اگر اس کو سفید کپڑے میں ڈال دو، پھر کپڑا جھٹک دو تو وہ کپڑے پر اپنا سرخی مائل نشان لگا دے گا اور دھبہ رہ جائے گا۔

اب اس سے بھی زیادہ طاقت ور اور قوی چیز لوہا ہے۔ یہ اتنا قوی ہے کہ اس کی ایک چھوٹی سی کدال بھی منوں، ٹنوں وزنی چٹانوں اور طاقتور پہاڑوں کے پرزے پرزے اور ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ بنا کر اڑا دیتی ہے۔ لوہے کے ان ریزوں کو اگر کسی سفید کپڑے پر ڈال دو پھر جھٹک دو تو دیکھیں گے کہ اس میں اتنی گرد وغبار نہیں جمے گا جتنا مٹی میں جمتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ لوہا درحقیقت مٹی کی بہ نسبت لطیف وطاقتور ہے۔

اس کے بعد اس سے زیادہ قوی اور لطیف چیز آگ ہے اور دیکھو آگ جب جلائی جائے اور اس کے شعلوں میں ہاتھ کو آر پار کیا جائے تو گو اس سے تپش تو محسوس ہوگی مگر اس کا اثر محسوس نہ ہوگا۔ یہ اس کی لطافت اور باریکی کی علامت ہے۔ یہ لوہا اور فولاد جیسی سخت چیز کو بھی پگھلا کر پانی پانی کر دیتی ہے اور اس سخت فولاد کو جس سانچے میں چاہے ڈھال دیتی ہے۔

اب آگے اس سے بھی زیادہ قوی اور لطیف چیز اور بھی ہے اور وہ ہے پانی اور یہ اتنا رقیق اور پتلا ہے کہ کپڑے پر پڑ جائے

تو اس کو گیلا کر دے بھگو دے۔ اپنی تاثیر کی وجہ سے مگر اس کی موٹائی اور حجم بظاہر معلوم نہیں ہوتا، صرف اس کی تراوٹ اور گیلے پن نے یہ بتلا دیا کہ مجھے پانی چھولیا ہے۔ پانی پر ہاتھ مارو یا چھڑی مارو تو فوری جدا بھی ہو جاتا ہے اور جس طاقت سے جدا ہوا اسی طاقت اور زور سے جم بھی جاتا ہے۔ یہ اس کی لطافت تھی۔ مگر طاقت کا یہ عالم ہے کہ آگ جیسی طاقت پر وہ غالب ہے اور وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مان پڑجاتی ہے۔ جب کہ اس کی ایک چنگاری پورے گھر، گلی اور محلے کو جلا کر راکھ کر دے اور خاک بنادے اور جب اس آگ پر پانی ڈال دو تو وہ: ع "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آے" کہتے ہوے ایک دم سے ٹھنڈی پڑجاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگ کی طاقت پانی کے سامنے نہیں چلتی ہے۔ کیوں کہ پانی آگ سے بھی زیادہ طاقتور اور لطیف شئے ہے۔

اسی سے بجلی بنتی ہے۔ برقی پاور تیار ہوتا ہے۔ کرنٹ بنتا ہے تو اسی پانی کے زور افتاد سے ہے۔ غور کرو کہ ایک معمولی ہلکا سا باریک بال جیسا بجلی کا تار کتنا پاور اور طاقت رکھتا ہے کہ سوئچ آن کرنے بٹن دبانے سے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور منوں ٹنوں وزنی چیز کو آنِ واحد میں اِدھر سے اُدھر پہنچا دیتا ہے اور بڑی آسانی سے پار کرا دیتا ہے۔ جیسے لفٹ ہے، کرین ہے اور بھی دیگر آلات ہیں۔

اب آگے اس پانی سے بھی زیادہ لطیف اور قوی تر طاقت اور بھی ہے اور وہ ہے "ہوا"۔ ہوا جب آتی ہے تو دریاؤں کو اِدھر اُدھر لے جاتی ہے۔ پانی جیسا طاقتور پاور ہوا کے سامنے کچھ کام نہیں دیتا بلکہ وہ عاجز ہو کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"، کی طرح جس طرف ہوا لے بھاگے پانی چپ سادھتا اس طرف بھاگتا ہے۔ جیسا کہ حال میں "سنامی" نامی طوفان کا حال ساری دنیا نے دیکھا اور سُنا۔ غرض یہ ہوا کی طاقت تھی جو آگ جیسی خطرناک طاقت پر بھاری ہے اور سبقت لے جاتی ہے۔

اور یہ ایک ایسی لطیف شئے ہے جو دیکھنے میں تو نہیں آتی البتہ محسوس ضرور ہوتی ہے کہ جب ہوا چلتی یا پنکھا جھیلا جاے تو وہ ہوا ہمارے اس بدن کو تو چھوتی ہے اور ٹھنڈک پہنچاتی ہے مگر وہ نظروں سے غائب ہے۔ محض اپنی لطافت کی وجہ سے۔ یہ تو ہوا کے لطیف ہونے کی بات تھی، جو پانی سے بھی زیادہ باریک اور لطیف ہے۔ پانی اپنی لطافت کے ساتھ کسی قدر کثافت بھی رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نظر بھی آتا ہے مگر ہوا نظروں سے غائب ہو کر بھی اپنی کیفیت و کمیت اور خاصیت کے اثرات ظاہر کرتی ہے کہ ہوا کی رفتار تیز ہے یا کم؟ زمین کے ذرات، خس و خاشاک، گرد و غبار کا اڑنا اور پانی کی لہروں کی بلندی و پستی کا ہونا یہ سب اسی ہوا کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

آگے اس سے بھی زیادہ قوی اور طاقت ور شئے اور بھی ہے اور وہ ہے روح۔ یہ روح اتنی لطیف بلکہ الطف شئے ہے جو ہوا کے مقابل میں کئی گنا وزنی طاقت ور اور بھاری ہے۔

غرض اس روح کے سلسلہ میں غور و خوض تفتیش و تحقیق تبئین یا تصدیق و تصویب سے ہمیں منع کیا گیا ہے اور سختی

اور سختی سے روکا گیا ہے۔ کیوں کہ روح ایک ایسی خاص چیز ہے، جسے اللہ نے اپنے علم میں الگ رکھا ہے لم یطلع علیہ احد من خلقہ یعنی اپنی مخلوق میں کسی کو بھی اس سے آگاہ نہیں کیا اور پردۂ راز ہی میں رکھنے دیا۔

ہاں! یہ اور بات ہے کہ روح کا وجود عقلاً بھی ثابت ہے اور نقلاً بھی۔ لیکن اختلاف اگر ہے تو اس کی کیفیت پر ہے۔ اور وہ بھی صاحبؒ العوارف" کے بقول "حُرِّمَ تفسیرہ وجُوِّزَ تاویلہ کے تحت اس تفسیر و تشریح حراف ہے اور تاویل البتہ جائز ہے۔

اس باب میں جہاں اور اختلافات ہیں، وہیں یہ بھی ایک اختلاف ہے کہ "روح" کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض؟ مادّی ہے یا مجرّد؟ بسیط ہے مرکب؟ اس قسم کے غامض اور بے ضرورت مسائل کے سمجھنے پر نہ نجات موقوف ہے اور نہ اس کی تحقیق و جستجو کا ہمیں حکم ہے اور یہ بحثیں حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے فرائضِ تبلیغ سے تعلق بھی نہیں رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفر آج تک خود "مادّہ" کی حقیقت پر مطلع نہ ہوسکے تو پھر روح کو کیا خاک سمجھ سکیں گے؟ جو بہر حال مادّہ سے کہیں زیادہ لطیف والطف ایسے خفی ہے اس کی اصل حقیقت ماہیت وکنہ تک پہنچنے کی پھر کیا امید کی جاسکتی ہے؟

انسان میں اس مادی جسم کے علاوہ بھی کوئی اور چیز موجود ہے جسے "روح" کہتے ہیں اور وہ عالم "امر" کی چیز ہے جو خدا کے حکم وارادے سے فائض ہوتی ہے اور روح کے علم و شعور کی صفتیں بتدریج کمال کو پہنچتی ہیں اور ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے بے حد تفاوت اور فرق مراتب ہے۔ حتیٰ کہ خدائے واحدہٗ لاشریک لہٗ کی ترتیب وحکم سے ایک روح ایسے بلند و بالا اور ارفع واعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں دوسری ارواح کی قطعاً اور ہرگز ہرگز رسائی نہیں ہو پاتی۔ جیسے روحِ محمدی صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پہنچی ہے۔

پھر روح کے تعلق سے مزید اختلاف یہ بھی ہے کہ "روح" اصل میں خلق ہے عدم خلق؟ یعنے مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اس کا صحیح حل اور ٹھیک جواب یہ ہے کہ روح جسم کے اعتبار سے مخلوق ہے۔ کیوں کہ روح یہ دراصل اللہ کے حکم سے ہے جب کہ اس نے اپنے علم و فضل سے اس کو الگ رکھا ہے۔ اب سوال روح کی تخلیق کا ہے کہ وہ مخلوق ہے یا نہیں؟ جواباً عرض ہے کہ اللہ تعالےٰ خود اپنے قول میں فرماتے ہیں:

من امرِ ربی جو دلیل ہے خلق روح کی۔ یعنے وہ حادث ہے۔ پیدا کی گئی ہے اللہ کی تخلیق اور علوم تکوینیہ سے۔

حدیث شریف میں آتا ہے "اوّل ماخلق اللہ روحی" یعنے سب سے پہلے اللہ تعالےٰ نے میری روح پیدا کی۔ اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ روح مخلوق ہے۔ نعوذ باللہ خالق نہیں ہے۔ حادث ہے قدیم نہیں ہے۔ اور حضرت ابو سعید خرّاز رحمۃ اللہ سے اس سلسلہ میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے یہ ارشاد فرمایا: کہ اگر "روح" مخلوق نہ ہوتی تو وہ الست بربکم کے جواب میں "بلیٰ" نہ کہتی اور ربوبیت کا اقرار نہ کرتی۔ یعنے عالمِ ارواح میں جب اللہ نے تمام ارواح سے یہ سوال کیا کہ:

الست بربکم: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے باتفاق جواب دیا "بلیٰ" بے شک آپ ہمارے رب ہیں، پالنہار ہیں، پروردگار ہیں۔ تو اس سے صاف ظاہر معلوم ہوا کہ روح مخلوق ہے۔

اب یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حدوث روح قبل البدن ہے یا بعد البدن؛ یعنی روح پہلے پیدا ہوئی یا جسم؟ اس کے جواب میں صاحب "عوارف" نے حضرت ابن عطا رحمۃ اللہ کے حوالے سے فرمایا ہے: خلق اللہ الارواح قبل الاجساد لقولہ تعالیٰ ولقد خلقنٰکم یعنی الارواح ثم صوّرناکم یعنی الاجساد (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے جسموں سے پہلے روحوں کو پیدا کیا۔ جیسا کہ خود ارشادِ خداوندی ہے اور بے شک ہم نے پیدا کیا تم کو یعنی ارواح کو پھر تمہاری صورتیں بنائیں یعنی بدن بنا ے۔)

اللہ تعالیٰ تمہاری تخلیق سے پہلے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اسباب وسامان فراہم کئے۔ پھر تمہارا مادّہ پیدا فرمایا پھر اس مادّہ کو ایسا دلکش جاذب نظر نقشہ اور حسین وجمیل صورت عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ پھر اس تصویرِ خاکی کو وہ روح وحقیقت مرحمت فرمائی جس کی بدولت تمہارے باپ آدم علیٰ نبینا رعلیہم الصلوٰۃ والسلام جن وجود باجود تمام افرادِ انسانی کے وجود پر اجمالاً مشتمل ومنحصر تھا: "خلیفۃ اللہ" اور مسجود ملائک بنے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ جسم سے دو ہزار سال پہلے روح کو پیدا کر دیا۔ اس حدیث سے جہاں روح کی خلقت کا علم ہوا، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ روح کا وجود جسم سے بہت پہلے ہو چکا۔ (تشریح ختم)

اور نفسِ حیوانی اور اس کے خدّام یہ سب نفسِ انسانی خدمت گار ہیں۔ اور اس نفسِ حیوانی کے (مذکورہ بالا) خادموں کے علاوہ بھی مزید دو خادم اور بھی ہیں اور وہ (۱) قوتِ نظری اور (۲) قوتِ عملی ہیں۔ جنہیں شریعت کی نگاہ وزبان میں کراماً کاتبین کہتے ہیں۔

قوتِ نظری قوتِ عملی

علامہ قیصریؒ اپنی کتاب "شرح قصیدہٗ فاضیہ" میں رقمطراز ہیں: کہ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بلاشبہ "کراماً کاتبین" اللہ کے فرشتوں میں سے دو فرشتے ہیں اور "عالم انسانی" میں ان دونوں فرشتوں کو ایسی دو روحانی طاقت عطا کی گئی ہے اور یہ سمجھتے ہیں ان باتوں کو جو لوح محفوظ سے منقش ہو کر یعنے (کسی خاص شکل میں ڈھل کر) ظاہر ہوتے ہیں اور جو روح انسانی کے قلب ونفس میں چھپے رہتے ہیں اور (اصل) مادّہ سے یہ دونوں قوتیں (یعنے روحانی طاقتیں) الگ رہتی ہیں۔ (ملی ہوی اور جڑی ہوی نہیں رہتیں اور ان دونوں قوتوں) کا نام اہلِ علم اور حکمت والوں کے پاس (۱) قوتِ نظریہ (۲) قوتِ عملیہ ہے۔

پھر ان دونوں قوتِ نظری اور قوتِ عملی کی ایسی تختیاں بھی ہیں جس میں ہر وہ چیز جو نفس انسانی کے ذریعہ نکلے اقوال و

افعال کی حیثیت سے وہ نقش کی شکل میں (ان تختیوں میں) ڈھل جاتی ہیں۔ خواہ وہ اقوال وافعال نفسِ انسانی کے موافق ہوں یا مخالف۔

(اور جس قوتِ نظری اور قوتِ عملی کے الواح یعنے تختیاں ہیں اسی طرح) لوحِ حسِّ مشترک (مشترک حس کی تختیاں) اور لوحِ خیال پھر لوحِ نفس یعنے نفس کی بھی تختی ہے اور یہ اقوال وافعال کی شکلیں صورتیں ان تختیوں میں پڑتی ہیں۔ اسی طرح قلب کی بھی تختی ہے۔ جیسا کہ کلام پاک میں اللہ تعالےٰ نے اپنے قول میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون (ترجمہ: کوئی نہیں، پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے۔)

تشریح مترجم یعنی ہماری یہ آیتوں میں کسی طرح کے شک وشبہ کا موقع ہی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان گناہ گاروں کو اپنے گناہوں کی کثرت اور اس پر مداومت کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ پکڑ گیا ہے اس لیے ان میں صحیح حقیقتوں اور سچی باتوں کا اثر قبول ومنظور کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ یا دھبہ لگ جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کرلی تو یہ نقطہ مٹ گیا ورنہ یہ نقطہ جوں کا توں رہ جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے یہ گناہ کرتا جائے گا ویسے ویسے یہ نقطہ بھی بڑھتا پھلتا اور پھولتا جائے گا، یہاں تک کہ قلب بالکل سیاہ اور کالا ہو جائے گا۔ اب اس کی وجہ سے حق وباطل، سچ اور جھوٹ کی تمیز جاتی رہے گی۔

یہی حال ان جھٹلانے والے شریروں کا ہے کہ وہ شرارتیں، اذیتیں اور حقائق سے منہ موڑ کر ایسی ہٹ دھرمیوں میں لگے رہیں گے گویا کہ ان کے دل مسخ ہو چکے ہیں۔ اسی لیے وہ اللہ کی آیتوں کا صاف صاف انکار ومذاق اڑاتے ہیں اور ان کے دلوں پر جو زنگ چڑھتا ہے وہ یہی تختی ہے جو پہلے الگ رنگ کی تھی، پھر سیاہ رنگ میں بدل گئی۔ (تشریح ختم)

اور یہ شکل وصورت کا نقش وظہور جسے کتابت سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ بلا شبہ قول وفعل کے واقع ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے، اس سے پہلے نہیں اور جب تک اس میں مضبوطی، پختگی اور ملکہ پیدا نہیں ہو جاتا اس وقت تک ان نقشوں، شکلوں کی صورتیں بدلتی اور متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے کہ فاؤلئك يبدل الله سيئاتهم حسنات (سو ان کو بدل دے گا اللہ تعالےٰ برائیوں کی جگہ بھلائیاں)

(یعنے یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالےٰ نیکیوں سے بدل دیتے ہیں اور اللہ تعالےٰ گناہوں کی جگہ نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے گا اور گناہ معاف کرے گا۔ یا پھر اس کا یہ مطلب بھی ہوتا ہے برائیوں کو مٹا کر توبہ اور عمل صالح کی توفیق مزید عطا کرے گا جس کی برکت سے ان کی تعداد میں مناسب نیکیاں، اچھائیاں اور صالح اعمال مقرر فرمائے گا۔)

اور یمحو اللہ مایشاء و یثبت وعندہٗ امّ الکتٰب: (مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہے) اور اسی کے پاس ہے اصل کتاب) انتہیٰ ؛ شرح قصیدۃ الفاضیۃ)

تشریح مترجم اللہ تعالیٰ اپنی حکمت عملی کے موافق و مطابق جس حکم کو چاہے منسوخ بھی کرتے ہیں اور جس کو چاہے باقی بھی رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کی حکمت اور مصلحت کے تحت ہے کہ جس قوم کو چاہے مٹادے فنا کردے نیست و نابود کردے کے رکھ دے اور جسے چاہے اس کی جگہ بٹھادے اور جن اسباب کی چاہے تاثیر بدل دے اور جن کی چاہے نہ بدلے۔ جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کردے اور جو وعدہ چاہے شرائط و قوانین کے نہ پائے جانے کی وجہ پر موقوف کردے۔

غرض ہر قسم و نوع کی تبدیل و تغیّر، اونچ نیچ، محو و اثبات، انکار و اقرار، فسخ و احکام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ قضا و قدر کے تمام دفاتر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور یہ سب تفصیلات و تحقیقات اور دفاتر کی جڑ اور بنیادی پتھر جسے "ام الکتاب" کہنا چاہیے اسی کے پاس ہے۔ یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدیل و تغیّر سے قطعاً پاک منزّہ و مبرّیٰ بھی ہے اور لوحِ محفوظ کا ماخذ بھی۔ (تشریح ختم)

نفسِ انسانِ کامل اور جب نفس انسانی ظاہر ہوتا ہے تو "نفسِ کُل" میں ابال اور جوش پیدا ہونے لگتا ہے۔ پھر ایک خاص شکل و صورت کے ساتھ اس میں بہترین آدمی (بشر) کا وجود عمل میں آتا ہے۔ پھر اس سے ایک فیضِ جدید (نیا فیض) پہنچتا ہے اور اس فیضِ جدید کا اثر یہ نفسِ کلیہ کے دوامی اور لوازمات کا ظاہر ہونا ہے۔ جو اشیاء کونیہ کے مدبّر کلیّہ ہیں۔ اس خاص برتن (مقام) میں اور انانیت کبریٰ کا دھڑنا جگر کا ٹنا، اپنے اعضاء و جوارح (ہاتھ پاؤں) کا یہ اس کی خاص انانیت ہے۔ اور علوم و مقامات کا فیض پہنچانا یہ فرمانِ الٰہی کے تحت تشکل و صورت اور تصویر وغیرہ جو خاص خاص باتوں میں سے ہیں، اس فیض جدید کا نام نفسِ انسانِ کامل ہے۔

یہی وہ جدید فیوض ہیں جو نفسِ کلیّہ سے نکلتے ہیں۔ ان کی ماہیت و حقیقت مختلف ہوتی ہے اور اصلاح شدہ پاک کیا ہوا مادّہ (اپنی) پہلی کوشش اور تدبیر سے اسی کی ایک جنس اور ذات ہے۔ پس انسان کامل یہ الگ دوسری قسم ہے، یہی خیال جمہور صوفیاءؒ کا ہے۔

بہر حال عرف یعنی منطقی اور فلاسفی البتہ اس جنس اور اس کی دوسری ذات و قسم کی تحقیق و جستجو کے بیان سے قاصر ہیں عجمی ہیں گونگے ہیں، کیوں کہ انہیں (بلا شبہ) اس جنس کے بعض عارضات اور پیش آنے والے حالات اور مُساوی (برابری) لوازمات کی تعبیرات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ان اہلِ منطق اور فلسفیوں نے اس کی تحقیق میں ٹھوکریں کھائیں) اور بجائے جنس اور فصل یعنے ذات اور اس کی دوسری قسم کے بیان کرنے کے انھوں نے نامی (بڑھنے والی قوت)

حسّاس (معلوم کرنے والی قوت) متحرک بالارادہ (عزم وارادہ کے ساتھ حرکت کرنے والی قوت) اور ناطق (بات کرنے والی قوت) قوتوں) کو ان کی جگہ وضع کر دیا اور پیش کر دیا ہے اور انسان کامل کی نوعیت اور قسم سے انھیں مطلق آگہی نصیب نہ ہوئی اور وہ اس سے بالکل یکسر نابلد رہے۔

خلاصۂ کلام! غرض روحِ ملکوتی اور روحِ جسمانی میں سے ہر ایک (کی تفصیل کا) حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان کامل دریائے نفسِ کلیّہ کا ایک حُباب (بُلبلہ) ہے اور روح ملکوتی یہ بھی ایک بُلبلہ (حُباب) ہے۔ صورت وشکل کا اتار کی جگہ میں جو عالم مثال کی سطح (اوپری حصہ) سے نکلتا ہے اور روح جسمانی یہ بھی ایک بلبلہ (حباب) ہے۔ مادّہ کے منزل (مقام) میں جو نفوسِ ارضیہ کی سطح (اوپر کا حصہ۔ چھت) سے نکلتا ہے۔ چناں چہ مصوّر (تصویر بنانے والا) پہلے ایک صورت (وشکل) کا نقش اپنے ہی دل میں جماتا ہے۔ پھر اس کے بعد موم کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف گزارتا ہے (یعنی اپنی مجوّزہ شکل میں ڈھالتا ہے۔) تاکہ اس کی وہی شکل وصورت جو اس کے ذہن میں نقش بنا چکی تھی اس کے موافق اور مطابق ہو جائے۔

جس طرح (ایک مصوّر اپنے ذہن میں بٹھائے ہوئے نقش کے مطابق موم کے ذریعہ شکل بناتا ہے) اسی طرح مصوّرِ مطلق (اللہ تعالےٰ کی ذات) بھی اپنی حکمتِ بالغہ سے نفوس کو ایک حال سے دوسرے حال میں گزارتا ہے۔ یہاں تک کہ اس صورت مثالی کے موافق ومطابق جو بہت سالوں پہلے ہی (یعنی ہزاروں سالوں کے پیشتر) ظاہر ہو چکے ہیں (اس سے) صورِ مقصودہ (ارادہ کی ہوئی صورتیں) اور نفوس کاملہ (پیدا ہوتے ہیں) اور صورۂ مقصودہ میں صورت "مقصدِ اقصیٰ" (انتہائی آخری مقصد وارادہ) اور "خاتم الانبیاءؑ کا نفس مقدس ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا درود وسلام اور تحیات وبرکات آپ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ اور آپؐ کے ان تمام بھائیوں پر بھی جو انبیاء اور مرسلین سے ہیں نیز ملائکۂ مقربین اور ان تمام پر بھی جو ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے ہیں

تمت الترجمۃ المشتملۃ بفائدۃ السادسۃ من کتاب جواہر الحقائق بعون اللہ تعالےٰ وقدرتہ فی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ من الھجرت النبویۃ علی صاحبہا الف الف صلوۃ وتحیّۃ مطابق ۱۹ جون ۲۰۰۶ء فی یوم الاثنین وسیشرع ترجمہ القسط السابعۃ عشر ان شاء اللہ تعالےٰ فی السنۃ الآتیۃ۔

جاری

نقوشِ طاہر

آدابُ النبی ﷺ و فیضانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
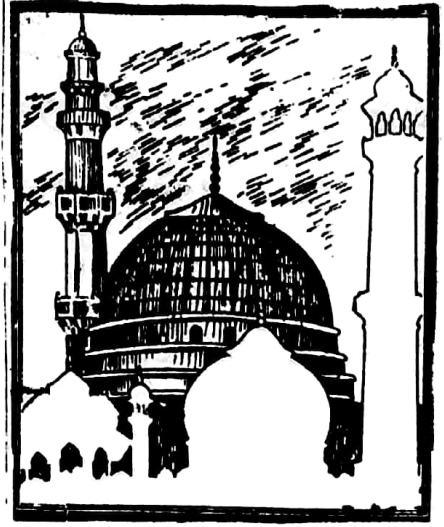
حضرت اقدس مولانا ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ، سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان قطب ویلور۔

مہرِ عظمت بر فلک رخشندہ باد　　　　در جہاں نامِ محمدؐ زندہ باد

اللّٰھم صل علیٰ محمدٍ وعلیٰ آل محمد معدن الجود والکرم منبع العلم والحلم وبارک وسلم

سرورِ کائنات شفیع المذنبین حیات النبی رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ اور سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم حیاتِ ظاہری اور حیاتِ باطنی میں تمام کائنات کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے، جب آپ صلے اللہ علیہ وسلم وضو کرنا چاہے تو اپنا عمامۂ مبارک کو بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے سرِ مبارک پر رکھا۔ اس وقت بی بی فاطمہؓ کی عمر چار سال کی تھی۔ جوں ہی یہ عمامہ آپؓ کے سر پر رکھا گیا تو آپؓ نے ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کا مشاہدہ کرنے لگیں اور اُن کے درمیان کے تمام احوال ومناظر آپؓ پر منکشف ہونے لگے۔ بعد فراغتِ وضو جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے عمامہ کو آپؓ کے سر سے اٹھالیا تو فوراً یہ چیزیں جو نظر آنے لگی تھیں حضرت فاطمہؓ کی نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ حضور سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم تا قیامِ قیامت تمام حالات کا مشاہدہ فرماتے رہیں گے اور اپنے فیضانِ کرم کو جاری وساری رکھیں گے۔

آداب النبیؐ کے سلسلہ میں ایک واقعہ پیشِ ناظرین ہے:

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ آپ مدینۂ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ خلیفۂ بغداد منصور مدینۂ منورہ آیا اور مسجدِ نبوی میں جاکر حضرت امام مالکؒ سے ملاقات کیا اور گفتگو میں مشغول ہوا۔ دورانِ گفتگو خلیفہ کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ تو حضرت امام مالکؒ نے خلیفہ کو ڈانٹ کر کہا: اے امیر المومنین! کیا آپ آداب النبیؐ سے واقف نہیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ مومنین سے فرمارہا ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ہ تم اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم حیات النبیؐ آپ کی حیات ظاہری میں ہو یا حیات النبیؐ باطنی میں ہم کو آداب ملحوظ رکھنا چاہیے۔ خلیفہ یہ ڈانٹ پا کر دبی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ اور آپ سے اس مسئلہ کا حل طلب کیا کہ میں جب دعا مانگوں تو اپنے چہرے کا رُخ روضۂ اطہر کی طرف رکھوں یا کعبۃ اللہ کی طرف۔ آپؒ نے فرمایا: کیا کوئی شخص حیات النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اپنے چہرے کو پھیرے اور دعا کی قبولیت کی امید رکھے یہ ہرگز ممکن۔ اے منصور! اپنے چہرے کا رُخ روضہ اقدس کی طرف کرکے دعا مانگو، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا شفیع بناؤ۔ کیوں کہ جو دعا آپؐ کے وسیلے سے مانگی جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالےٰ اس دعا کو مقبول و مستجاب فرماتا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے دربارِ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضری دینے کے آداب کیا ہی عمدہ مثال پیش فرمائی ہے۔

ایک روز صبح میں بعد نماز فجر صحابی رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ قریب آیا اور ان کی گردن پکڑ کر اٹھایا اور کہنے لگا: تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کرتے ہو؟ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اس کی طرف دیکھ کر ڈانٹ کر کہنے لگے: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں مٹی اور پتھر سے چمٹا ہوں۔ میں حضورؐ کے دربار میں حاضر ہوں۔ اے مروان جب اہل لوگ حاکم بنتے ہیں تو کچھ کہنا نہیں ہے اور جب نااہل حاکم بنتے ہیں تو رونا پڑتا ہے۔ اسی لیے دربارِ نبوت میں فریاد کر رہا ہوں۔ مروان ان گرم جملوں کو سن کر وہاں سے خاموش چلا گیا۔

یہ وہ مقام ہے کہ جب عشق رسولؐ میں فنا فی الرسول ہو جاتے ہیں تو یہ مرتبہ بلند پاتے ہیں اور جب بھی چاہے دربار رسولؐ میں حاضری دیتے ہیں۔ عشق رسولؐ کی نادر مثال اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ خاص و نظرِ کرم کی بے نظیر روایات افادۂ ناظرین کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

حافظ ابو العباس سراج خراسانی کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ الفت و محبت تھی۔ اور اسی عشق و محبت کے صلے میں آپ نے بارہ ہزار قرآن کریم ختم کر کے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی روحِ پر فتوح کو ایصال و ثواب کے لیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بارہ ہزار قربانیاں دی تھیں۔ ایک روز شب میں آپ نے خواب میں دیکھا کہ ننانوے سیڑھیاں آسمان کی طرف لگی ہوی ہیں اور آپ نے تمام زینوں پر چڑھا۔ خواب کی تعبیر بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ آپ کی عمر شریف ننانوے سال ہوگی۔ آپ کثرت سے نوافل ادا فرماتے تھے اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کثرت سے کرتے تھے اور درس و تدریس آپ کا معمول تھا۔ اس عاشق رسولؐ نے ننانوے برس کی عمر میں وصال فرمایا۔

حضرت یزید بن ہارون واسطیؒ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے شاگرد رشید تھے۔ یہ اپنے وقت کے جیّد عالم تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں آپ سے بڑھ کر کسی اور کو حافظ الحدیث نہیں پایا گیا۔ آپ بھی کثرت سے نوافل ادا فرماتے تھے اور اپنے استاد محترم حضرت

ابوحنیفہ کی طرح ایک شب میں چار سَو رکعت نفل نمازیں پڑھا کرتے اور کثرت سے قرآنِ کریم کی تلاوت فرماتے تھے اور یہ شغفِ تلاوت ماہِ رمضان میں اور بھی زیادہ ہوجاتا تھا اور ہر دن میں ایک قرآنِ کریم مکمل کرتے تھے۔ آپ منصبِ درس وتدریس پر فائز تھے۔ آپ کی آنکھیں نہایت حسین وخوب صورت تھیں ہمیشہ آپ پر خشیتِ الٰہی کا غلبہ رہا۔ چناں چہ اسی خوفِ الٰہی میں روتے روتے آشوبِ چشم کی شکایت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے آنکھوں کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ بینائی بھی جاتی رہی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض بصیرت عطا کی تھی۔
آپ فنافی الرسول کے مقام پر فائز تھے۔ حیات النبیﷺ کی حدیث پڑھنے اور پڑھانے والوں پر برابر اپنا فیضانِ کرم پہنچاتے رہے ہیں۔
حضرت ابوالحسن خرقانی کے پاس ایک طالب علم حدیث پڑھنے کے لیے آیا اور آپ نے دریافت کیا کہ آپ نے حدیث کن سے پڑھی ہے؟ آپ نے فرمایا: بالراست حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے حدیث پڑھی ہے۔ طالب علم آپ کی بات کا یقین نہ کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ شب کو خواب دیکھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اور فرمارہے ہیں: ابوالحسن سچ کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے بالراست مجھ سے حدیث پڑھی ہے۔ پھر وہ دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے حدیث پڑھنے لگے۔
درسِ حدیث کے دوران کبھی کبھی ابوالحسن خرقانی فرماتے: یہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں۔ طالب علم کے پوچھنے پر فرماتے کہ جب تم حدیث پڑھتے ہو تو میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک دیکھتا ہوں۔ جب آپ کے چہرۂ مبارک پر شکن نمایاں ہوتی تو میں محسوس کرلیتا ہوں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔
ایک محدّث اپنے شاگردوں کو درسِ حدیث دے رہے تھے کہ ایک روز ایک ولی بھی حلقہ درس میں شریک ہوکر حدیثوں کی سماعت کرنے لگے۔ درس کے دوران محدّث نے ایک حدیث بیان کی تو آپ نے فرمایا: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ محدّث نے تعجب سے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ آپ نے جواب میں کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کے بارے میں انکار فرمارہے ہیں۔ اگر آپ حقیقتِ حال سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو اوپر دیکھیے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نظر آئیں گے۔ چناں چہ محدّث نے اسی وقت اپنی نگاہیں اوپر کیں تو دیکھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اوپر بالاخانہ پر تشریف فرما ہیں آپ فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے اور اس حدیث کی عدمِ صحت کا پتہ چلا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک ولی ہی کے ذریعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوسکتی ہے۔
استادِ حدیث امام غزالی کے پاس ایک روز ایک شخص آیا اور کہنے لگا میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کے پاس یہ پیغام بھیجا ہے کہ ایک گندمی رنگ کا طالب علم میری حدیثوں کی طلب میں ان کے پاس آئے گا۔ اسے پوری توجّہ اور انہماک کے ساتھ پڑھائیں۔ امام غزالی اس پیام کو سُن کر تھوڑی دیر کے لیے محوِ حیرت رہے اور فوراً ارشادِ نبویؐ کی تعمیل کے لیے مستعد ہوگئے۔
چناں چہ ایک گندمی رنگ کا طالب علم (ابن عساکر) آپ کے پاس آپہنچا اور حدیث کے درس میں شریک ہوگیا۔ آپ اس طالب علم پر توجۂ خاص فرماتے رہے اور پورے ذوق وشوق کے ساتھ حدیث پڑھاتے تھے اور جب تک وہ طالب علم نہیں اٹھتا برابر درس دیتے رہتے۔

آگے چل کر ابن عساکر بہت بڑے عالم اور جلالتِ علم کے مالک بن گئے ۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو آپ کے وسعتِ علم اور تبحرِ علمی کا ثبوت دیتی ہیں ۔ آپ کے اندر عبادت اور ریاضت کا ذوق زیادہ تھا ۔ کثرت سے نوافل ادا فرماتے اور قرآنِ کریم کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے ۔ آپ نے طویل عمر پانے کے بعد اس عاشقِ رسول ؐ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ۔

حضرت رابعہ بصری زاہدہ و عابدہ اور نہایت متقی اور پرہیز گار خاتون تھیں اور فنا فی الرسول ؐ کے مرتبۂ عظمیٰ پر فائز تھیں ۔ آپ کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچا عشق تھا ۔ دن اور رات میں ایک ہزار نفل نمازیں ادا فرماتی تھیں اور یہ ہدیہ بارگاہِ رسالت مآب ؐ میں پیش فرماتی تھیں کہ یہ نمازیں میں نے جنت کی طلب میں اور نہ دوزخ کے خوف سے ادا کیں بلکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کی خاطر پڑھا کرتی تھیں ۔ کیوں کہ جو بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس سے محبت کرتا ہے اور اسی میں میری بخشائش ہے ۔

اللہ تعالےٰ تمام مسلمانوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اور الفت کا جذبہ عطا فرمائے اور سید المرسلین شفیع المذنبین، حیات النبی رحمۃ للعالمین کا فیضانِ کرم ہم تمام مسلمانوں پر یکساں رہے ۔ آمین ثم آمین بجاہِ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم ۔

کی محمد ؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ایک جامع دعا

اَللّٰهُمَّ يَا رَجَآئِيْ يَا مَنَآئِيْ يَا غِيَاثِيْ يَا مُرَادِيْ يَا مُعَافِيْ يَا شِفَآئِيْ يَا كَمَآئِيْ كَفِيْ يُحْيِيْ يَا غَفُوْرُ يَا غَفُوْرُ يَا غَفُوْرُ يَا غَفُوْرُ اِغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ يَا اللّٰهُ يَا اللّٰهُ يَا اللّٰهُ يَا اللّٰهُ يَا غَفُوْرُ يَا غَفُوْرُ يَا غَفُوْرُ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحْمٰنُ يَا رَحِيْمُ يَا رَحِيْمُ يَا رَحِيْمُ يَا كَرِيْمُ يَا كَرِيْمُ يَا كَرِيْمُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ۔

یوم لا ینفع مال ولا بنون

ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری ناظم دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ۔ ویلور

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی زندگی میں مال و جائداد کمانے کی دھن میں رات دن سرگرداں رہتا ہے ۔ آخرکار کئی سالوں کی محنت کے بعد اس کے ہاتھ کچھ مال و جائداد لگتی ہے ۔ اس مال و جائداد کی حفاظت کے لیے اور اس کو تادیر اپنے قبضۂ قدرت میں رکھنے کے لیے وہ شادی بیاہ بھی کرتا ہے اور اولاد کا امید وار بھی ہوتا ہے ۔ اولاد ہونے کے بعد اس کو اپنے نقشِ قدم پر چلانے اور اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ اس کے مال و جائداد کی نگرانی و حفاظت کر سکے بہت کچھ کوشش بھی کرنے لگتا ہے اور دن رات یہی فکر اُسے دامنگیر رہتی ہے ۔

یہ تمام جدوجہد کے بعد اس کا ایک اپنا مقام بنتا ہے اور لوگ اس شخص کو سوسائٹی میں ایک بلند مقام عطا کرتے ہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام کوششیں اور محنتیں اس شخص کو روز قیامت میں کچھ فائدہ مند بھی ثابت ہوں گی یا یہ صرف اس کو قبر تک پہنچا کر واپس روانہ ہو جائیں گی ۔

یہ مضمون اسی بات پر روشنی ڈالنے کے لیے ہے کہ کیا مال، اولاد اور جاہ و مرتبہ صرف دنیا تک فائدہ پہنچانے والے ہیں یا آگے بھی اس کا کچھ فائدہ حاصل ہوگا ؟ بے شک قرآن و احادیث سے یہ ثابت ہے کہ مال و اولاد اور شہرت و مرتبہ یہ تمام چیزیں انسان کے لیے فتنہ ہیں اور اس بات کی صداقت کے لیے تاریخ کے اندر ایسے کئی ایک واقعات موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال و اولاد اور شہرت انسان کو کس طرح گمراہی کے گڑھے میں ڈھکیل دیتی ہے ۔ نمرود، فرعون، ہامان اور شدّاد کو اُن کی اپنی طاقت و شہرت نے کس طرح تباہ و برباد کیا کہ اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔ قارون کو اس کے مال نے کس طرح زمین میں دھنسا دیا ۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہے کہ مال و اولاد اور شہرت انسان کے بظاہر خطرناک مضر و نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں جب کہ ان ہی تین چیزوں یعنے مال، اولاد اور شہرت پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہیں اور بجا طور پر اس کی پہچان کا یہ

ایک واحد ذریعہ اور معیار رہے۔ قرآن و حدیث سے جہاں مال و اولاد کی مذمت اور برائی کا پہلو اجاگر ہے وہیں اس کی اہمیت و افادیت کا پہلو بھی اجاگر ہے۔ اب بظاہر دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے، جب کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نعم المال الصالح للرجل الصالح ونعم المعونتہ ھی: پاک مال نیک اور صالح آدمی کے لیے بہت اچھا ہے اور یہ مال اس کے لیے بہترین مددگار بھی ہے۔ دیکھیے یہاں مال کی کس قدر تعریف کی گئی ہے اور اس کی اہمیت کو کس طرح سراہا جارہا ہے۔ پھر دوسری جگہ اس کی مذمت بیان کرنا اور اسے مضرت اور خسارے کی چیز قرار دینا کیا معنی؟

اس اشکال کے جواب کے لیے ہم ذرا ڈیپ میں جائیں اور گہرائی میں سوچیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے اندر کوئی تضاد اور مخالفت نہیں ہے۔ دُنیا کمانا، نکاح کرنا اور افزائش نسل کی کوشش کرنا اور اولاد پیدا کرنا یہ دین و شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ بھی دین و شریعت کے معین و مددگار ثابت ہوتے ہیں، جب کہ انھیں شریعت کے تابع بنوالیں اور اس کے ماتحت رہیں، خادم بن کر رہیں مخدوم بن کر نہیں۔ یہ مال یہ اولاد اور یہ جاہ و مرتبت سب اللہ اور اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرمان کے تحت مطیع و فرماں بردار رہیں اور ان کے بتلائے ہوئے قانون و اصول کے تحت ہوں۔ تو یہ مال و اولاد اور جاہ و مرتبہ سب محمود و مطلوب ہوں گے۔ ورنہ مذموم و معتوب سمجھے جائیں گے۔

شہباز آسمانی قطب لاثانی محبوب سبحانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہٗ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ بلّور اور کانچ کے بڑے تاجر تھے۔ ان کا مال تجارت باہر ملکوں کو جاتا تھا۔ ایک وقت خادم آیا اور عرض کیا کہ حضرت ہمارا سامان تجارت سے لدا ہوا جہاز دریا میں غرق آب ہوگیا، اس طرح دفعتاً لاکھوں کروڑوں کا نقصان ہوگیا۔

یہ سُننا تھا کہ حضرت نے اپنا سر مبارک جھکایا، پھر سر مبارک اٹھا کر ارشاد فرمایا الحمدللہ۔ پھر کچھ مدت گزرنے کے بعد خادم حاضر ہوکر عرض کیا کہ حضرت پہلی والی خبر غلط تھی۔ جو جہاز ڈوبا تھا وہ ہمارا نہیں تھا دوسروں کا تھا۔ بلکہ ہمارا تو صحیح و سالم ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ سُن کر حضرت نے اپنا سر مبارک جھکایا اور پھر اٹھا کر فرمایا: الحمدللہ۔

حضرت غوث اعظم دستگیر رضی اللہ عنہٗ نے دونوں مرتبہ الحمدللہ فرمایا تو حاضرین کو بڑا تعجب ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔ تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اپنے دل کا محاسبہ کیا اور دیکھا کہ جہاز کے ڈوبنے اور مال کے ضائع ہونے سے دل پریشان تو نہیں ہوگیا؟ دیکھا تو دل اپنی اصلی حالت پر ہے۔ وہ بدستور ذکر الٰہی میں مشغول ہے تو میں نے اس کی اس حالت پہ الحمدللہ کہا ہے اور جب مال کے صد درجہ نفع کی خوش خبری سُنی تو پھر میں نے اپنے دل پر غور کیا تو دیکھا کہ اس کو اس کا احساس ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اطمینان سے ذکر اللہ میں مشغول ہے تو میں نے اس کی حالت پر الحمدللہ کہا ہے۔ غرض کہ نہ مال کے جانے کا غم نہ مال کے

آنے کی خوشی۔ بہرحال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہنا یہ اللہ والوں کا شیوہ اور اسوۂ حسنہ ہے۔ سچ ہے: ؎

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں گھومو — جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

پر بندۂ عاجز کی فقط اتنی رہے بات — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

مال، اولاد، جاہ اور سیم وزر یہ سب اپنی اپنی جگہ رہیں۔ دُنیا میں ہر ایک کی ایک جگہ ہوتی ہے۔ اولاد بنگلوں محلوں مکانوں اور پارکوں میں رہے۔ مال وسیم وزر بینکوں، لاکروں، صندوقوں اور جیبوں میں رہنے کی چیز ہے مگر اللہ کی محبت یہ دل میں بسنے کی چیز ہے۔ دل اولاد کی محبت کی جگہ نہیں ہے۔ سچ ہے: ؎

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

ایک دن حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی مجلس میں دُنیا کا ذکر ہو رہا تھا کہ کسی کو دُنیا سے محبت ہوتی ہے اور کسی کو اس سے نفرت ہوتی ہے۔ اس پہ آپؒ نے فرمایا کہ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں: ۱۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو دُنیا کو دوست رکھتے ہیں۔ اور دن رات اس کی یاد اور فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت ہیں۔ ۲۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو دُنیا سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ہمیشہ اس کی دشمنی میں رہتے ہیں۔ ۳۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے، جن کو نہ دُنیا سے محبت ہوتی ہے نہ نفرت اور وہ اس کا ذکر نہ محبت سے کرتے ہیں نہ عداوت و نفرت سے۔ یہ لوگ پہلی دونوں قسموں سے بہتر ہیں۔

اس کے بعد حضرت شیخ المشائخ سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے یہ حکایت سنائی کہ ایک شخص حضرت رابعہؒ بصری کے پاس آیا اور دُنیا کی سخت مذمت کرنے لگا۔ حضرت رابعہ بصریؒ نے اس سے کہا کہ آپ برائے مہربانی آئندہ ہمارے پاس نہ آئیگا۔ کیوں کہ آپ کو دُنیا سے محبت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے تو آپ اس کا بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ گو کہ برائی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ مال، اولاد، شہرت سے انسان کو دُنیا و آخرت دونوں جگہ فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں کو صحیح و جائز طریقہ سے حاصل کرکے اور صحیح و جائز طریقہ سے ان کا استعمال کریں تب یہ تینوں مال، اولاد اور شہرت فائدہ مند ثابت ہوسکتے ہیں۔ مال اللہ کی نعمت ہے اگر اس نعمت کو اللہ ہی کی راہ میں خرچ کریں اللہ کی اس عطا کردہ نعمت سے مخلوق کی مدد کریں۔ انھیں فائدہ پہنچائیں تو یہ مال اس کے حق میں آخرت کا توشہ ثابت ہوگا۔

اولاد بھی اللہ تعالےٰ کی جانب سے ایک بہت ہی انمول نعمت ہے۔ اگر اس کی تربیت و نگہداشت صحیح طریقے سے کریں۔ اس کو دین کی سمجھ بوجھ عطا کریں۔ نیک و صالح بنائیں تو یہ اولاد بھی اس کی آخرت کے لیے زادِ راہ ثابت ہوگی۔

شہرت ومرتبہ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اس کی قدر وحفاظت کرتے ہوئے اپنی بساط بھر مخلوق کو فائدہ پہنچانا اور اُن کی حاجتوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ اللہ کی عطا کردہ اس شہرت ومرتبہ کا غلط استعمال نہ کریں۔

مال، اولاد، شہرت ان تینوں چیزوں سے نقصان بھی ہے اور فائدہ بھی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال کافی ہے کہ چاقو، چھری، تلوار یہ تمام اشیاء ایسی ہیں اگر ان کو صحیح طریقے سے استعمال کریں تو فائدہ ہوگا اور اگر غلط استعمال کریں تو نقصان ہوگا۔

یقیناً مال اولاد اور شہرت سے مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس بات کی صداقت اس حدیث سے ہوتی ہے کہ اللہ کے حبیب سرکار دو عالم نورِ مجسم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں لیکن تین[۳] عملوں کا فائدہ اس کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا ہے۔ (۱) اس نے اگر کسی کو دین کی تعلیم دی یا کسی کو نیکی کے راستے میں چلایا ہے تو اس کا ثواب اس مرنے کے بعد بھی حاصل ہوگا۔

دوسرا[۲] اپنی اولاد کو صالح بنایا، نیک تربیت کی اور وہ اولاد صالح اس کے حق میں دعا کرے تو اس کا ثواب بھی اس کو حاصل ہوگا۔ تیسرا[۳] اس نے مخلوق کی ضرورت کے لیے کوئی مدرسہ، مسجد یا سرائے یا کنواں یا کوئی ایسی چیز قائم کی ہو، جس سے لوگ فائدہ حاصل کر سکیں تو اس عمل سے بھی اس کو فائدہ حاصل ہوتا رہے گا۔

حاصلِ تحریر: اب یہ بات واضح ہوگئی کہ جس طرح مال، اولاد اور شہرت انسان کے لیے نقصان دہ ہے اور خطرناک ثابت ہیں اسی طرح یہ تینوں انسان کے لیے کارآمد اور فائدہ مند بھی ثابت ہو رہے ہیں۔ تو اب یہ چیز لازمی ہے کہ انسان ان تینوں کو یعنی مال اولاد اور شہرت کو حاصل کرنے کے بعد خدا سے غافل نہ رہے اور ان نعمتوں کو صحیح لائن پر لگائے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلم کے صدقہ وطفیل سے ہم تمام کو نیک توفیق عطا کرے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اسی کے لیے اسی کی راہ پر لٹانے اور ہمہ وقت اس کا شکر گزار بنا رہنے کی توفیق بخشے۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین!

مولوی حافظ ابوالنعمان ڈاکٹر بشیر الحق قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی

آدمی کی شکل وصورت، پوشش ولباس، وضع وقطع، بات چیت اور عادات واطوار وغیرہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ اس کی شرافت وعظمت، نفاست ونظافت، قابلیت وصلاحیت، علمیت واخلاقیت اور شہریت وقومیت کا اندازہ ہوجاتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہوا کرتی ہیں جو کسی قوم وملک اور مذہب وملّت کی علامت ونشانی قرار پاجاتی ہے جن کے ذریعہ آسانی کے ساتھ پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ فلاں قوم کا فرد اور فلاں ملک کا باشندہ ہے۔ جیسے صلیب نصاریٰ کا شعار ہے اور زنّار برہمنوں کی علامتِ خاص ہے اور کرپان سکھوں کی مخصوص پہچان ہے اور ملکوں کے جھنڈے ان کے مزاج ومنہاج اور عقیدہ ومسلک کی پہچان ہوتے ہیں۔ اس طرح اسلام نے اپنے متبعین کے لیے کوئی ظاہری علامت خاص نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے دامن میں ہر زمانہ اور ہر ملک اور ہر قوم کو سمو لیا ہے اور زمانہ کبھی ایک ہی سمت رواں دواں نہیں رہتا انسانی ضروریات اور حالات کے زیر اثر ہر دور اور ہر علاقہ کے لوگوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام کا ظہور عرب کے علاقہ سے ہوا پھر وہ دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اسلام نے اپنے بنیادی اصول و عقائد کو ہر خطّہ اور علاقہ کے لوگوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ جن کے اندر کبھی اور کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ اصول ومبادیات کے اندر زمانی اور علاقائی اثرات وضروریات اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ البتہ اسلام کے وہ احکام جو جزوی و فروعی اور اجتہادی نوعیت کے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے اور زمانہ کے تغیّر کے ساتھ ساتھ ان احکام کے اندر بھی تغیّر کا سلسلہ قائم رہے گا۔

عرف وعادات اور رسم ورواج یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف سے اسلام نے کلّی طور پر اور عمومی سطح پر بے اعتنائی

اور عدم التفات کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں مختلف رسوم و رواج اور عادات پھیلے ہوئے تھے اور عرب ان کی پوری طرح پابندی کرتے تھے۔ اسلام نے عربوں کے ان رسوم و عادات کو باقی رکھا، جن کے اندر خیر و خوبی اور احسان کا پہلو تھا۔ جیسے ختنہ کرنا، نومولود کا عقیقہ کرنا، مہمان نوازی، وعدہ وفائی، لباس، وضع قطع، مُردوں کو غسل دینا اور دفن کرنا وغیرہ

ان رسوم و عادات کو ختم کر دیا جن کے اندر کفر و شرک، کثافت و گندگی اور غیر شائستگی کا عنصر تھا۔ جیسے بیت اللہ کا برہنہ طواف کرنا، بتوں کے نام پر قربانی کرنا، کاہنوں اور نجومیوں کی باتوں پر اعتماد کرنا، عورتوں اور بچوں کو وراثت سے محروم کرنا، یتیموں کا مال کھانا۔ وغیرہ

غرض جو چیزیں عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیم کے موافق تھیں اور کسی درجہ میں معاشرہ کے حق میں فائدہ مند تھیں، ان کو اسلام نے قبولیت کے درجہ میں رکھا اور جو چیزیں عقلِ صحیح اور فطرت سلیم کے خلاف تھیں اور وہ کسی درجہ میں معاشرہ کے حق میں نقصان دہ تھیں ان کو رد کر دیا یا اُن کے اندر اصلاح و ترمیم کی۔

عادت معاودت سے ماخوذ ہے اور عادت اس فعل اور کام کو کہتے ہیں جو بار بار کئے جانے کی وجہ سے لوگوں کے نفوس میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس کی جمع عادات ہے۔

عرف کا معنی ہے معلوم اور متعارف۔ عرف کا اسم مفعول معروف ہے۔ معروف کا معنی ہے شناسا عمل اور جانا پہچانا کام جس کو لوگ اچھی نظر سے دیکھتے ہوں۔ نیک کام، نیک عمل۔

عرف کی ضد نکر ہے جس کا معنی ہے نامعلوم اور غیر متعارف۔ نکر کا اسم مفعول منکر ہے۔ منکر کا معنی ہے غیر شناسا عمل۔ ایسا فعل جس کو لوگ اچھی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔ بُرا کام، بُرا عمل۔

عرف کا لفظ قرآن کریم کی سورۃ اعراف میں آیا ہوا ہے۔ وامر بالعرف۔ عرف، معروف کے معنی میں ہے۔ یعنی نیک کام کی تعلیم دیں۔ علامہ ابوبکر جصاص نے یہ تفسیر کی ہے: المعروف ھو لما حسن فی العقل فعلہ ولم یکن منکر عند ذوی العقول الصحیحہ۔

عرف اس کام اور عمل کو کہتے ہیں جو عقل کے نزدیک پسندیدہ ہو اور اربابِ عقلِ سلیم کے نزدیک ناپسندیدہ نہ ہو۔ العقول الصحیحہ سے خود بخود یہ بات واضح ہو رہی ہے عوام اور ناسمجھ افراد کا عرف غیر معتبر ہے۔

الغرض عرف وہ جانا پہچانا اور پسندیدہ عمل ہے جو مفید ہو۔ خواہ اس کا تعلق اخلاق سے ہو یا اعمال سے ہو یا عادات سے ہو اور عرف ایک طریقہ ہے اور ایک ایسا عمل ہے جس کے لوگ عادی ہو چکے ہوں۔ العرف ما اعتادہ الناس

عرف کے مفید اور مقبول ہونے کے لیے ایک حدیث شریف سے بھی تائید ملتی ہے۔ امام مسلم نے روایت کی ہے:

مارآہ المؤمنون حسنا فھو عند اللہ حسن

جس چیز کو اہل ایمان مفید اور مستحسن خیال کریں وہ اللہ کے نزدیک بھی مستحسن ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک مشہور قول سے بھی مذکورہ حدیث کی مزید تفصیل ہوتی ہے: مارای المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وما رآہ المسلمون سیئاً فھو عند اللہ سئی

مسلمان جس چیز کو اچھی سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس کو بُری سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے

مذکورہ حدیث اور صحابی کے اثر میں مومن سے مراد مومن کامل ہے اور مسلمان سے مراد وہ مسلمان ہیں جن کے اعمال اور اخلاق کتاب وسنت کے موافق ہوں۔ کیوں کہ بہت سے مسلمان ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جو کسی ناپسندیدہ چیز کو اپنی فہم و دانست کے مطابق پسندیدہ خیال کر بیٹھیں۔ ایسی صورت میں یہ عرف، عرفِ صحیح نہیں بلکہ عرفِ فاسد سمجھا جائے گا۔

اور جو بھی عمل وطریقہ اور عادت وعرف قرآن وحدیث سے متصادم نظر آئے تو دین میں اس کی کوئی حیثیت نہیں اور وہ ترک کرنے کے قابل ہے۔ جیسا کہ فقہاء نے وضاحت کی ہے۔ ان العرف والعادۃ یکون حجۃ اذا لم یکن مخالفا النص۔

جو بھی عرف وعادت قرآن وحدیث کے موافق ہو تو وہی حجت ہے اور اگر کتاب وسنت کے مخالف ہو تو وہ حجت نہیں ہے۔

البصائر حاشیہ الاشباہ والنظائر میں مرقوم ہے:

اعتبار العرف ترجع الیہ فی الفقہ حتی جعلوہ اصلاً خامساً۔ والمراد بالعرف عرف المؤمنین مالم یخالف قواعد الشرع فان خالف فلا اعتداد بہ اصلاً۔

فقہ میں عرف کا اعتبار ہے اور اس کو دلائل شرعیہ (کتاب، سنت، اجماع وقیاس) میں سے پانچویں اصل قرار دیا گیا ہے۔ اور عرف سے مراد مؤمنین کا عرف ہے اور وہی عرف معتبر ہے جو قواعد شریعت کے خلاف نہ ہو اور اگر وہ شرع کے خلاف ہے تو ہرگز اس کا اعتبار نہیں ہے۔

"خزانۃ الروایات" میں مرقوم ہے کہ مؤمنین کے عرف سے مراد امت کے صلحاء وعرفاء کا عرف ہے۔ عام لوگوں کا عرف نہیں ہے جو کھرے اور کھوٹے اور صالح وفاسد کے درمیان فرق وامتیاز نہیں کر سکتے۔

ایک عرف یہ ہوتا ہے کہ چند لوگ کسی خاص طریقہ پر عمل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ایک عرف یہ ہوتا ہے کہ سارے لوگ کسی خاص طریقہ پر عمل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں عرف ایک انفرادی ہوتا ہے تو

دوسرا اجتماعی۔ اور ایک عرف یہ ہوتا ہے کہ مختلف شہروں کے باشندوں کا عمل یکساں رہتا ہے۔ خواہ وہ عمل قدیم ہو یا جدید اور عرف وعادت میں تغیر اور تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی کبھی تمدنی ہوتی ہے تو کبھی اخلاقی۔ کیوں کہ شہروں میں لوگوں کا تمدن بدلتا رہتا ہے اور اسی طرح ان کے اخلاق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ تمدنی معاشرتی، اخلاقی زندگی کا قافلہ ہر دور اور ہر زمانہ میں ایک ہی راہ پر گامزن نہیں رہ سکتا۔ ایسی صورت میں عادات میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے اور یہ تبدیلی ضروریات وحوادث اور لوگوں کے فساد اور صالح طبیعتوں کے تابع رہا کرتی ہے۔ اسی لیے زمانے کے اختلاف سے بہت سارے احکام میں اختلاف اور تغیر پیدا ہو جاتا ہے: تتغیر الاحکام بتغیر الزمان

عرف میں ایک پہلو مشابہت اور مماثلت کا بھی ہے۔ یعنی کوئی عمل اور کام ایسا ہے، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رائج ہو اور وہ دونوں کے عادات میں شامل ہو چکا ہو۔ جیسا کہ ہمارے ملک ہندوستان میں شادی بیاہ اور خوشی کے مواقع اور تقریبات اور سیاسی اور غیر سیاسی جلسوں میں پھولوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پھولوں کا ہار پہننا اور پہنانا ہندوستانیوں کی مشترک عادات میں سے ایک عادت ہے مسلم معاشرہ میں نکاح کے وقت نوشاہ کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا جاتا ہے شاید اس عمل سے اظہارِ خوشی اور خوش بو سے لطف اندوزی اور نوشاہ کی شانِ امتیازی مقصود ہو۔ جنوبی ہند کے اکثر شہروں میں عرصہ دراز سے نوشاہ کی گلپوشی کی عادت چلی آرہی ہے۔ لیکن چند سالوں سے یہ عادت اختلاف کی نذر ہو چکی ہے۔ چنانچہ کسی جگہ نوشاہ کے گلے میں ہار دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جارہا ہے تو کسی جگہ ہار نکلوانے کی سعی کی جا رہی ہے اور کسی جگہ ہار پہننے کو بدعت اور خلافِ سنّت اور کفار سے مشابہت کہا جارہا ہے۔

پھولوں کا ہار پہننے کو کفار کے ساتھ مشابہت کی جو بات کہی جارہی ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اس سے کفار کے ساتھ مشابہت ثابت نہیں ہو سکتی کیوں کہ مشابہت وہی بُری ہے جو مذموم چیزیں ہو۔ اور مشابہت کی نیّت ہو .... شعار قوم کی علامت خاص کو کہتے ہیں جو لباس وغیرہ میں ہوتی ہے۔ اور قوموں کی مشترک عادات کو شعار نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے ایک ملک یا شہر کے باشندوں میں بہت سی عادتیں باہم مشترک ہوا کرتی ہیں۔ ان عادات کا تعلق خواہ کھانے پینے سے ہو یا مکانات اور رہن سہن سے ہو۔

درمختار میں ہے:

دوسری قوموں کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت مکروہ نہیں ہے بلکہ مذموم شئے میں مشابہت مکروہ ہے اور اس چیز میں مکروہ ہے جس میں دوسری قوموں کے ساتھ مشابہت کا قصد کیا جائے جیسا کہ 'بحرالرائق' میں ہے:

اور شامی میں ہے کہ ہر چیز میں مکروہ نہیں اسی لیے ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اور وہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔

اور ذخیرہ کی عبارت جو کتاب التحری سے ذرا آگے ہے وہ بھی اس کی تائید کر رہی ہے۔ ہشام کہتے ہیں کہ میں نے ابو یوسف کو دیکھا جو میخوں سے ٹھونکے ہوئے نعلین پہن رکھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: کیا آپ اس کے استعمال میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے؟ فرمایا: نہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت سفیان اور ثور بن یزید تو اس کے استعمال کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ چوں کہ اس میں نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے۔

ابو یوسف نے فرمایا: نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نعال پہنتے تھے۔ جس میں بال رہتے تھے۔ بلا شبہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے۔ غرض حضرت ابو یوسف نے اس بیان کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کر دی کہ جن چیزوں کے اندر لوگوں کی صلاح و بہبودی اور فائدہ ہو، اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مرقات میں حدیث: من تشبه بقوم فهو منهم (جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کر لی تو وہ ان ہی میں سے ہے۔) کے تحت یہ تشریح ہے۔ جو شخص خود کو کفار کے ہم شکل اور مشابہ بنا لے تو اس کا شمار ان ہی میں سے ہو گا۔

علامہ طیبی نے لکھا ہے: خَلق، خُلق اور شعار تینوں میں مشابہت عام ہے۔ اگر چہ کہ شعار میں مشابہت زیادہ نمایاں ہے اور مشابہت شعار ہی میں مراد ہے غیر شعار میں مراد نہیں۔ کیوں کہ خلق (ظاہری صورت) میں مشابہت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور خُلق میں مشابہت کا لفظ نہیں بولا جاتا بلکہ تخلیط کہیں گے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل مشکوۃ کے حاشیہ میں درج ہے۔

قاموس میں ہے قوم اپنی علامت خاص اور اپنے شعار سے پکاری جائے گی۔ جو اس نے اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

المرقات واللمعات میں درج ذیل حدیث کی تشریح کے تحت مذکور ہے: يتبع الدجال من يهود اصفهان سبعون الفا وعليهم الطيالسة: اصفہان کے ستر ہزار یہودی دجال کی اتباع کریں گے جن کے جسم پر طیالسہ نامی کپڑا رہے گا۔ طیالسہ، طیلسان کی جمع ہے جو طالسان سے معرب ہے اور یہ مشہور و معروف کپڑے کا نام ہے۔

علامہ ابن قیم نے اس حدیث سے طیلسان کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ جو حضرت انسؓ سے مروی ہے۔

انه رای جماعة وعليه الطيلسان، فقال ما اشبه هولاء بيهود خيبر۔ حضرت انسؓ نے ایک جماعت کو دیکھا جن کے جسم پر طیلسان کپڑا تھا۔ اس پر آپؓ نے فرمایا: یہ تو خیبر کے یہودیوں کے ساتھ مشابہت ہے

اس کا جواب "فتح الباری" میں یہ مرقوم ہے ۔

طیلسان اس زمانہ میں یہودیوں کا شعار تھا۔ جس کی وجہ سے حضرت انس رضؓ نے اس کے استعمال سے منع کیا، پھر بعد کے دور میں یہ یہودیوں کا شعار نہ رہا اور اس کا استعمال عام ہوگیا تو یہ عمومی مباحات میں داخل ہوگیا۔

(فارسی فتوی از حضرت سید محمد قادری علیہ الرحمہ)

غرض مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوچکی کہ نوشاہ کی گل پوشی کا مسئلہ عادات اور مباحات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے حامیوں اور مخالفوں میں افراط وتفریط اور تشدّد اور غلو کا رویہ بہت ہی مضحکہ خیز ہے۔ ایک طرف نوشاہ کا مجلسِ نکاح میں پھول کے بغیر پہنچنے کو بدعت سے اجتناب اور سنّت کا احیاء تصور کیا جارہا ہے تو دوسری طرف پھولوں کے استعمال کو نکاح اور نکاح سے متعلق دیگر تقریبات کا لازمی حصّہ سمجھا جارہا ہے۔ اور اس قدر کثرت سے پھولوں کا استعمال ہورہا ہے کہ وہ اسراف و تبذیر کی حد کو چھونے لگا ہے۔ ایک فروعی اور جزوی اور مباح عمل میں طرفین کا یہ طرزِ عمل یقیناً اعتدال و توازن کی راہ سے ہٹا ہوا ہے ۔

ہندوستان کے باشندوں کی مشترک عادات واطوار میں ایک ٹوپی کا استعمال بھی ہے اور اس کے استعمال کے پیچھے شرافت واخلاق کا تصور پایا جاتا ہے۔ چناں چہ کسی شخص کی توہین و تذلیل کرنی ہو یا کسی شخص کو حکومت وسلطنت سے بے دخل کرنا ہو تو صرف اس کے سر سے ٹوپی اتار لینے کو کافی سمجھا جاتا ہے ۔ اردو زبان کا ایک مشہور محاورہ ہے "ٹوپی اتارنا" کسی کی بے عزتی اور توہین کرنا۔

ہندوستان کے بعض صوبوں مثلاً راجستھان، مہاراشٹر، گجرات، ہماچل وغیرہ میں ہندو ٹوپی استعمال کرتے ہیں اور بعض عمامہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ پنجاب اور راجستھان میں پگڑی کا چلن عام ہے۔ اور پگڑی سکھوں کی علامتِ خاص بن چکی ہے۔

ٹوپی کا استعمال صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی میں بلکہ دوسرے ممالک مثلاً افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ایران، مراکش، مصر اور لیبیا وغیرہ میں بھی ہے ہندوستان کے سارے صوبوں میں مسلمان موجود ہیں اور ان کی اکثریت اور بالخصوص نئی نسل ننگے سر رہنے سہنے کی عادی ہے۔ تاہم یہ برہنہ سر نوجوان بعض مواقع میں ٹوپی ضرور استعمال کرتے ہیں۔ چناں چہ مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لیے جائیں گے تو ان کے سروں پر ٹوپی ضرور آجاتی ہے۔ اسی طرح دینی مجلسوں میں شرکت کے لیے جائیں گے یا علماء ومشائخ سے ملاقات کے لیے پہنچیں گے یا بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دیں گے تو

اپنے سروں کو برہنہ رکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اگر ٹوپی نہ ہو تو دستی کرچیف سے اپنے سروں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس طرز عمل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے مقامات پر ننگے سر جانے کو ایک ناپسندیدہ عادت سمجھا جارہا ہے۔

ٹوپی کا استعمال ہندوستانی مسلمانوں کی عادات میں شامل ہونے کے علاوہ بھی اس کی شرعی حیثیت بھی ہے۔ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ عمامہ باندھنے کی تھی اور آپؐ کے عمامہ کے نیچے ٹوپی ہوا کرتی تھی اور آپؐ نے صحابہ کرام کو بھی ٹوپی کے اوپر عمامہ باندھنے کی ہدایت دی۔ اور ٹوپی کے بغیر عمامہ باندھنے سے منع فرمایا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کفار اور مشرکین کے اندر بھی عمامہ باندھنے کی عادت تھی، لیکن وہ عمامہ ٹوپی کے بغیر باندھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت اور تاکید سے ایک بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مشترک عادات میں مسلمانوں کو اپنے لیے کوئی امتیازی پہلو اختیار کرنا چاہئے جس سے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے درمیان شباہت اور یکسانیت ختم ہو جاے۔

حضرت ابی جعفر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **ان فرق مابیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس** (ترمذی) ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ٹوپی کے بغیر عمامہ باندھتے ہیں اور ہم ٹوپی کے اوپر عمامہ باندھتے ہیں۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر جہاں کہیں تشریف لے جاتے تو آپؐ کا سر مبارک برہنہ نہیں رہتا تھا چناں چہ نمازوں کی امامت کا موقعہ ہو یا مختلف مجلسوں میں شرکت کا موقعہ ہو سر مبارک پر عمامہ یا ٹوپی یا رومال ہوا کرتا تھا شاذ و نادر ہی سر مبارک کھلا رہا۔ مولانا سید منصور ندوی نے اپنے مختصر رسالہ "ٹوپی کی شرعی حیثیت" میں علامہ عبدالرحمٰن جوزی کی کتاب "الوفا بالحوال المصطفےٰ" سے پانچ احادیث نقل کی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف ٹوپیوں کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفید ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سر پر سفید شامی ٹوپی دیکھی تھی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم دورانِ سفر وہ ٹوپی استعمال فرماتے جو اوپر چڑھی ہوئی ہوتی تھی۔ یعنی شامی ٹوپی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تین ٹوپیاں تھیں۔ ایک

سفید رنگ کی مصری ٹوپی، دوسری یمنی چادروں کے کپڑوں سے بنی ہوئی اور تیسری کانوں تک کی ٹوپی جسے آپؐ سفر میں پہنا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا شرف حاصل کیا اور دیکھا کہ آپؐ کی تین ٹوپیاں ہیں۔ مصری، شامی اور کانوں تک پہننے والی ٹوپی۔

نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح حضرات صحابہؓ بھی ننگے سر رہنے سہنے، چلنے پھرنے اور بیٹھنے اٹھنے کے عادی نہ تھے۔ ان کی سیرت وسوانح کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز اور نماز کے علاوہ دیگر اوقات اور مجالس میں صحابہ کرامؓ کے سروں پر عمامے اور ٹوپیاں رہتی تھیں

امام ترمذی کی ایک روایت سے صحابہ کرام کی ٹوپیوں کی کیفیت اور نوعیت معلوم ہوتی ہے: کانت کمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطحا : یعنی صحابہ کرامؓ کی ٹوپیاں چوڑی ہوتی تھیں۔

دار قطنی کی روایت سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما کے سر پر ہمیشہ ٹوپی رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔: اذا مسح رأسہ رفع القلنسوۃ ومسح مقدم راسہ : جب بھی آپ وضو میں سر پر مسح کرتے تو ٹوپی نکالتے اور سر کے اگلے حصہ پر مسح کرتے تھے۔

صحابہ کرامؓ کے علاوہ تابعین، تبع تابعین، ائمۂ اربعہ، ائمہ مجتہدین، فقہاء و محدثین، علماء و مشائخین کی سیرتوں اور سوانح سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سبھی حضرات عمامے اور ٹوپیوں کے استعمال کے عادی تھے۔ ان کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تاریخ اسلام کے ہر دور میں مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں ٹوپیوں کے استعمال کی عادت جاری وساری رہی ہے۔ اور کسی بھی ملک کے سارے مسلمانوں نے عمومی طور پر ٹوپیوں کے استعمال کو ترک نہیں کیا ہے۔ جس سے ٹوپی کے استعمال میں تواتر و تسلسل اور اجماع کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے اور جس عمل سند سنتِ نبوی اور تعامل صحابہؓ کے علاوہ تواتر و تسلسل اور اجماع سے حاصل ہو جائے وہ مسلمانوں کے لیے حجت اور دلیل شرعی ہے۔

ٹوپی سے متعلق ایک مسئلہ یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت سر پر ٹوپی کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

سب سے پہلے یہ بات دیکھنی چاہیے کہ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس عمل کو التزام اور دوام کے ساتھ کیا ہے اور کس عمل کو التزام اور دوام کے ساتھ نہیں کیا ہے اور جس عمل کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس پر آپؐ نے مواظبت

اور مداومت اختیار کی ہے تو وہ ایسی سنّت متواترہ ہے جس کو ترک نہیں کیا جاسکتا اور جس عمل کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس پر آپؐ نے مواظبت اور مداومت اختیار نہیں کی اور وہ عمل صرف دو تین مرتبہ آپؐ سے صادر ہوا ہے تو ایسی سنّت یک بارہ یا دو بارہ ہے جس پر عمل تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس پر مداومت و مواظبت نہیں کی جاسکتی۔

نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز عمامہ کے ساتھ ادا فرماتے تھے اور اسی پر ساری زندگی عمل رہا۔ البتہ ایک دو مواقع ایسے بھی رہے کہ آپؐ نے ننگے سر نماز ادا فرمائی۔ اس عمل سے ننگے سر نماز پڑھنے کا صرف جواز ثابت ہو سکتا ہے، وجوب اور استمرار ثابت نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ جس عمل پر نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مواظبت و مداومت اختیار کی ہو وہ عمل دوام و استمرار کے ساتھ امّت کے لیے پیروی کا مستحق ہے اس عمل کے مقابلہ میں جس کا صدور بہت ہی کم ہو۔ لہذا نماز کا مسنون طریقہ یہی ہے کہ نمازی کے سارے جسم پر کپڑے ہوں۔ ایسا نہیں کہ صرف لنگی یا پاجامہ یا پتلون ہو اور سر ڈھکا ہوا ہو خواہ عمامہ سے ہو یا ٹوپی سے ہو یا کپڑے سے جیسے رومال دستی وغیرہ، ایسا نہیں کہ سر کھلا ہوا ہو، کیوں کہ مختلف احادیث سے واضح ہے کہ مسجد میں فرائض پنجگانہ کے ادا کرتے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سارا بدنِ مبارک کپڑوں سے ڈھکا رہا اور سرِ مبارک پر عمامہ یا ٹوپی یا رومال رہا۔ اور یہ عادتِ شریفہ دوام و استمرار کے ساتھ ثابت ہے۔

نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرامؓ کا عمل امت کے لیے حجت ہے۔ جن کی طاعت و پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم: میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں تم میں سے جس کسی نے بھی ان کی پیروی کی وہ ہدایت پائے گا۔ اور خصوصیت کے ساتھ خلفائے راشدین کے بارے میں فرمایا: علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین: تم پر لازمی ہے کہ میری سنّت کو اختیار کریں اور ہدایت یافتہ خلفاے راشدین کی سنت اختیار کریں۔ ان چار حضرات کرام کے راشدین ہونے پر ساری امّت کا اتفاق ہے۔ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہم ٹوپی کے مسئلہ میں صحابۂ کبار کرام کی عادت بھی وہی رہی ہے جو نبیؐ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تھی، جس کی تفصیل سیاق میں گزر چکی۔

امام ابو داؤد نے وائل بن حجر کی ایک روایت نقل کی ہے، رأیتہم یرفعون ایدیہم الی صدورہم فی افتتاح الصلوٰۃ وعلیہم برانس واکسیۃ: میں نے صحابۂ کرام کو دیکھا وہ نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھوں کو اپنے سینوں تک اٹھاتے ہیں اور ان کے جسموں پر چادریں اور ان کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔

اس روایت سے یہ دلیل قائم کی جا سکتی ہے کہ حضرات صحابہؓ ننگے سر نماز پڑھنے کے عادی نہ تھے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے علاوہ تابعین، ائمۂ اربعہ، علماء ومشائخ اور فقہاء ومحدثین کی عادت بھی ننگے سر نماز پڑھنے کی نہ تھی۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب "درمختار" میں یہ مسئلہ درج ہے کہ جو شخص ننگے سر نماز پڑھنے کو افضل اور سنت سمجھا اور نماز میں سر ڈھانکنے کو حقیر سمجھا تو کفر کیا۔

ہندوستان میں ٹوپی کے استعمال کو ادب وشائستگی کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کسی شخص کو نماز کی حالت میں برہنہ سر دیکھا جاتا ہے تو خواص وعوام سب معیوب تصور کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں صدیوں سے ٹوپیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کی عادت چلی آرہی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ ترک العادۃ عداوۃ عادت کی خلاف ورزی سے عداوت ونفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔

عرب ملکوں میں بھی صدیوں سے ٹوپیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کی عادت رہی ہے لیکن موجودہ دور میں یہ قدیم عادت تغیر اور تبدیلی کا شکار ہو چکی ہے اور وہاں کی نئی نسل میں ننگے سر نماز پڑھنے کی عادت چل پڑی ہے۔ اسی لیے وہاں کے معاشرہ میں ننگے سر نماز پڑھنے کو غیر شائستگی اور بے ادبی کے تناظر میں نہیں دیکھا جارہا ہے۔ اور برہنہ سر نماز پڑھنے کو وہاں معیوب تصور نہیں کیا جارہا ہے۔ عرب ممالک کے موجودہ عرف وعادت کے اعتبار سے وہاں ننگے سر نماز پڑھنے میں حرج نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کے عرف وعادات کے اعتبار سے ننگے سر نماز پڑھنے میں حرج ہے اور جو لوگ نماز برہنہ سر کی صحت پر عرب ممالک کی عادت سے استدلال کرتے ہیں وہ صحیح رُخ نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک شہر کی عادت اور عرف کو دوسرے شہر میں بھی مستحسن نظروں سے دیکھا جانا ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض شہروں میں مرد وعورت مزدوروں کا ستر کھلا رہتا ہے اور وہاں کے عرف وعادت میں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن یہی عادت بعض شہروں میں معیوب سمجھی جاتی ہے۔ عرف کی یہ مثال دنیوی امور سے متعلق ہے۔ دینی امور میں بھی شہروں کے عرف وعادات کے ساتھ یہی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی صورت پیش آنا ایک ناگزیر بات ہے۔ اس لیے حرج سے تحفظ کی صورت یہی ہے کہ ایک علاقہ کے عرف کو دوسرے علاقہ میں پھیلانے سے احتراز کیا جائے۔ بالخصوص جب کہ عرف اختلاف کا شکار ہو جائے۔

ممکن ہے کہ حامیانِ برہنہ سر یہ ارشاد فرمائیں ادب اور شائستگی کا یہ تصور خود ساختہ ہے خدا ساختہ نہیں۔ ٹوپی کے بغیر بھی تو نماز ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر یہ بات جان لینی چاہیے کہ رسم ورواج اور عادت وعرف خود ساختہ ہی ہوتے ہیں خدا ساختہ نہیں اور ایسے عرف کو افذ وقبول کے درجہ میں رکھا گیا ہے جو شریعت کے موافق اور قواعد شریعت کے مطابق ہو اور جو عرف شریعت مطہرہ کے خلاف ہو وہ رد کے قابل قرار دیا گیا ہے۔ اور رہ گئی بات کہ ٹوپی کے بغیر نماز ہو جاتی ہے، بلاشبہ یہ بات

اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔ نماز کی صحت کے معاملہ میں ایک ٹوپی ہی کیا بات ہے۔ قمیص اور لنگی و پتلون کے بغیر بھی صرف ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصّہ ڈھانک لینے سے نماز ہوجاتی ہے۔ لہٰذا حامیان برہنہ سر صرف اسی واجبی ستر کے ساتھ مساجد میں نماز ادا کرنے کی عادت بنالیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ بھی ایسی حالت کو غیر شائستہ اور نازیبا خیال کریں گے۔

حاصلِ کلام! برہنہ سر نماز کی ادائیگی کا مسئلہ کوئی اصولی اور بنیادی نہیں ہے کہ اس کی تردید میں زبان و قلم کی ساری توانائیاں صرف کی جائیں البتہ اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنے سے نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ متواترہ کی خلاف ورزی ہوگی اور حضرات صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، ائمہ مجتہدین، فقہاء محدثین، علماء اور مشائخ کے عمل تواتر کی خلاف ورزی ہوگی۔ لہٰذا ننگے سر نماز کی ادائیگی سے احتراز اور اجتناب کرنا چاہیئے۔ اور اگر کوئی شخص اللہ تعالےٰ کے حضور میں انتہائی عاجزی اور انکساری ظاہر کرنے کے لیے برہنہ سر نماز پڑھے تو کوئی شرعی قباحت نہیں ہے اور اس کیفیت کا تعلق نمازی کے قلب سے ہے: **واللہ یعلم ما فی الصدور**

اس مقام پر مولانا سید محب اللہ راشدی کا ایک بیان نقل کردینا فائدہ سے خالی نہیں جو ''الاعتصام'' لاہور ۱۹۹۳ء کی زینت بنا ہے۔

''احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر اوقات حضور نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سر پر عمامہ باندھے رہتے تھے یا سر پر ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ راقم الحروف کے علم کی حد تک سوائے حج اور عمرہ کے کوئی حدیث دیکھنے میں نہیں آئی جس میں یہ ہو کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ننگے سر گھومتے پھرتے تھے۔ یا کبھی سر مبارک پر عمامہ وغیرہ تھا لیکن مسجد آکر عمامہ اتار کر رکھ لیا اور ننگے سر نماز پڑھنی شروع کی۔

ہم نے بڑے بڑے علماء اور فضلاء وغیرہ کو دیکھا۔ وہ اکثر و بیشتر سر ڈھانپ کر چلتے پھرتے اور نماز پڑھتے۔ یہ آج کل نئی نسل خصوصاً اہل حدیث کے افراد نے جو یہ معمول بنا رکھا ہے اسے چلتے ہوئے فیشن کا اتباع تو کہا جاسکتا ہے مسنون نہیں ہے''

ہندوستانی مسلمانوں کے عرف و عادت میں سے ایک فاتحہ خوانی بھی ہے۔ کہ یہاں کے بعض شہروں میں نمازِ فجر کے بعد نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے اہل بیتؓ، آپؐ کے اصحابؓ اور جملہ مؤمنین اور مؤمنات کی ارواح پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اسی طرح محفل نکاح میں ایجاب و قبول کے بعد اور دکانات و مکانات کے افتتاح کے موقعہ پر اور کسی کارِ خیر کو

شروع کرنے کے وقت اور کسی کے انتقال کے بعد مخصوص ایام فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

اس عرف وعادت کی شکل یہ ہے کہ مجلس میں ایک شخص بلند آواز سے الفاتحہ کہتا ہے پھر اس کے بعد وہ اور حاضرین سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص تین مرتبہ تلاوت کرتے ہیں اور اس تلاوت کا ثواب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صحابہ اور صلحا و عامۃ المسلمین کی ارواح پر پہنچایا جاتا ہے اور اجتماعی دعا ہوتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس عرف وعادت سے متعلق دو مختلف اور متضاد مکتبۂ فکر وجود میں آچکے ہیں اور یہ عادت افراط و تفریط اور غلو و تعصب کا شکار ہو چکی ہے۔ اس عادت کی ابتداء مسلمانوں میں کب اور کہاں ہوئی اس کی صحیح نشان دہی ایک مشکل امر ہے۔ لیکن بعض ہندوستانی جید علماء اور صوفیاء کی تحریروں میں اس عرف و عادت سے متعلق مواد ملتا ہے۔ جس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ عادت ہندوستان میں بڑی قدیم اور پرانی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہ عادت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے ایک شعر میں فاتحہ کا ذکر موجود ہے۔ جو انھوں نے کسی بخیل کی موت پر دوسروں کو بخل سے دُور رکھنے کے لیے بطور عبرت اس کی مذمت میں فاتحہ نہ پڑھنے کی بات کہی ہے۔ ؎

دگر رفت و ایثار خیرش نماند   نشاید پس مرگش الحمد خواند

دوسرا شخص مرگیا اور اس کی بزرگی اور فیاضی باقی نہ رہی۔ لہذا ایسے بخیل کی موت پر فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔

بوستان کے مذکورہ شعر سے واضح ہے کہ حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے زمانہ میں کسی کے انتقال پر فاتحہ خوانی کی عادت رہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ساتویں صدی ہجری میں ایران میں فاتحہ خوانی کی عادت رائج تھی۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قطبؒ ویلور اور حضرت مولانا سید محمدؒ قادریؒ کی تحریروں کا خلاصہ پیش کیا جائے:

شریعت مطہرہ میں ضروریات اور حاجات کے موقع پر دعا کرنے کا حکم ہے اور دعا کے حکم میں عمومیت ہے اور ہمیشہ دعا کرنے کی تاکید ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عبادت کا مغز قرار دیا ہے: الدعا مخ العبادہ۔

حدیث شریف میں ہے: ان الدعا ینفع مما نزل ومما لم ینزل فعلیکم عبادہ اللہ بالدعا۔ دعا ہر چیز میں نفع بخش ہے۔ جو پیش آچکی ہے اور جو پیش نہیں آئی ہے۔ لہذا اے بندگانِ خدا تمہارے لیے ضروری ہے کہ ہر حالت میں دعا کرتے رہو۔

مشکوٰۃ کی حدیث ہے: قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الدعاھو العبادہ ثم قرأ۔

وقال ربکم ادعونی استجب لکم : نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت ہے پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی وقال ربکم ادعونی استجب لکم : تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

ابونعیم اور دیلمی نے حضرت ابوالدرداؓ سے روایت کی ہے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورۂ فاتحہ جس قدر نفع پہنچانے والی ہے اس قدر کوئی دوسری سورۃ نہیں ہے۔

عبدبن حمید نے اپنی مسند میں عبداللہ بن عباس سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ سورۂ فاتحہ ثواب میں قرآن کریم کے دوثلث (تین حصوں میں سے دو حصے) کے برابر ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ اپنی کتاب "تفسیر عزیزی" میں ابوالشیخ کی کتاب "الثواب" سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس کسی کو بھی کوئی ضرورت اور حاجت پیش آئے تو اس کو چاہیے کہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرے اور اپنی ضرورت پوری ہونے کے لیے اللہ تعالےٰ سے دعا مانگے۔ ان شاء اللہ اس کی حاجت پوری ہوجائے گی۔

"تفسیر عزیزی" میں ہے سورۂ اخلاص کو حدیث میں ثلث قرآن (قرآن کا تیسرا حصہ) قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کی تلاوت کو قرآن کریم کے ثلث حصہ کی تلاوت کے مساوی قرار دیا ہے۔

"زادالآخرت" میں ہے عبادات بدنیہ (نماز، روزہ، حج، ختم قرآن، تسبیح، استغفار، دعا) کا ثواب مُردوں کو پہنچایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح عبادات مالیہ (زر، چاندی، پارچہ، غلہ، کھانا اور دیگر اشیاء) کا ثواب مُردوں کو پہنچایا جاسکتا ہے اور اس مسئلہ میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ چناں چہ اس کی تفصیل "بحرالرائق"، "کنزالعباد" اور "مختارالفتاویٰ" میں ہے۔

نیز صاحبِ "زادالآخرت"، شرح برزخ اور کنزالعباد سے نقل کرتے ہیں کہ قبر کی آزمائش مومن متقی کے لیے سات روز ہے اور گناہ گار کے لیے چالیس روز ہے۔ لہٰذا میّت کے وارثوں کو چاہیے کہ تبلیغ ثواب کی نیت سے چالیس روز تک میّت کے لیے صدقہ وخیرات اور دعائے مغفرت کرتے رہیں۔

علامہ تفتازانی "شرحِ عقائد نسفی" میں لکھتے ہیں: وفی دعاء الاحیاء للاموات وصدقتھم : (صدقۃ الاحیاء) عنھم (ای عن الاموات) نفع لھم (ای للاموات) زندوں کی دعا اور صدقات میں مردوں کے لیے فائدہ ہے۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ "مدارج النبوۃ" کی جلد اول کے پانچویں باب میں لکھتے ہیں: مشہور از مذہب شافعی و مالک و جماعت از حنیفہ ایں است و کثیرے از شافعیہ و حنفیہ برآں اند کہ می رسد و ہمیں قائل است

امام احمد بن حنبل۔ قرآن کریم کی تلاوت کا ثواب میت کو پہنچنے کے مسئلہ میں امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور احناف کی بڑی جماعت متفق ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ نماز کے علاوہ اوقات میں بلند آواز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت افضل ہے اور فرض نماز کے بعد عظیم مہمات کے لیے اجتماعی حیثیت سے فاتحہ آہستہ پڑھنا یا بلند آواز کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے۔

اور مولانا قاضی بدیع الزماں کا موقف یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔

اور مولانا قاضی امام جلال الدین کا موقف یہ ہے کہ جس فرض نماز کے بعد سنّت (ظہر، مغرب اور عشاء) ہے تو اس میں فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے اور جس نماز کے بعد سنّت (فجر اور عصر) نہیں ہے اس میں فاتحہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ جیسا کہ "تاتارخانیہ" میں ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "الانتباہ فی سلاسل الاولیاء" میں ہے۔ فاتحہ پڑھا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے بیعت لی۔

"الانتباہ" میں ختم خواجگانِ چشت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

ختم خواجگان پورا کرنے کے بعد تھوڑی بہت شیرینی پر تمام بزرگوں کی ارواح طیبات پر فاتحہ پڑھیں اور اللہ تعالےٰ سے اپنی حاجت و ضرورت کی تکمیل کے لیے دعا کریں۔ اور اسی طرح ہر روز فاتحہ اور دعا کا اہتمام کریں۔

حضرت مجدد الف ثانی کے ختم میں بھی یہی معمول ہے۔

نمازِ جمعہ کے بعد دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے فرمایا کرتے تھے الفاتحہ علی حضرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابوبکر و عمرنا وعثماننا وعلینا رضی اللہ علیہم اجمعین۔ اس کے بعد فاتحہ پڑھتے اور حاضرین بھی اس سورۃ کے پڑھنے میں متابعت کرتے۔

حاصلِ کلام!

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مباح عمل اور کسی کارِ خیر کے شروع میں اور نمازوں کے بعد فاتحہ پڑھنا اور اجتماعی دعا کرنا درست ہے اور اموات کے لیے عباداتِ بدنی اور عباداتِ مالی کے ثواب کی تبلیغ بھی درست ہے البتہ اس عرف میں عدمِ صحت اور عدمِ جواز کا پہلو اس وقت نمایاں ہو جاتا ہے جب کہ تبلیغ ثواب کے طریقہ اور عمل میں کسی چیز کو لازم خیال کیا جائے اور اس پر ایسا دوام و استمرار اختیار کرلیں۔ اس کے چھوڑنے کو خطا اور گناہ خیال کیا جائے اور اوقات کے

تعین کو واجب اور تخصیص میں ثواب کی زیادتی خیال کیا جائے اور غیر شرعی افعال کو شامل کیا جائے۔ ورنہ مذکورہ اعمال اپنی ذات اور اصل کے اعتبار سے جائز ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ اس مسئلہ میں اختلاف اور انکار کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض اہلِ علم نے اس مسئلہ کو بدعت کے تناظر میں دیکھا۔ حالاں کہ یہ مسئلہ عادت وعرف کی قبیل سے ہے۔ عام طور پر اس قسم کے مسائل مصالح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پھر اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے عرف وعادات میں عرفِ عام بھی ہے اور عرفِ خاص بھی۔ چناں چہ ایک عرف حضرات صوفیاء کی جانب منسوب ہے اور یہ عرف، عرفِ عام میں عرس کے نام سے معروف ہے اور یہ عرف ہے بزرگان کرام کی ارواح پر ثواب کی تبلیغ کی نیت سے سالانہ فاتحہ کی مجلس کا انعقاد اور اہتمام کرنا۔

اہلِ علم نے اس عرف کی صحت وعدم صحت اور جواز عدم جواز سے متعلق بڑے دلائل قائم کئے ہیں۔ اس مقام پر طرفین کے آراء واقوال کا احاطہ اور محاکمہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ صوفیائے متقدمین میں سے صرف ایک بزرگ کی گفتگو یہاں نقل کی جارہی ہے۔ جو انھوں نے اپنے شیخ کے ساتھ کی تھی۔ اور اس گفتگو میں اس عرف کا صحیح تجزیہ ملتا ہے۔

العرف الذی شاع فی دیارنا فی حفظ اعراس المشائخ فی ایام وفاتھم اصل فان کان عندک علم بذلک فاذکرہ، قلت سألت عن ذلک شیخنا الامام عبدالوھاب المتقی المکی۔ فاجاب بان ذلک من طرق المشائخ وعاداتھم ولھم فی ذلک نیات۔ قلت کیف تعیین ذلک الیوم دون سائر الایام۔ فقال لم یکن فی زمن السلف شیٔ ذلک وانما ھو من مستحسنات المتاخرین واللہ اعلم

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام عبدالوہاب مکی سے پوچھا: ہمارے شہروں میں مشائخ کی وفات کے دن میں عرس کی تقریبات ہوا کرتی ہیں، اس عرف کے صحیح ہونے پر آپ کے نزدیک کوئی دلیل ہے؟ شیخ عبدالوہاب نے جواب دیا:

اس عرف وعادت کا تعلق مشائخ کرام کے عادات واطوار سے ہے اور اس میں ان کی نیتیں ہی اصل ہیں۔

شیخ عبدالحق نے پھر پوچھا: یوم کی تخصیص کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے؟ شیخ نے جواب دیا: آپ اس مسئلہ کو ایک مثال کی روشنی میں سمجھیے۔ ضیافت مطلق مسنون چیز ہے۔ ایام کی تخصیص سے قطع نظر ضیافت جب بھی کی جائے وہ اپنے عموم اور اطلاق کی بنا پر جائز ہے تخصیص کی وجہ سے ضیافت کو ناجائز نہیں کہہ سکتے۔

غرض یہ عرف خاص آج عرف عام میں تبدیل ہوچکا ہے اور اس کے مستحسن ہونے کی اصل وجہ وہ امور وافعال

ہیں جو اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً تلاوت قرآن، صدقات وخیرات، اجتماعی دعا، وعظ وتذکیر، ارواح کے لیے ثواب کی تبلیغ اور یہ وہ امور اور افعال ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے صحیح اور جائز ہیں۔ ان ہی اعمال وافعال کی شمولیت کی وجہ سے یہ عرف بھی صحیح قرار پایا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے عرف وعادت میں سے ایک عادت یہ بھی ہے کہ نماز فجر کے بعد اور سفر سے آنے کے بعد اور نماز عیدالفطر وعیدالاضحیٰ کے بعد اور خوشی ومسرت کی تقریبات میں مصافحہ کیا جاتا ہے اور عیدین کے موقعہ پر معانقہ کی بھی عادت ہے اور یہ عادت مسلم معاشرہ میں صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مصافحہ کا تعلق صرف عرف وعادت ہی سے نہیں بلکہ صحبت وہم نشینی کے عادات سے بھی ہے۔

ایک اچھے سماج کی علامت یہ کہ اس کے لوگوں کے درمیان ربط وضبط رہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مہر و وفا اور لطف ومہربانی سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑوں کو بزرگ خیال کریں اور ان کی تعظیم وتکریم کریں۔ اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومؤدت اور لطف ومحبت سے پیش آئیں اور ہر ایک دوسرے کے مراتب ودرجات کا پاس ولحاظ اور باہمی حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لیے اسلام نے سلام مصافحہ اور معانقہ کی طرح ڈالی۔ اگر لوگوں کے درمیان ان عادات کا چلن عام نہ ہو تو صحبت اور ہم نشینی کے مفید نتائج اور ثمرات بھی برآمد نہ ہوں گے اور باہمی خیرخواہی اور حسن سلوک کی فضا بھی قائم نہ ہوگی۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

تم لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ ایمان نہ لے آؤ اور جب تک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الفت نہ کروگے تو مومن نہیں ہوں گے۔ کیا تم کو ایسی چیز بتلادوں جس کو اپنانے سے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا ہو جائے گی؛ صحابۂ کرام نے عرض کیا، ضرور بتلائیے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے رہو۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ سلام سے الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مصافحہ سے بھی الفت ومحبت پیدا ہوتی ہے۔ مصافحہ کے تعلق سے بعض احادیث یہ ہیں:

عن البراء بن عازب قال قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم مامن مسلمین یلتقیان فیصافحان الاغفر لهما قبل ان یتفرقا۔ (ترمذی)

براء بن عازب کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان آپس میں ملیں اور مصافحہ کریں تو اُن کے جدا ہونے سے پہلے ہی ان کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ عن عطا الخراسانی عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال تصافحوا یذہب الغل وتہادوا تحابوا وتذہب الشحناء (رواہ مالک) عطاء خراسانی کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرو جس سے دلوں کا بغض اور کینہ دُور جائے گا اور ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو جس سے باہمی محبت والفت بڑھتی رہے گی اور دشمنی وعداوت ختم ہوجائے گی۔

عن ایوب بن بشیر عن رجل من عنزۃ انہ قال قلت لابی ذر ھل کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یصافحکم اذا لقیتموہ قال ما لقیتہ قط الا صافحنی وبعث الیّ ذات یوم ولم یکن فی اھلی فلما جئت اخبرت فأتیتہ وھو علی سریر فالتزمنی فکانت تلک اجود واجود۔ (ابوداؤد)

حضرت ایوب کا کہنا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم سے مصافحہ کرتے تھے تو حضرت ابوذر غفاریؓ نے کہا کہ میں جب بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے جاتا تو آپؐ مجھ سے مصافحہ فرماتے۔ ایک مرتبہ کی بات ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا میں اس وقت گھر پر نہ تھا۔ آنے کے بعد معلوم ہوا کہ مجھے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے طلب کیا تھا۔ میں فوراً آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ نے مجھ سے معانقہ فرمایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مجھے اپنے گلے سے لگالینا مصافحہ سے بھی زیادہ خیر وسعادت کا باعث تھا۔

مذکورہ احادیث سے مصافحہ اور معانقہ دونوں کا ثبوت فراہم ہورہا ہے۔ بارگاہِ نبویؐ میں صحابۂ کرامؓ کی آمدورفت اور مختلف مقامات پر نبی کریمؐ اور صحابۂ کرامؓ کا باہم ملنا اور حضرات صحابہؓ کا بھی آپس میں ملنا ایک لازمی امر ہے۔ اس سے یہ قیاس درست ہے کہ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ میں مصافحہ کا چلن رہا ہے۔ امام بخاری کی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحابۂ کرامؓ میں مصافحہ کا رواج تھا۔ حضرت قتادہؓ کا کہنا ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا مصافحہ کا رواج صحابۂ کرامؓ میں تھا؟ تو انھوں نے کہا: ہاں مصافحہ کا معمول صحابہ میں تھا: عن قتادۃ قال قلت لانس أکانت المصافحۃ فی اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال نعم

مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ

مصافحہ کرنے میں اور خوش آمدید کہنے میں اور باہر سے آنے والے کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کرنے میں یہ راز ہے کہ ان امور سے محبت اور الفت پیدا ہوتی ہے اور خوشی ومسرت میں اضافہ ہوتا ہے اور نفرت وعداوت اور وحشت واجنبیت دُور

ہو جاتی ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب "شامی" میں ہے:

اعلم ان المصافحة مستحبة عند کل لقاء واما ما اعتاده الناس من المصافحة بعد صلاة الصبح فلا اصل له فی الشرع علی هذا الوجه ولکن لاباس.

ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا مستحب ہے۔ نمازِ فجر کے بعد مصافحہ کرنے کی جو عادت ہے اس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

علامہ طحطاوی فرماتے ہیں: تستحب المصافحة بل هی سنّت عقیب الصلوٰة کلها وعند کل لقی: نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا اور ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سنّت ہے۔

مولانا ابوالبرکات رکن الدین محمد تراب علی لکھنوی نے "هدایة المنجدین الی مسائل العیدین" میں لکھا ہے کہ سفر سے آنے کے بعد یا اس کے بغیر بھی جب مصافحہ اور معانقہ مسنون ہے تو عیدین کے موقعہ پر مصافحہ اور معانقہ جائز ہے جیسا کہ ہندوستان کے شہروں میں اس کی عادت ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں:

اصلش جائز است وخصوصیت وقت بدعت مانند مصافحہ بعد العصر کہ در ملک توران وغیرہ رائج است۔ یعنی مصافحہ اپنی اصل کے اعتبار سے سنّت ہے اور وقت کی تخصیص کے اعتبار سے بدعت ہے۔ جیسا کہ توران اور دیگر ممالک میں بعدِ نماز عصر مصافحہ کرنے کی عادت ہے۔

مولانا احمد سعید مجددی فرماتے ہیں:

جس چیز کی خوبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گئی ہو اس کی خوبی وقت اور روز کی تخصیص سے زائل نہ ہو گی۔ چناں چہ در المختار میں مرقوم ہے: المصافحة حسنه ولو بعد العصر والفجر: مصافحہ کرنا اچھی چیز ہے عصر اور فجر کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا شیخ آدم ویلوری، مفتی مدرسہ باقیات ویلور اپنے فتاوی میں رقم طراز ہیں:

مصافحہ عند اللقاء (دو آدمی ملتے وقت) سنّت ہے۔ وہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ مؤمنوں کے مابین کی شکر رنجی اور عداوت کو دُور کرنے والا ہے اور بعد نماز عید یا بعد نماز جمعہ یا بعد نماز صبح وغیرہ میں مصافحہ کرنے کی جو عادت ہے

اگر اس کو سنّت یا واجب ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں تو اوقاتِ مذکورہ میں مصافحہ کرنا منع نہیں ہے۔ مباح اور جائز ہے۔

ہاں! اس کو لازم اور واجب سمجھنا بُرا ہے۔ اسی طرح اس کو حرام سمجھنا بھی خطا اور غلط ہے۔

سیاق میں مصافحہ کے بارے میں یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ بعض فقہائے کرام نے مخصوص اوقات میں مصافحہ کو بدعت کہا ہے تو اس سے ان کی مراد بدعتِ حسنہ ہے نہ کہ بدعتِ سیّئہ۔

مصافحہ کرنا ممنوع اور ناجائز بھی ہے اور اس عدم جواز کا تعلق بعض احوال اور اوقات سے ہے۔ جیسے کوئی شخص کھا پی رہا ہے یا کوئی شخص محوِ خواب ہے، کوئی ذکر و تلاوت میں مشغول ہے یا کوئی رفعِ حاجت کے لیے جا رہا ہے، کوئی استنجا کر رہا ہے، کوئی سواری پر ہے تو ایسے مواقع اور حالات میں مصافحہ کرنا منع ہے۔ غرض کہ مصافحہ سے کسی شخص کو کسی طرح کی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے تو مصافحہ سے احتراز کرنا چاہیے۔ اسی لیے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ مخصوص اوقات و احوال میں مصافحہ اس وقت ممنوع ہوگا جب کہ کوئی شرعی یا طبعی ممانعت پائی جائے۔

موجودہ زمانہ میں مصافحہ کے عجیب و غریب انداز دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ کا مسنون طریقہ بھی بیان کر دیا جائے۔

مصافحہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے کیا جائے۔ صرف انگلیوں سے چھونے کا نام مصافحہ نہیں ہے۔ مصافحہ کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک کا ایک ہاتھ دوسرے کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ہو۔

اور ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنا داہنا ہاتھ دوسرے کے داہنے ہاتھ اور بایاں، بائیں سے ملائے اور انگوٹھے کو ہلکا سے دبائے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انگوٹھے میں ایک رگ ہے، جس کے دبانے سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

بعض حضرات صرف ایک ہاتھ مصافحہ کرنے کے عادی ہیں۔ ممکن ہو ان کے نزدیک کوئی دلیل ہو۔ بھلے سے وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں تواضع کی کیفیت نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ بزرگوں سے مصافحہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں مصافحہ کا یہ طریقہ انگریزوں کے ہاتھ ملانے سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس مماثلت کی بنا پر یہ طریقہ چھوڑ دینا چاہیے؛

غرض اس مسئلہ میں یہ اصولی بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مصافحہ کا حکم مطلق ہے۔ فقہ میں مطلق سے مقید کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں پھر ایسی صورت میں اوقاتِ مخصوصہ میں مصافحہ کرنے کو بدعت یا حرام کہہ دینا ایک غیر علمی اور غیر سنجیدہ موقف ہے۔ بے شک بدعات سے اجتناب اور ان کا انسداد نہایت ضروری ہے۔ لیکن بدعات

میں بھی فرق و امتیاز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ کسی نئے عمل و فعل کا وجود میں آنا کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو قیامت تک غیر محدود ہے۔ اس لیے بہتر موقف یہی ہے کہ ہر نئے فعل و عمل سے متعلق جمہور کا موقف اختیار کرنا چاہیے جن کے نزدیک ہر وہ عمل قابلِ قبول ہے جس میں حسنات کا پہلو ہے۔ اور ہر وہ عمل رد کے قابل ہے جس میں سیئات کا پہلو ہے۔

علامہ جزری "النہایہ" میں لکھا ہے:

البدعة بدعتان، بدعة هدىً و بدعة ضلالة. فما كان فى خلاف ما امر الله به و رسوله فهو فى خير الذم و ما كان واقعاً تحت عموم ماندب الله اليه وحض عليه ورسوله فهو خيز المدح:

بدعت دو ہے۔ ایک حسنہ، دوسری سیئہ۔ اللہ اس کے رسول نے جو حکم دیا ہے اس کے خلاف جو بھی نیا عمل اور فعل ہوگا' وہ مذمت ہے اور قبول کے قابل نہیں اور جس چیز کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے رغبت دلائی اس عموم میں جو بھی نیا عمل اور فعل ہوگا وہ مدح کے مقام میں ہے اور قبول کے قابل ہے۔

اس مقام پر شاید کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو جائے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو گمراہ کہہ دیا ہے تو بھلا بدعات میں حسنات کا پہلو کیوں کر ہو سکتا ہے تو اس سلسلہ میں یہ عرض ہے:

کل بدعة ضلالة کی حدیث عام ہے۔ جس میں بعض مستثنیٰ ہیں اور ان عمومات میں استثناء دلیلِ شرعیہ یا عقلیہ کے ذریعہ سے ہے۔ جو شریعتِ مطہرہ میں مشہور ہے اور اصول کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔ لہٰذا حدیثِ مذکور کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر وہ بدعت جو سئیہ ہے وہ گمراہی اور ضلالت ہے اور اس میں استثنا کرنے والی حدیث یہ ہے:

جو شخص اسلام میں کوئی مفید طریقہ جاری کرے گا اُس کو اس کا ثواب ملے گا اور ان لوگوں کا ثواب بھی جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی ہو۔ اور جو شخص دین میں کوئی مضر اور بُرا طریقہ جاری کرے گا، اُس پر اس کا گناہ ہوگا اور اُن لوگوں کا گناہ بھی جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے عذاب میں کوئی کمی ہو۔

شارحِ مسلم امام نووی حدیث کل بدعة ضلالة کے بارے میں فرماتے ہیں:

کل بدعة ضلالة عام مخصوص والمراد غالب البدع: ہر بدعت گمراہی ہے یہ حدیث عام مخصوص ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اکثر بدعات گمراہی اور ضلالت کا سبب بن جاتی ہیں۔

حاصلِ کلام!

پچھلے صفحات میں ہندوستان میں پھیلی ہوی بعض عادات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان میں پھیلی ہوی عادات ہوں یا دوسرے اسلامی ملکوں میں پھیلی ہوی عادات ہوں، ان کے درمیان یکسانیت اور مماثلت ہونا ضروری نہیں ہے اور دونوں جگہ مستحسن ہونا بھی ضروری نہیں ہے، چناں چہ ایک ہی عرف ایک خطہ میں مستحسن نظروں سے دیکھا جاتا ہے تو دوسرے خطہ میں وہی عرف مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ جیسے ٹوپی کے بغیر نماز کا مسئلہ ہے عرب ممالک میں ننگے سر نماز پڑھنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں ننگے سر نماز پڑھنے اور دینی مجلسوں میں ننگے سر شریک ہونے کو معیوب تصوّر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں ننگے سر نماز پڑھنے کے لیے عرب ممالک کی عادت کو بطور مثال نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس لیے ہر علاقہ کے عرف کو اسی علاقہ کے باشندوں کے لیے موزوں سمجھنا چاہیے اور ایک علاقہ کے عرف کو دوسرے علاقہ کے لیے دلیل اور حجت نہیں سمجھنا چاہیے۔

ہندوستان میں بزرگوں کی وفات پر اعراس، فاتحہ خوانی، تبلیغ ثواب، اوقاتِ مخصوصہ میں مصافحہ، شادی، بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبات میں پھولوں کے استعمال کی عادت ہے اور یہ عادات پسندیدہ بھی ہیں۔ لیکن اسلامی ملکوں کے باشندے ان عادات سے غیر مانوس اور ناآشنا ہیں۔ البتہ وہاں مصافحہ اور معانقہ مختلف شکلوں میں ہے اور اس کے اندر یکسانیت اور مماثلت نہیں ہے۔ سعودی عرب میں امراء، وزراء و علماء، زائرین حرم اور مسافرین خادم الحرمین سے فرمانروائے مملکت شاہ عبداللہ آل سعود ملتے وقت ان کے سیدھے ہاتھ کو بوسہ دینے کے عادی ہیں اور دست بوسی کی یہی عادت مراکش، الجزائر، المغرب وغیرہ میں بھی رائج ہے۔

عرف و عادت اور نئے عمل کے دائرہ میں میلاد النبیؐ کا مسئلہ بھی ہے۔ جو ممالکِ عربیہ میں متروک اور بدعتِ سئیہ کے خانہ میں رکھا گیا ہے۔ اور یہی عرف و عادت اور نیا عمل ہمارے ملک ہندوستان میں عملِ مستحسن اور بدعتِ حسنہ کے خانہ میں رکھا گیا ہے اور ہمارے ہاں یہ عادت مستحسن قرار پانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ میلاد کا عمل یہاں صدیوں سے رائج ہے اور علماء و صوفیاء کی اکثریت کا معمول رہا ہے اور عوام و خواص کا یہ عمل جس کے متعلق نص نہ ہونے کی وجہ سے اور ائمۂ اربعہ میں سے کسی مجتہد کا انکار ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اور یہ عمل تواتر اور تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہنے کی وجہ سے موافق شرعِ شریف سمجھا گیا ہے۔ ما راٰہ المؤمنون حسنا فھو حسن، مومن جس عمل کو اچھا سمجھے وہ اچھا ہے اور اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں یہ عمل نہ رہنے کی وجہ بدعت حسنہ سمجھا گیا۔ یہی وہ پہلو ہیں

جن کی روشنی میں میلاد النبیؐ کے عمل کو ہندوستان میں جواز کا درجہ دیا گیا۔ لیکن ممالک عربیہ میں یہ پہلو سامنے نہ آسکے اور کل بدعۃ ضلالۃ کے پیش نظر میلاد النبیؐ کے عمل کو وہاں عدم جواز کا درجہ دیا گیا۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ ایک ہی عرف دو جگہوں میں متضاد حیثیت اختیار کر گیا۔

عرف حالات کے تابع ہے اس لئے عرف کا ہر دور اور ہر زمانہ میں ایک ہی حالت میں رہنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی عرف ایک زمانے میں عرف صحیح کی حیثیت رکھتا ہے تو وہی عرف بعد کے ادوار میں عرف فاسد قرار پاتا ہے اور اس کے برعکس صورت بھی ممکن ہے۔ جیسے پھولوں کے ہار کا استعمال قدیم زمانہ میں ہندو قوم کا شعار تھا اور جب ان کا شعار نہ رہا اور اس میں عمومیت پیدا ہوگئی اور تشابہ کی کیفیت ختم ہوگئی تو یہ عادت، عرف صحیح کے دائرہ میں آگئی۔ اسی طرح طیلسان کپڑا کبھی نصاریٰ کا شعار تھا، پھر ان کا یہ شعار باقی نہ رہا تو خصوصیت ختم ہوگئی اور عمومیت کے باعث یہ چیز، عرف صحیح کے دائرہ میں آگئی۔

غرض مختلف عادات وافعال اور عرف میں جو بات بنیادی طور پر ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی عرف اور عادت اور فعل قرآن وحدیث اور سنّتِ صحابہ اور اجماع سے متصادم ہوجائے تو اس عرف وعادت کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ ترک کرنے کے قابل ہے۔ جیساکہ کسی مستحب فعل میں غیر شرعی امور جمع ہوجائیں تو اس فعل کا استحباب باقی نہیں رہتا اور وہ فعلِ مستحبؔ فعل متروک قرار پاتا ہے۔

اس مقام پر قدرے یہ تفصیل بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سیاق میں جو امور اور مسائل زیر بحث آئے ہیں وہ جزوی و فروعی نوعیت کے حامل تھے اور یہ کفر وایمان کے مسائل نہیں ہیں کہ تائید اور تردید کی صورت میں جانبین سے ایک دوسرے کی تکفیر وتضلیل کی جائے۔ ان مسائل میں علماء وفقہاء کی ہمیشہ سے دو رائیں رہی ہیں اور جن مسائل میں اختلاف ہوجائے تو ان میں ایک ہی جانب کو حق قرار دینا اور دوسرے جانب کو باطل قرار دینا یہ ایک غیر علمی موقف ہے۔ اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے پر لعن طعن اور طنز وتعریض نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ طرفین میں سے ہر ایک بھی کسی دلیل ہی کے تحت اس مسئلہ کو اختیار کئے ہوں گے بھلے ہی وہ دلیل ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ایک کی دلیل راجح ہو تو دوسرے کو گمراہ نہیں کہنا چاہیے اور اختلافی مسائل میں افراط وتفریط غلو وتشدد اور تعصب ایک مذموم اور ناپسندیدہ طرز فکر ہے۔ جس سے ہر ایک کو اجتناب کرنا چاہیے۔ اور ہمیشہ توسط واحتیاط اور توازن واعتدال کی راہ پر گامزن رہنا چاہیے۔ ہاں! ان مسائل میں سکوت اور تائید کا پہلو اختیار نہیں کرنا چاہیے جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ سے متصادم ہیں اور بنیادی اصول و عقائد میں اختلاف نظر آرہا ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

وما علینا الا البلاغ

مولوی قاری یم، بی شیخ فضل اللہ لطیفی۔ ایم اے، استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان۔ ویلور

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

رویت ہلال کا مسئلہ رمضان المبارک کے ساتھ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے بخاری و مسلم کی حدیث ہے: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاتصوموا حتی تروا الھلال ولا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاقدروا لہ وفی روایۃ قال الشھر تسع وعشرون لیلۃ فلاتصوموا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلثین۔

یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو اور جب تک چاند نہ دیکھ لو افطار نہ کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس ۳۰ دن کی مقدار پوری کرلو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مہینہ کبھی انتیس ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ پس جب تک چاند نہ دیکھ لو روزہ نہ رکھو اور اگر تمہارے سامنے ابر یا غبار ہوجائے تو تیس ۳۰ دن کی گنتی پوری کرلو۔

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں: "قول منجمین نامقبول و نامعتبر ست در شرع و اعتماد بر آں نتواں کرد و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و اصحاب و اتباع رضی اللہ تعالیٰ عنہم و سلف و خلف رحمۃ اللہ علیہم بداں عمل ننمودہ اند و اعتبار نکردہ اند" یعنی شرع میں نجومیوں کا قول نامقبول و غیر معتبر ہے اس پر بھروسہ نہیں کرسکتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نیز سلف و خلف رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر عمل نہیں کیا اور نہ اعتبار فرمایا۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلثین۔ یعنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم

نے فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھنا شروع کرو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور اگر ابر ہو تو شعبان کی گنتی تیس ۳۰ پوری کرلو۔

عن ابن عباس قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی رایت الھلال یعنی ھلال رمضان فقال اتشھدان لا الہ الا اللہ قال نعم۔ قال اتشھدان محمدا رسول اللہ قال نعم قال یابلال اذن فی الناس ان یصوموا غدا۔

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک اعرابی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے عرض کیا ہاں! فرمایا: کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں! اس نے کہا۔ ہاں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے بلال! لوگوں میں اعلان کردو کہ کل روزہ رکھیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ " درایں حدیث دلیل ست برآن کہ یک مرد مستور الحال یعنی آن کہ فسق او معلوم نہ باشد مقبول ست خبرِ وے درماہ رمضان و شرط نیست لفظ شہادت "۔ یعنی اس حدیث شریف سے ثابت ہوا کہ ایک مردِ مستور الحال یعنی جس کا فاسق ہونا ظاہر نہ ہو۔ اس کی خبر ماہِ رمضان میں مقبول ہے اور لفظ شہادت کی شرط نہیں۔

چاند کے ثبوت ہونے کی چند صورتیں ہیں:

اوّل: چاند کی خبر:۔ ۲۹ر شعبان کو مطلع صاف نہ ہو تو ایک مسلمان مرد یا عورت، عادل یا مستور الحال کی، خبر سے رمضان المبارک کا چاند ثابت ہو جائے گا اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں باوصاف مذکورہ ایک شخص کا آبادی سے باہر کھلے میدان میں یا بلند مکان پر دیکھنا کافی ہے۔ ورنہ ایک کثیر جماعت چاہیے جو اپنی آنکھوں سے چاند کا دیکھنا بیان کرے۔ باقی گیارہ مہینوں کے چاند کے لیے مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں دو عادل کی گواہی ضروری ہے اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں اتنی بڑی جماعت درکار ہے جس کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً مشکل ہے۔ درمختار مع ردالمحتار جلد دوم میں ہے: قبل بلا دعوی وبلا لفظ اشھد وحکم ومجلس قضاء للصوم مع علۃ کغیم وغبار خبر عادل اومستور الفاسق اتفاقاً ملخصا۔ پھر اسی بحث کے چند صفحوں بعد ہے: قبل بلا علۃ جمع عظیم یقع العلم الشرعی وھو غلبۃ الظن بخبرھم۔ وصحح فی الاقضیۃ الاکتفاء بواحد ان جاء من خارج البلد اوکان علی مکان مرتفع واختارہ ظہیر الدین۔

بحر الرائق جلد دوم میں ہے: اما فی الھلال الفطر والاضحیٰ وغیرھما من الاھلۃ فانہ لایقبل فیھا الا شھادۃ رجلین اورجل وامرأتین عدول احرار غیر محدودین کما فی سائر الاحکام۔

دوم شہادۃ علی الشہادۃ: یعنی گواہوں نے چاند خود نہ دیکھا بلکہ دیکھنے والوں نے ان کے سامنے گواہی دی اور اپنی گواہی پر انہیں گواہ کیا تو اس طرح بھی چاند کا ثبوت ہوجاتا ہے، جب کہ گواہانِ اصل حاضری سے معذور ہوں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ گواہانِ اصل میں سے ہر ایک دو آدمیوں سے کہیں کہ میری اس گواہی پر گواہ ہو جاؤ کہ میں نے فلاں سنہ کے فلاں مہینے کا چاند فلاں دن کی شام دیکھا۔ پھر ان گواہانِ فرع میں سے ہر ایک آکر یوں شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے مجھے اپنی اس گواہی پر گواہ کیا کہ انہوں نے فلاں سنہ کے فلاں مہینہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھا اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میری اس گواہی پر گواہ ہو جاؤ۔

درمختار مع ردالمحتار جلد چہارم میں ہے: الشھادۃ علی الشھادۃ مقبولۃ وان کثرت استحسانا۔

فتاوی عالمگیری، جلد سوم میں ہے: ینبغی ان یذکر الفرع اسم الشاھد الاصل واسم ابیہ وجدہ حتی لو ترک ذلک فالقاضی لا یقبل شھادتھما۔

سوم: شہادۃ علی القضا: یعنی کسی دوسرے شہر میں قاضیٔ شرع یا مفتی کے سامنے چاند ہونے پر شہادتیں گزریں اور اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اس گواہی اور حکم کے وقت دو شاہد عادل دار القضا میں موجود تھے انہوں نے یہاں آکر مفتی کے سامنے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے فلاں مفتی کے پاس گواہیاں گزریں کہ فلاں ہلال کی رویت فلاں دن کی شام کو ہوئی ہے اور مفتی نے ان گواہیوں پر ثبوت ہلال فلاں روز کا حکم دیا اس طرح بھی چاند کا ثبوت ہوجاتا ہے۔

فتح القدیر، جلد دوم میں ہے: لوشھدوا ان قاضی بلدۃ کذا شھد عندہ اثنان برویۃ الھلال فی لیلۃ کذا وقضی شھادتھما جاز لھذا القاضی ان یحکم بشھادتھما لان قضاء القاضی حجۃ وقد شھدوا بہ وکذا فی شرح الکنز وکذا فتاوی امام الغزی

چہارم استفاضہ یعنی جس اسلامی شہر میں مفتی اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ روزہ اور عیدین کے احکام اسی کے فتوی سے نافذ ہوتے ہوں۔ عوام خود عید و رمضان نہ ٹھہرا لیتے ہوں وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب بیک وقت خبر دیں کہ وہاں فلاں دن چاند دیکھ کر روزہ ہوا یا عید کی گئی تو اس طرح بھی چاند کا ثبوت ہوجاتا ہے۔

درمختار، بحث رویت ہلال میں ہے: لو استفاض الخبر فی البلدۃ الاخری لزمھم علی الصحیح من المذھب

اگر صرف بازاری افواہ اڑ جائے اور کہنے والے کا پتہ نہ ہو پوچھنے پر جواب ملے کہ سنا ہے یا لوگ کہتے ہیں تو ایسی خبر ہرگز استفاضہ نہیں، نیز ایسا شہر کہ جہاں کوئی مفتی اسلام نہ ہو یا ہو مگر نا اہل ہو یا محقق اور معتمد ہو مگر وہاں کے عوام جب چاہتے ہیں عید اور

رمضان خود مقرر کرلیتے ہیں جیسا کہ آج کل عام طور پر ہو رہا ہے تو ایسے شہروں کی شہرت بلکہ تواتر بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

شامی، جلد دوم میں ہے: قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتی من تلك البلدة جماعات متعددون كل منهم يخبر عن تلك البلدة انهم صاموا عن روية لا مجرد الشيوع من غير علم بمن شاعة كما قد تشيع اخبار يتحدث بها سائر اهل البلدة ولا يعلم من اشاعها كم وردان فی اخر الزمان يجلس الشيطان بين الجماعة فيتكلم بالكلمة فيتحدثون بها و يقولون لا ندرى من قالها فمثل هذا لا ينبغى ان يسمع فضلا عن ان يثبت به حكم قلت وهو كلام حسن اور ایسا ہی فتاویٰ رضویہ جلد چہارم میں بھی ہے۔

پنجم اکمالِ عدت یعنی جب ایک مہینہ کے تیس۳۰ دن پورے ہوجائیں تو دوسرے مہینہ کا چاند ثابت ہوجائے گا۔ لیکن اگر ایک گواہ کی شہادت پر رمضان کا چاند مان لیا گیا اور اس حساب سے تیس۳۰ دن پورے ہوگئے مگر مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہیں آیا تو یہ اکمالِ عدت کافی نہیں بلکہ ایک روزہ اور رکھنا پڑے گا۔

درمختار مع رد المحتار، جلد دوم میں: بعد صوم ثلثين بقول عدلين حل الفطرة بقول عدل لا۔ لكن نقل ابن الكمال عن الذخيرة ان غم هلال الفطر حل اتفاقا: ملخصا۔

اگر چاند شرعی طریقہ سے ثابت ہوجائے تو اہلِ مغرب کا دیکھنا اہلِ مشرق کے لیے لازم ہوگا۔ جیسا کہ فتاویٰ الامام الغزی میں ہے: يلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب على ما هو ظاهر الرواية عليه الفتوى كما فی فتح القدير والخلاصة۔

جہاں سلطان اسلام اور قاضی شرع کوئی نہ ہو تو شہر کا سب سے بڑا مفتی اس کا قائم مقام ہے اور جہاں کوئی مفتی نہ ہو تو عامہ مؤمنین کے سامنے چاند کی گواہی دی جائے گی (فتاویٰ رضویہ: جلد چہارم)

حضرت علامہ عبد الغنی قدس سرہٗ اپنی تصنیفِ لطیف حدیقۂ ندیہ میں تحریر فرماتے ہیں: اذا خلا الزمان من سلطان ذی كفاية فالامور موكلة الى العلماء ويلزم الامة المرجوع اليهم ويصيرون ولاة فاذا عسر جمعهم على واحد استقل كل قطر باتباع علمائه فان كثروا فالمتبع اعلمهم فان استووا اقرع بينهم۔ یعنی جب زمانہ ایسے سلطان سے خالی ہو جو معاملاتِ شرعیہ میں کفایت کرسکے تو سب شرعی کام علماء کے سپرد ہوں گے اور تمام معاملاتِ شرعیہ میں ان کی طرف رجوع کرنا مسلمانوں پر لازم ہوگا۔ وہی علماء قاضی و حاکم سمجھے جائیں گے۔ پھر اگر سب مسلمانوں کا ایک عالم پر اتفاق مشکل ہو تو ہر ضلع کے لوگ اپنے علماء کی اتباع کریں۔ پھر اگر ضلع میں عالم بہت زیادہ ہوں تو جو اُن میں سب سے زیادہ احکامِ شرع

جانتا ہو اُس کی پیروی ہوگی اور اگر علم میں برابر ہوں تو ان میں قرعہ ڈالا جائے گا۔

چاند دیکھ کر اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔ اگرچہ دوسرے کو بتلانے کے لیے ہو۔ (بہارِ شریعت)

درمختار میں ہے: اذا راؤ الھلال یکرہ ان یشیروا الیہ، یعنی چاند دیکھ کر اس کی طرف اشارہ کرنا مکروہ ہے۔

شہنشاہ ہند اورنگ زیب اپنی تصنیفِ لطیف فتاویٰ عالمگیری، جلد اول میں رقمطراز ہیں کہ: تکرہ الاشارۃ عند رویتہ الھلال کذا فی الظھیریۃ: یعنی چاند دیکھ کر اشارہ کرنا مکروہ ہے۔ ایسا ہی ظہیریہ میں ہے۔

مسلمانوں کو اپنے معاملات میں عربی اسلامی تاریخ وسنہ کا اعتبار کرنا واجب ہے۔ دوسری تاریخ وسنہ کا اعتبار کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب تفسیر کبیر، جلد چہارم میں فرماتے ہیں: قال اھل العلم الواجب علی المسلمین بحکم ھذہ الآیۃ: ان عدۃ الشھور عند اللہ اثناء عشر شھرا" ان یعتبروا فی بیوعھم ومدردیونھم واحوال زکواتھم وسائر احکامھم السنۃ العربیۃ بالاھلۃ ولا یجوز لھم اعتبار السنۃ العجمیۃ والرومیۃ۔

جنتری

سے چاند کا ثبوت ہرگز نہ ہوگا۔ درمختار میں ہے۔ لاعبرۃ بقول الموقتین ولو عدولا علی المذھب۔

شامی، جلد دوم میں ہے: لا یعتبر قولھم بالاجماع ولا یجوز للمنجم ان یعمل بحساب نفسہ۔

اخبار

اخبار سے بھی چاند کا ثبوت ہرگز نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اخباری خبریں بسا اوقات گپ نکلتی ہیں۔ اور خبر صحیح ہو تو بھی بغیر ثبوت شرعی کے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

ردالمحتار، جلد دوم میں ہے: فانھم لا یشھدوا بالرویۃ ولا علی شھادۃ غیرھم وانما حکوا رویۃ غیرھم کذا فی فتح القدیر۔

خط

خط سے بھی چاند کا ثبوت نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ایک تحریر دوسری تحریر سے مل جاتی ہے۔ لہٰذا اس سے علم یقینی حاصل نہ ہوگا جیسا کہ ھدایہ میں ہے: الخط یشبہ الخط فلا یعتبر۔

درمختار میں ہے: لا یعمل بالخط۔

تار اور ٹیلیفون

تار اور ٹیلیفون بے اعتباری میں خط سے بڑھ کر ہیں۔ اس لیے کہ خط میں کم از کم کاتب کے ہاتھ کی علامت ہوتی ہے۔ تار اور ٹیلیفون میں وہ بھی مفقود۔ نیز جب گواہ پردے کے پیچھے ہوتا ہے تو گواہی

معتبر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ایک آواز سے دوسری آواز مل جاتی ہے تو تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ گواہی کیسے معتبر ہو سکتی ہے
شہنشاہ ہند اورنگ زیب 'فتاویٰ عالمگیری' جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں: لوسمع من وراء الحجاب لا یسعہ ان یشھد لاحتمال ان یکون غیرہ اذا النغمۃ تشبہ النغمۃ۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن

ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں تار اور ٹیلی فون سے زیادہ دشواریاں ہیں الغرض کہ یہ نئے آلات خبر پہنچانے میں کام آسکتے ہیں۔ لیکن شہادتوں میں معتبر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ خط۔ تار۔ ٹیلی فون، ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کی خبروں پر کچہریوں کے مقدموں کا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ گواہوں کو حاضر ہو کر گواہی دینی پڑتی ہے پھر فیصلہ ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ جب دنیاوی جھگڑوں میں موجودہ کچہریوں کا قانون ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ گواہی ماننے کو تیار نہیں تو پھر دینی امور میں شریعت کا قانون ان کے ذریعہ گواہی کیوں کر مان سکتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی اوپر گزر چکا ہے کہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلثین: یعنی اگر چاند مشتبہ ہو جائے تو تیس ۳۰ دن کی گنتی پوری کرو۔ (بخاری و مسلم)۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ کے بہت سے مسلمان ان میں اکثر بے نمازی و بے روزہ دار ہوتے ہیں۔ ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ کی خبر پر ایک ہنگامہ کھڑا کر کے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

خدائے تعالےٰ ان ناسمجھ مسلمانوں کو اپنے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی پر عمل کی توفیق عطا فرمائے
آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیھم اجمعین ▲▲▲

جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اس کو اس (کے مقتضا) سے بہتر (بدلہ) ملے گا (کیونکہ نیک عمل کا اصل مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اس کی حیثیت کے موافق عوض ملے مگر وہاں اس سے زیادہ دیا جائے گا جس کا کم سے کم درجہ اس کی حیثیت سے دس گنا ہے) اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے۔ (سورہ قصص)

ڈاکٹر جاوید کاحبیب
اردو لکچرار اکاڈمی آف اسلامک ریسرچ ۔ ایس ای ٹی کالج کیمپس۔ چینئی

مولانا حافظ ڈاکٹر بشیر الحق قریشی قادری نے اپنی تصنیف ''مجدد جنوبی ہند حضرت قطب ویلورؒ'' (مطبوعہ: 1989ء) میں زبدۃ العارفین حاجی الحرمین حضرت مولانا محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز کے متعلق یوں تحریر فرمایا ہے ۔

''سادات حسنی وحسینی کے اس نامور کی مخلص دینی اور علمی خاندان میں ۱۲۰۷ھ م 1792ء میں حضرت قطبِؒ ویلور کی ولادت باسعادت ہوی ۔ والدِ ماجد (حضرت محویؒ قادریؒ ویلوری) نے عبداللطیف نام رکھا ۔ بڑے ہوکر شاہ محی الدین سے معروف ہوے۔ اور دنیاے علم وعرفان میں قطبِؒ ویلور کے لقب سے مشہور ہوے اور یہی لقب نام اور عرف پر غالب آگیا ۔''

حضرت قطبؒ ویلور کو بچپن ہی سے حصولِ علم و عرفان کا بہت زیادہ شوق تھا ۔ آپؒ بے حد ذہین تھے ۔ چار سال ہی میں مکتب میں داخل ہوگئے ۔ چند ہی دنوں میں قرآن ناظرہ معہ تجوید ختم کیا اور دیگر اسباق بھی پڑھنے لگے ۔ آپؒ نے اپنے والد کی زبانی سُنا تھا کہ جمعہ کے خطبوں کے درمیان کے وقفہ میں دُعا کی مقبولیت مستجاب ہے چناں چہ آپ نے ان خطبوں کے درمیان اپنے علم کے لیے دُعا کی اور مقبول ہوی۔

جب آپ آٹھ سال کے تھے تو اس وقت میسور کی جنگ میں ٹیپو سلطان شہید کر دیے گئے ٹیپو کی بیگمات اور شہزادے ویلور کے قلعے میں نظر بند کئے گئے ۔ شہزادوں نے حضرت محویؒ سے عرض کیا کہ آپ کے صاحب زادے کو فنِ حرب میں مہارت حاصل کرنے کے لیے بہترین اساتذہ کا انتظام کرتے ہیں ۔ حضرت محویؒ نے ان کی پیش کش قبول کرلی ۔ اور حضرت قطبؒ ویلور کو آٹھ سال کی عمر میں ہی اس فن میں بہترین اساتذہ ملے اور آپ نے مہارت حاصل کی ۔ فنِ حرب سیکھنے کے بعد حضرت قطبؒ ویلور دیگر اساتذہ سے فقہ، حدیث، عقائد، ادب و اخلاق، انشاء، قصائد، صرف و نحو، منطق و کلام، نظریات و عملیات، طبابت، ہندسہ، ہیئت و ریاض و مساحت علم فرائض، اصول حقائق و سلوک وغیرہ کی تکمیل کی ۔ (بحوالہ: انوار اقطاب ویلور: مصنف محمد طیب الدین اشرفی مونگیری، مطبوعہ 1963ء)

بیس سال کی عمر میں آپ نے کلام اللہ شریف کا حفظ فرمایا اور دو سال میں حفظ مکمل کرلیا ۔ حضرت قطب ویلور شیخ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی تصنیفات سے بہت متاثر ہوے اور والدہ سے اجازت طلب کی کہ انھیں شیخ موصوف سے مزید اکتساب کی اجازت دی جاے مگر

آپ کی والدہ محترمہ نے کہا کہ پہلے وہ یہیں اچھی طرح علم حاصل کرلیں پھر شیخ کے پاس جانا۔ آپ کی والدہ کی اجازت سے مدراس تشریف لائے اور یہاں کے جیّد علماء سے علوم نقلی و عقلی کی تکمیل کی۔

مدراس کے قیام کے دوران آپ متواتر کتابی مطالعوں میں منہمک رہتے۔ کسی کی مداخلت پسند نہیں فرماتے تھے۔ جب کوئی ملنے آتا تو پہلے ہی طے کرلیتے کہ وہ کتنی باتیں کرے گا۔ اگر جواب ملتا کہ صرف پانچ باتوں پر استفسار کروں گا تو آپ چھٹی بات کا موقعہ نہیں دیتے اور فوراً آنے والے کو واپس کردیتے اور مطالعہ میں منہمک ہوجاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سترہ۱۷ دنوں میں انگریزی سیکھ لی اور اس میں کافی عبور حاصل کرلیا۔ (صاحب مطلع النور)

مدراس سے جب حضرت قطب ویلور واپس ہوئے تو آپ کی والدہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اب ان کا نونہال دہلی کے سفر پر مُصر ہوگا وہ آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خود سے جدا دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ اپنی اہلیہ کو فکرمند دیکھ حضرت محویؔ نے دلاسا دیا اور کہا کہ وہ فکرمند نہ ہوں اور کہا کہ خواب میں جدّ بزرگوار حضرت قربیؔ تشریف لائے اور میرے بچے کو ایک مسندِ مکلل پر باعزو وقار بٹھایا۔ لہٰذا اب دہلی جانے کی نوبت نہ آئے گی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پینتیس۳۵ سال کی عمر میں ۱۵؍ شعبان المعظم ۱۲۴۲ھ کو حضرت قطب ویلور مدراس سے ویلور بغرض روانگی دہلی آئے تو ادھر آپ کے والد بزرگوار حضرت محویؔ اور اُدھر حضرت شیخ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ دونوں اپنے خالق سے جاملے۔ حضرت قطب ویلور کو مسندِ سجادگی سنبھالنی پڑی۔ آپ دہلی کا سفر نہ کرپائے۔

آپ نے اپنے والد بزرگوار ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ ریاضت و سلوک بھی اپنے والد بزرگوار ہی کے زیرِ سایہ طے کیا۔ آپ کو ۱۹۱ سلاسل میں خلافت و اجازت حاصل ہوئی۔ ویلور میں آپ نے فیوض عام میں دلچسپی لی۔ لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آتے اور حلقہ بگوش اسلام و عرفان ہوتے۔ وعظ و تقریر میں آپ کمال کی حد تک ملکہ رکھتے تھے اور سننے والوں پر جادو سا ہوجاتا تھا۔

آپ کی زندگی اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسولؐ کے عین مطابقت میں تھی۔ آپ میں سننِ نبویؐ کی پوری جھلک نظر آتی یہاں تک کہ لباس پوشاک اور وضع قطع میں بھی آپ نے اتنا اہتمام برتا کہ شمائل نبویؐ میں جو باتیں پڑھیں اسی کو اپنا شعار بنایا اور وہ ہمیشہ ریاکاری سے بچے رہے۔ خود کو عام مسلمان سے بھی ادنیٰ تر کہا کرتے تھے۔ آپ جب نکلتے تو آپ کے اردگرد لوگوں کا ایسا ہجوم ہوتا جیسے کوئی شاہی سواری گزر رہی ہو۔ آپ میں خلفائے راشدینؓ کی ایک ایک ادا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جود و سخا میں بھی آپ خاندانی روایات کو مدِّنظر رکھتے تھے۔ علماء و مشائخ کو ہمیشہ ہدیہ و سوغات، نقد و جنس نہایت احترام سے پیش فرماتے۔ تسخیرِ قلوب کی خاطر غیر مسلموں کو بھی ضرورت سے زیادہ عنایت فرماتے تھے۔ جب کسی سے ملتے تو خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ خود بہت

آپ کی والدۂ محترمہ نے کہا کہ پہلے وہ یہیں اچھی طرح علم حاصل کرلیں پھر شیخ کے پاس جانا۔ آپ کی والدہ کی اجازت سے مدراس تشریف لائے اور یہاں کے جیّد علماء سے علوم نقلی وعقلی کی تکمیل کی۔

مدراس کے قیام کے دوران آپ متواتر کتابی مطالعوں میں منہمک رہتے۔ کسی کی مداخلت پسند نہیں فرماتے تھے۔ جب کوئی ملنے آتا تو پہلے ہی طے کرلیتے کہ وہ کتنی باتیں کرے گا۔ اگر جواب ملتا کہ صرف پانچ باتوں پر استفسار کروں گا تو آپ چھٹی بات کا موقعہ نہیں دیتے اور فوراً آنے والے کو واپس کردیتے اور مطالعہ میں منہمک ہوجاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے سترہ۱۷ دنوں میں انگریزی سیکھ لی اور اس میں کافی عبور حاصل کرلیا۔ (صاحب مطلع النور)

مدراس سے جب حضرت قطب ویلور واپس ہوئے تو آپ کی والدہ کو فکر لاحق ہوئی کہ اب ان کا نونہال دہلی کے سفر پر مُصر ہوگا وہ آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خود سے جدا دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ اپنی اہلیہ کو فکرمند دیکھ حضرت محوی نے دلاسا دیا اور کہا کہ وہ فکرمند نہ ہوں اور کہا کہ خواب میں جدِّ بزرگوار حضرت قرنی تشریف لائے اور میرے بچّے کو ایک مسندِ مکلل پر باعزو وقار بٹھایا۔ لہٰذا اب دہلی جانے کی نوبت نہ آئے گی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ پینتیس۳۵ سال کی عمر میں ۵ار شعبان المعظم ۱۲۴۳ھ کو حضرت قطب ویلور مدراس سے ویلور بغرض روانگی دہلی آئے تو ادھر آپ کے والد بزرگوار حضرت محوی اور اُدھر حضرت شیخ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی دونوں اپنے خالق سے جاملے۔ حضرت قطبِ ویلور کو مسندِ سجادگی سنبھالنی پڑی۔ آپ دہلی کا سفر نہ کرپائے۔

آپ نے اپنے والد بزرگوار ہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا۔ ریاضت وسلوک بھی اپنے والد بزرگوار ہی کے زیرِسایہ طے کیا۔ آپ کو ۱۹۱ اسلاسل میں خلافت واجازت حاصل ہوئی۔ ویلور میں آپ نے فیوض عام میں دلچسپی لی۔ لوگ جوق درجوق آپ کے پاس آتے اور حلقہ بگوش اسلام وعرفان ہوتے۔ وعظ وتقریر میں آپ کمال کی حد تک ملکہ رکھتے تھے اور سننے والوں پر جادو سا ہوجاتا تھا۔

آپ کی زندگی "اطیعواللہ واطیعوالرسول" کے عین مطابقت میں تھی۔ آپ میں سنن نبویؐ کی پوری جھلک نظر آتی یہاں تک کہ لباس پوشاک اور وضع قطع میں بھی آپ نے اتنا اہتمام برتا کہ شمائل نبویؐ میں جو باتیں پڑھیں اسی کو اپنا شعار بنایا اور وہ ہمیشہ ریاکاری سے بچے رہے۔ خود کو عام مسلمان سے بھی ادنیٰ تر کہا کرتے تھے۔ آپ جب نکلتے تو آپ کے اردگرد لوگوں کا ایسا ہجوم ہوتا جیسے کوئی شاہی سواری گزر رہی ہو۔ آپ میں خلفائے راشدین کی ایک ایک ادا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جود وسخا میں بھی آپ خاندانی روایات کو مدِّنظر رکھتے تھے۔ علماء ومشائخ کو ہمیشہ ہدیہ وسوغات، نقد وجنس نہایت احترام سے پیش فرماتے۔ تسخیرِ قلوب کی خاطر غیرمسلموں کو بھی ضرورت سے زیادہ عنایت فرماتے تھے۔ جب کسی سے ملتے تو خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ خود بہت

کم کھاتے تھے مگر مہمانوں کو شکم سیر ہونے دیتے اور اچھے سے اچھا کھلاتے تھے۔

کسی موقعہ پر شرپسندوں میں کسی نے یہ افواہ پھیلا دی کہ آپؒ اپنی تقریروں اور وعظوں میں انگریزوں کے خلاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مخالفت میں مسلمانوں کو اُبھارتے ہیں۔ یہ خبر جب کمپنی کو ملی تو اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا اور آپؒ نظربند کردیے گئے اور پھر آپؒ کی برات ہوی۔ اس کی خبر جب ملکہ وکٹوریہ کو ہوی تو فوراً اس غلط فہمی کے معذرت چاہی۔ رہائی کے بعد ججوں نے آپؒ سے کہا کہ وہ شرپسندوں کے خلاف اپنی حرمت کا دعویٰ کردیں۔ مگر حضرتؒ نے یہ کہہ کر تجویز رد کردی کہ "میں بلاوجہ کسی کو کیوں تکلیف دوں اور میں اپنی مرضی کو خدا کی ہر مرضی و مشیت پر قربان کردینا عین کمال سمجھتا ہوں۔" حکام یہ سن کر دنگ رہ گئے اور آپؒ کے خلقِ عظیم کا بہت گہرا اثر ہوا۔ آپؒ میں اپنے آباء و اجداد کی تمام خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔

آپؒ تصرفات و کرامات میں مشہور زمانہ تھے۔

آپؒ کے ایک مرید جو عابد، پرہیزگار اور حاجی بھی تھے اور خلیق بھی۔ فرماتے ہیں کہ جب ان کا شباب کا زمانہ تھا تو ایک مرتبہ اپنے اہل و عیال سے دور ہوگئے اور اسی جدائی کے عالم میں ان میں گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کا خطرہ پیدا ہوا اور خواہش بڑھتی چلی گئی تو رات میں حضرت شیخ (قطبِ ویلور) تشریف لائے اور تنبیہ کی اور غصہ میں کہا کہ "جا آج سے تیری رجولیت سلب کرتا ہوں۔" مرید مذکور کا کہنا ہے کہ جب وہ بیدار ہوے تو خود کو نامرد پایا اور تقریباً تین سال تک وہ اسی حالت میں رہے۔ لاکھ علاج معالجہ کیا مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوی۔ ایک دن جب وہ ویلور آئے، تو حضرت شیخ کے بہنوئی مولانا حاجی محی الدین صاحب جو بہت بڑے صوفی و عالم ہونے کے علاوہ حاذق حکیم بھی تھے، اُن سے تشخیص کرائی تو حضرت موصوف نے کہا کہ علاج سے زیادہ اپنے پیر و مرشد کی بارگاہ میں رجوع ہوں۔ غرض مرید نے حضرت قطب ویلور کے روبرو جانے سے شرمندگی محسوس کرتے ہوے ایک کاغذ کے پرزے میں لکھ کر آپؒ کے حجرہ میں رکھ دیا۔ جب حضرت قطبؒ ویلور مسجد میں تشریف لائے تو اپنے مرید کو طلب فرمایا اور کہا: آئندہ ہشیار رہنا۔ کبھی ایسی حرکت نہ ہونے پائے۔ بہر صورت خدائے قہار سے خوف کھاتے رہو" اور کہا "جاؤ تیری رجولیت کو واپس کیا۔" رات کو سو کر جب بیدار ہوے تو اپنے آپ کو اصلی حالت میں پایا۔

اسی طرح حضرت قطبؒ ویلور کی ایک اور کرامت بیان کرنے پر اکتفا کرتی ہوں۔

آپؒ کے انتقال کے بعد ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک قندھاری سید ذاکر نامی شخص حضرت مکان تشریف لائے ایک شب وہ نوجوان بالکل بھوکا سو گئے تو حضرتؒ خادمہ کے خواب میں آکر اس پر آگ بگولہ ہوگئے اور کہا کہ کس طرح ایک مہمان کو بھوکا سونے دیا گیا۔ خادمہ نے کہا کہ حضرت چاول (کھانا) تو ہے مگر سالن ختم ہوگیا ہے۔ تو حضرت نے کہا اگر سالن نہیں تو چٹنی ہی رکھ دیتی۔ غرض نوکرانی بیدار ہوی اور حسب الحکم چاول اور چٹنی اس نوجوان تک پہنچادی۔ نوجوان جاگ کر حیران رہ گیا اور

کہا کہ اس نے اپنے بھو کا ہونے کی کسی کو اطلاع ہی نہیں کی تھی۔ پھر کس طرح معلوم کرلیا گیا۔ تو اُسے حقیقت بتائی گئی وہ حیران رہ گیا۔

آپؒ نے دوبار زیارتِ حرمین اور حج مبرور سے سرفراز ہوئے۔ جب حج اولیٰ سے فارغ ہوئے تو بہ حکم حضور پر نورؐ واپس آئے اور خدمتِ خلق میں منہمک ہوگئے۔ مگر تن ہی یہاں تھا اور آپؒ کی روح مدینہ میں تھی ہمیشہ بے قرار رہا کرتے تھے۔ 24 رمحرم 280 ۱ھم 1863ء شب دوشنبہ آپؒ کی والدۂ ماجدہ دنیا سے رحلت فرماگئیں۔ اُس سانحہ کے بعد حضرت قطبؒ ویلور کو سفر حجاز کا بہت زیادہ خیال پیدا ہوگیا اور یہی آرزو تھی کہ باقی زندگی حرمین شریفین کے درمیان گزرے۔ آپؒ کی زبان پہ یہی حدیث اکثر آجاتی جس کا مفہوم ہے: "جس کی موت حرمین شریفین کے درمیان ہوی وہ قیامت میں آمنین سے اٹھایا جائے گا"

آپؒ کی دلی تمنا پوری ہونے کا وقت آگیا اور ۳ر شوال ۱۲۸۸ھم 1871ء کو آپؒ سفر پر روانہ ہوئے۔ مختلف مقامات سے گزرتے ہوئے آپؒ بمبئی پہنچے اور ۶ر ذی القعدہ ۱۲۸۸ھم 1871ء کو جہاز پر حجاز کے لیے سوار ہوئے آدھی مسافت بھی طے نہیں ہوی تھی کہ سمندر میں طوفانی صورت پیدا ہوگئی اور جہاز آگے نہیں بڑھنے پارہا تھا۔ بلکہ پیچھے ہٹنے لگا تو لوگوں کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ مسافرین حضرت شیخؒ کے پاس آئے اور دعا کی درخواست کی۔ آپؒ نے فرمایا: خدا حافظ و ناصر ہے۔ جب جہاز جدہ سے ۵۰/میل کے فاصلہ پر تھا کہ ذی الحجہ کا چاند دکھائی دیا۔ حجاج نا امید ہوگئے کہ اب حج نصیب نہ ہوگا۔ دوسرے دن جہاز جدہ پر لنگر انداز ہوگیا۔ اس طرح حضرت قطبؒ ویلور جدہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوگئے اور حج کے فرائض سرانجام دیے۔ اس سفر میں حضرتؒ بہت بیمار اور ضعیف ہوگئے تھے۔ آپؒ کا دل ڈوبنے لگا تھا کہ وہ حضور پر نورؐ کی شاید زیارت نہیں فرما پائیں گے۔ آپؒ کا گریہ جاری ہوگیا آپؒ نے اسی عالم میں حضورؐ کو صبح صادق کے قریب خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور بہت سے اجنبی لوگ اس میں بھرے پڑے ہیں اور سرکارِ دو عالمؐ تاج دارِ مدینہ تشریف فرما ہیں اور حضرت قطبؒ ویلور کی جانب متوجہ ہوکر فرمارہے ہیں: "تعال یا ولدی"۔ آپؒ نے بیدار ہوکر لوگوں سے خواب بیان کیا۔ آپؒ میں ایک طاقت سی پیدا ہوگئی اور مدینۂ منورہ کے سفر کا آغاز کیا۔ یہ سفر ۲۴ر ذی الحجہ کو شروع ہوا۔ ۸ر محرم الحرام دوشنبہ کے دن آپؒ کو چار اسہال ہوئے۔ جس سے اور زیادہ کمزوری پیدا ہوگئی آپؒ کے صاحب زادے مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری زیادہ بے قرار ہوگئے اور رونے لگے تو آپؒ نے فرمایا کہ "گھبرانے کی بات نہیں۔ غور کرو کہ میرے والد کی عمر شریف ۵ سال کی تھی کہ اس وقت جدِ محترم رحلت فرماگئے اور تم تو ۲۰ سال کے ہوچکے ہو۔ تم اپنی زندگی میں میرے طریقہ کو پیشِ نظر رکھو....." اس طرح بہت سی نصیحتیں کیں۔

آپؒ نے وصیت فرمائی کہ اگر آپؒ کی رحلت ہوجائے تو آپؒ کی قبر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پائینتی بنائی جائے آپؒ نے وہیں اپنے فرزند کو خرقۂ خلافت و دستار عطا کی اور خلافت نامہ تیار کراکے دے دیا۔

حافظ بشیر الحق قریشی اپنی تصنیف "مجدد جنوبی ہند حضرت قطب ویلور" میں رقمطراز ہیں :

"مورخہ ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ م ۱۸۷۲ء پنجشنبہ کا روز تھا کہ حضرتؒ کی آواز پست ہوگئی اور لب مبارک ہلنے لگے مولوی سید شہاب الدین کان لبِ مبارک کے قریب لے گئے تو صاف یہ صدا سُنی: "لقد نظر اللہ الی" اور حضرت کے داماد فرماتے ہیں کہ میں اس وقت سر بالیں کھڑا ہوا تھا۔ حضرتؒ کا سر بائیں طرف جھکا تو میں سمجھا کہ شدت ضعف سے جھکا ہے۔ دیکھا تو لب ہلتے ہیں۔ نزدیک سے سُنا زبان پر لا الٰہ الا اللہ جاری تھا۔ اسی حالت میں اس منبعِ علم و عرفاں اور مجمع کمالات ہستی نے عصر کے وقت بیاسی ۸۲ سال کی عمر میں دنیائے فانی سے کوچ فرمایا۔"

اتفاقاً جس شب حضرتؒ نے رحلت کی اُسی شب آپؒ کے بھانجے مولانا سید محمد قادری بھی اسہال اور قے میں اللہ کے پیارے ہوگئے۔ اسی شب حاکم مدینہ کے خواب میں حضور اکرمؐ تشریف لائے اور فرمایا کہ میرا فرزند فلاں مقام پر ہے جاؤ اور اس کی تدفین کا انتظام کرو۔ آپؒ کے ساتھ حج کو جانے والوں کا بیان ہے کہ وہ حاکم نعش مبارک سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ اس نے اپنا خواب بیان کیا جمعہ کا دن تھا۔ دونوں جنازے مسجد نبویؐ لائے گئے اور آپؒ کے جنازے میں ستر ہزار زائرین شریک ہوئے۔ پھر جنت البقیع میں حضرت امام حسنؓ کے پائینتی حسب وصیت دونوں ایک ہی قبر میں مدفون ہوئے۔ حضرت مولانا سید محمد قاسم ویلوری صاحب نے آپ کا قطعۂ تاریخ فارسی میں یوں کہا ہے : ؎

چوں ز دنیا محی الدین عبداللطیف	شیخ وقت و عابد و شاغل برفت
گفت تاریخ وفاتش ہاتفم	صاحبِ دیں عارف کامل برفت

۱۲۸۹ھ

بقیہ مضمون "ہنر بچشمِ عداوت ......" ص ۱۱۹ سے آگے ...

کیا اُن چار ہزار علماء نے آپؒ کو غلط تعلیم دی !!

کیا لاکھوں فضلاء نے یوں ہی آپؒ کو استاذ تسلیم کرلیا۔!!

کیا لاکھوں فقہا و محدثین نے یوں ہی ایک ناواقف اور جاہل کو "سراج الامۃ" مان لیا !!!

کیا وہ سب حضرات حق پر تھے یا یہ حاسدین و معاندین حق پر ہیں یہ ہم خدا کے حوالے کرتے ہیں...

وسیعلم الذین ظلموا اَیَّ مُنقلبٍ ینقلبون۔

کہ بہت جلد ظالموں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کس جگہ پر کروٹیں لے رہے ہیں .....

• شخصیات

ہُنر بچشمِ عداوت......

افضل العلماء مولوی حافظ محمد معین الدین باقوی ارکونی۔ مدرس دار العلوم سعیدیہ۔ گڑیاتم

علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی تبلیغ دو طرح کی تھی۔ (۱) الفاظِ نبوت کی تبلیغ (۲) معانیٔ نبوت کی تبلیغ! قرآن و حدیث کے معانی و مطالب، حقائق و دقائق کی تبلیغ کرنے والے فقہائے کرام ہیں جن کو خدا کی طرف سے مسائل کے استخراج و استنباط کی نعمت عظمیٰ عطا کی گئی جس کے ذریعہ وہ حلال و حرام کے ضابطے بنانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں فقہائے کرام کے ذریعہ تاریکیوں میں سرگرداں لوگ راستے معلوم کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی فقہائے کرام نجومِ ہدایت ہیں، راہِ حق کے روشن مینار ہیں۔ دین متین کے چمکتے چراغ ہیں۔ مختصراً اگر کہنا ہو تو احکامِ شریعت میں ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

احکامِ شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) تحقیقی (۲) تقلیدی۔ جیسا کہ حضرت علامہ شاہ محمد اسماعیل شہید اپنی کتاب "منصبِ امامت" میں لکھتے ہیں: "انبیاء کا علم تحقیقی علم تھا جس کے حاصل کرنے کے دو طریقے تھے۔ ۱۔ اجتہادی ۲۔ الہامی۔ پس احکامِ شرعیہ میں انبیاء کرام کے مشابہ علم یا تو مجتہدین کو ہوگا یا ملہمین کو ہوگا۔ چوں کہ کشف و الہام کی طرف احکام کی نسبت اوائل امت میں معروف نہ تھی لہٰذا اس فن میں انبیاء کرام کے مشابہ مجتہدین ہیں۔" (منصب امامت)

یوں تو دنیا میں بہت سارے فقہائے کرام اور مجتہدین پیدا ہوئے۔ لیکن امت کے درمیان چند اشخاص ہی معروف و مشہور ہوئے اور اس فن اجتہادی میں نبی کریمؐ سے مشابہتِ تامہ چند ہی حضرات کو نصیب ہوئی۔ ان میں سب سے زیادہ مقبولیت سراج الامت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت تابعی المتوفی ۱۵۰ھ کو ہی نصیب ہوئی۔

یہ بات مسلم اور طے شدہ ہے کہ آدمی جس قدر باکمال اور باصلاحیت ہوگا اس کے اتنے ہی حاسدین پیدا ہوں گے تاریخ کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سب سے پہلے جنت میں تخلیق آدمؑ پر شیطان نے حسد کی۔ اسی طرح ہر دور میں

انبیائے کرام کے کمالات و معجزات پر مخالفین حسد و چہ می گوئیاں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سرور کونین ﷺ کے کمالات پر حاسدین نے انگشت زنی کی، ہر طرح کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ حسد و مخالفت کا یہ سلسلہ نہ صرف دورِ انبیا تک محدود رہا بلکہ دورِ صحابہؓ، تابعین، ائمہ مجتہدین میں بھی جاری رہا اور ہنوز جاری ہے۔

الغرض! کسی فن میں جہاں کوئی عبور حاصل کر لیتا ہے تو وہیں سے حسد و عناد کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ بغض و حسد عداوت کی آگ سلگ جاتی ہے۔ جیسا کہ علامہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا: ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبیست گلست سعدی در چشم دشمناں خارست

یعنی عداوت کی آنکھوں میں بڑے بڑے ہنر بھی عیب معلوم ہوں گے اور دشمن کی نگاہ میں پھول بھی مثلِ خار ہیں۔

یہی کچھ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ساتھ پیش آیا۔ چوں کہ آپ کا مقام بلند ترین کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان میں سے گیارہ انفرادی اور امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جن میں امام اعظمؒ دیگر ائمہ مجتہدین سے منفرد و ممتاز ہیں۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ آپؒ قرنِ ثانی میں پیدا ہوئے جس کے خیر ہونے کے متعلق حضورؐ نے بشارت دی۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت ساری بشارتیں ہیں جو زبان رسالت مآب ﷺ سے آپؒ کے متعلق دی گئیں۔ چناں چہ حضور پر نور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لوکان الایمان عند الثریا وفی روایۃ لوکان الایمان معلقاً بالثریا وفی حدیث قیس لاتنالہ العرب لنالہ رجال ہ (وفی مسلم) لتنالہ رجل من ابناء فارس ہ (متفق علیہ) کہ اگر ایمان ثریا ستارے کے پاس بھی ہو اور اہلِ عرب اس کو نہ پا سکتے ہوں تو بھی اس کو ایک فارسی آدمی پالے گا۔

شارح حدیث علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: امام اعظمؒ کی بشارت اور فضیلت پر یہ حدیث بنیادی اور صحیح ہے جس پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ترفع زینۃ الدنیا سنۃ خمسین ومائۃ: کہ دنیا کی زینت ۱۵۰ھ میں اٹھالی جائے گی۔

اس حدیث سے امام کردریؒ نے امام اعظمؒ کو مراد لیا ہے۔ کیوں کہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ امام صاحبؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ چوں کہ آپؒ قرنِ ثانی میں پیدا ہوئے جس کے خیر ہونے سے متعلق رسول اکرم ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ہ یعنی سب زمانوں سے بہترین زمانہ میرے صحابہؓ کا زمانہ ہے اس کے بعد تابعین کا اس کے بعد تبع تابعین کا زمانہ ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

طوبی لمن رانی ورای من رانی ولمن رای من رای من رانی یعنی مبارک ہو اس شخص کے لیے جو مجھے دیکھا ہو اور اس شخص کے لیے بھی خوشخبری ہے جو مجھے دیکھے ہوئے کو دیکھا ہو اور اس شخص کے لیے بھی بشارت ہے جو میرے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہو۔

مذکورہ دونوں حدیثوں میں پہلا دور صحابہ کا ہے اور دوسرا تابعین کا اور تیسرا تبع تابعین کا ہے اور امام اعظمؒ کا دور تابعین کا دور ہے جو خیر و بھلائی کا دور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ کہ آپؒ کو بہت سارے صحابہ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوی۔ چنانچہ مصنفین کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ تابعی نے آٹھ صحابۂ کرامؓ اور ایک صحابیہؓ سے حدیث پاک سنی ہے۔ جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت انس بن مالکؓ ۲۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی ۳۔ حضرت واثلہؓ بن اسقع

۴۔ حضرت عمرؓ بن حریث ۵۔ حضرت عبداللہؓ بن انس ۶۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ

۷۔ حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء ۸۔ حضرت معقل بن یسار ۹۔ حضرت عائشہ بنت عجرد

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے صحابہؓ کی آپؒ نے زیارت کی۔

تیسری خصوصیت یہ کہ امام اعظم نے حضرات تابعین کے زمانہ میں اجتہاد کیا اور فتوی جاری کئے اور بہت سارے تابعین آپ کے اجتہاد اور فتوؤں کی مدح سرائی کی اور تسلیم کیا۔ چناں چہ امام اعمشؒ سے مروی ہے کہ امام اعظم رح باریک غوامض میں فقہ کے مواقع کو اچھی طرح جانتے تھے۔

اسی طرح قاضی ابوالقاسم بن کاسؒ نے علی بن مسہرؒ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت اعمشؒ کو یہ کہتے سنا کر مناسک حج امام ابوحنیفہؒ سے لکھواؤ اس لیے کہ میں حج کے فرائض و واجبات، نوافل و مستحبات کو ان سے زیادہ جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

اسی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ امام اعظمؒ عہدِ تابعین میں اجتہاد و فتوے میں سب پر فائق تھے۔

چوتھی خصوصیت یہ کہ بڑے بڑے ائمۂ مجتہدین جن میں آپؒ کے مشائخ بھی موجود ہیں آپؒ سے روایت کئے ہیں۔ ابومحمد حارثیؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کی فضیلت پر صرف ائمۂ کبار کی روایت سے استدلال کیا جائے تو یہی کافی ہے۔

چناں چہ عمرو بن دینارؒ وغیرہ نے آپؒ سے روایت کی ہے۔ حالاں کہ وہ امام صاحبؒ کے شیوخ میں سے ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؒ نے چار ہزار تابعین سے علم حاصل کیا ہے۔ چناں چہ علامہ ابو مؤید موفق بن احمد خوارزمی نے محمد بن علی زرنجیریؒ سے روایت کی ہے امام ابوحفص کبیر نے امام ابوحنیفہ کے اساتذہ کے شمار کرنے کا حکم دیا حکم کے مطابق شمار کیے گئے تو ان کی تعداد چار ہزار سے تجاوز کر گئی۔ اسی طرح خطیب بغدادیؒ اور ابو عبداللہ بن خسروؒ نے ربیع بن یونسؒ سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار میں گئے اس وقت اس کے پاس عیسیٰ بن موسیٰ موجود تھے انھوں نے امام صاحب کے متعلق فرمایا: "یہ فی زمانہ عالم الدنیا ہیں۔" اس پر منصور نے پوچھا: آپ نے علم کس سے حاصل کیا؟ امام صاحب نے جواب دیا: اصحابِ عمر بن خطابؓ سے عمر بن الخطاب کا علم، اصحاب علیؓ سے علیؓ کا علم اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کا علم، اصحابِ عبداللہ بن عباسؓ سے ان کا علم۔ نیز آپ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عباسؓ کے زمانہ میں روئے زمین پر اُن سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا۔ یہ سن کر منصور نے کہا "تم نے اپنی مضبوطی ہر طرح سے کرلی۔"

چھٹی خصوصیت یہ کہ آپ کو جتنے لائق و فائق ہزاروں شاگرد ملے ایسے شاگرد ائمہ مجتہدین میں سے کسی مجتہد کو نہیں ملے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ امام صاحب سے علم حاصل کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے جن کا تعلق اسلامی دنیا کے مختلف شہروں سے ہے۔ مثلاً مکۂ مکرمہ، مدینۂ منورہ، دمشق، بصرہ، وسط، موصل، جزیرہ، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، ری، دامغان، طبرستان، جرجان، نیساپور، سرخس، نسا، بخارا، سمرقند، رو، ترمذ، ماوراءالنہر، ہرات، قوہستان، خوارزم، سجستان، مدائن، حمص، مصیصہ وغیرہ۔ خطیبؒ بغدادی نے ابن کرامہؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن ہم لوگ وکیع بن جراح کے پاس تھے مجلس میں ایک شخص نے کہا: "ابوحنیفہؒ غلطی کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ ان کے ساتھ ابو یوسفؒ، زفرؒ، محمدؒ اپنے قیاس اور اجتہاد کے ساتھ اور یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے حفاظ حدیث اور معرفت حدیث کے حامل اور قاسم بن معن بن عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عربیت اور لغت کے امام اور ابوداؤد بن نصیر طائی اور فضیل بن عیاضؒ جیسے زاہد و عابد موجود ہیں۔ نیز فرمایا جس کے ہم نشین ایسے ایسے کبار علماء ہوں وہ غلطی نہیں کر سکتا۔ اگر غلطی کرے گا تو وہ اسے صحیح کی طرف لوٹا دیں گے۔

ساتویں خصوصیت یہ کہ سب سے پہلے فقہ کی تدوین آپؒ نے کی اور کتابوں کو فقہی ابواب پر ترتیب دیا آپؒ کے اس طریقے کو دیکھ کر امام مالکؒ بن انسؒ نے موطا کی ترتیب میں یہی طریقہ اپنایا۔ امام صاحبؒ سے پہلے کسی نے ایسا

نہیں کیا تھا۔کیوں کہ صحابہ وتابعین اپنے حفظ پر اعتماد کرتے تھے ۔ امام اعظمؒ نے علم کو بے ترتیب پھیلتے دیکھا تو خوف محسوس کیا کہ کہیں ضائع نہ ہوجائے۔لہٰذا اس کو فصول وابواب پہ مرتب کیا ۔اسی طرح امام اعظمؒ ہی پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط وضع کی ۔

آٹھویں خصوصیت یہ کہ آپؒ کے مسلک کی ان ملکوں میں اشاعت ہوئی جہاں اور کوئی مسلک تھا ہی نہیں مثلاً جیسے ہندوستان ،سندھ ، روم ، ماوراءالنہر ،اور عجم کے اکثر ممالک وغیرہ۔ (مثلاً کیوں کہ وہاں کے اکثر لوگ علم وفہم کے نجم درخشاں تھے ، ایسے لوگ بھی آپؒ کے مسلک کو اپنایا ۔)

نویں خصوصیت یہ ہے آپؒ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے اور اہل علم حضرات پر خرچ کرتے تھے ۔ہدیہ تحفے امراء اور وزراء کے قبول نہیں کرتے تھے ۔اپنے گھر والوں پر جس قدر اشیا خریدتے تھے اسی قدر اہل علم حضرات کے لیے خریدتے اور تحفۃً ان کو عطا کردیتے تھے ۔

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کثرت عبادت ، زہد وتقویٰ ،قیام اللیل ، امانت ودیانت ،خشیت الٰہی ، لایعنی امور سے کنارہ کشی ،کثرتِ تلاوت جیسے بہت سارے اخلاقِ کریمہ اور اوصافِ جمیلہ سے متصف تھے ۔چناں چہ علامہ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ امام اعظمؒ کی عبادت خاص کر تہجد اور قیام اللیل خبر متواتر کے ساتھ ثابت ہے ۔

ضحاک بن مخلدؒ فرماتے ہیں امام اعظمؒ رات کو نماز میں لمبا قیام فرمایا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپؒ کا نام ہی وتد (کیل) پڑ گیا تھا۔ حفص بن عبدالرحمٰن سے مروی کہ امام صاحبؒ تیس سال تک ایک رکعت میں سارا قرآنِ مجید پڑھ کر قیام اللیل فرمایا ۔ اسد بن عمر سے روایت ہے کہ امام صاحبؒ نے ۴۰ سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ۔اکثر ایک رکعت میں پورا قرآن مجید پڑھ لیتے تھے ۔

علامہ صیمریؒ نے امام یوسفؒ سے روایت کی ہے کہ امام صاحبؒ ہر دن ایک قرآن ختم کرتے تھے اور رمضان میں عید کے دن اور رات ملا کر کل ۶۲ قرآن ختم کرتے تھے اور مال خرچ کرنے میں سخی علم سکھانے میں صابر اور لوگوں کے طعن وتشنیع بہت برداشت کرتے تھے اور صبر کرتے اور بہت کم غصّہ کرتے تھے ۔

آپؒ کے خوفِ خداوندی اور خشیت الٰہی کے متعلق یزید بن کمیت جو ایک صالح اور نیک بزرگ تھے روایت فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے ۔ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ عشاء کی امامت علی بن حسین نے کی ۔موذن نے جس میں سورۂ اذا زلزلت کی قرأت کی ،امام صاحب بھی شریک جماعت تھے ۔جب نماز ہوچکی اور لوگ چلنے لگے تو میں نے امام صاحب کو دیکھا کہ

بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں اور لمبی لمبی سانس لے رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں بھی چلوں تاکہ میری طرف سے آپؒ کا دھیان نہ بٹے یہ سوچ کر میں چلا گیا جب صبح صادق کے بعد واپس آیا تو آپ اپنی داڑھی پکڑ کر رو رو کر یہ کہہ رہے تھے : ؎

یامن یجزی بمثقال ذرۃ خیر خیراً ویامن یجزی بمثقال ذرۃ شر شراً

اے وہ ذات جو ذرہ برابر نیکی کا بدلہ نیکی دے گی اے وہ ذات جو ذرہ برابر برائی کا بدلہ برائی دے گی۔

اپنے بندے نعمان کو آگ سے اور اس کی برائی سے جو آگ کے قریب کرے حفاظت فرما اور اس کو وسیع رحمت میں داخل فرما۔ یزید بن کمیت کہتے ہیں کہ میں نے اذان دی اور آپؒ کے قریب جا کر کہنے لگا فجر کی اذان ہو گئی تو آپ فوراً فجر کی دو رکعت سنتیں پڑھی اور رات کے وضو سے ہی فجر کی فرض نماز ادا کی۔

اسی طرح ابو محمد حارثی اور محمد بن حماد بن مبارک مصصی نے سیرتِ امام ابوحنیفہؒ میں یزید بن کمیت سے روایت کی ہے کہ میں نے ایک آدمی کو امام صاحب سے کہتے سنا اِتَّقِ اللّٰہَ (اللہ سے ڈرو) یہ سنتے ہی امام صاحب پسینہ پسینہ ہو گئے اور چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور آپؒ نے سر جھکا لیا پھر فرمایا: اے بھائی! اللہ تجھ کو جزائے خیر دے۔ جس وقت لوگوں کے زبان سے علم کے فوارے ابل رہے ہوں اور وہ اپنے نیک عمل پر پھولے نہ سماتے ہوں تو ایسے وقت وہ ایسے بزرگوں کی طرف بہت محتاج ہوتے ہیں۔ جو انھیں اللہ کی یاد کی طرف بلاتے ہیں تاکہ نیت خالص ہو جائے اور نیک عمل سے ان کا مقصد اللہ کی ذات ہو جائے۔

آپ کے زہد و تقویٰ تو کیا کہنا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ میں کوفہ میں داخل ہوا اور لوگوں سے معلوم کیا کہ یہاں سب سے بڑے زاہد کون بزرگ ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ ابوحنیفہ!

قاضی ابو عبداللہ صیمری نے حسن بن صالح سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا ابوحنیفہ بڑے پرہیزگار اور حرام سے بے حد محتاط رہتے تھے۔ بہت سے حلال مال کو بھی شبہ کی بنا پر چھوڑ دیتے تھے۔ میں کسی فقیہ کو کبھی اپنی جان اور اپنے علم کی آپؒ سے زیادہ حفاظت کرنے والا نہیں دیکھا۔ آپؒ کی تمام تر تیاری آخرت کے لیے تھی۔

آپ کی گیارہویں اور آخری **خصوصیت** یہ ہے کہ آپؒ نے مظلوم، محبوس اور مسموم کی حالت میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے امام صاحبؒ کو کوفہ سے بغداد بلوایا اور حکم دیا کہ آپؒ قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرلیں۔ مگر آپؒ نے اس سے انکار کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے قسم کھائی کہ عہدہ قضا قبول نہ کریں تو قید کر دیے جائیں گے۔ چناں چہ آپ قید کر دیے گئے اور آپ کو بہت ساری اذیتیں دی گئیں۔ مگر پھر بھی آپ انکار کرتے ہی رہے

تو ابو منصور نے اور زیادہ سختیاں دینی شروع کر دیں اور حکم دیا کہ روزانہ آپ کو قید خانہ سے باہر لایا جائے اور دس کوڑے لگائے جائیں اور بازاروں میں گھمایا جائے۔

چناں چہ خون سے لت پت بازاروں کا گشت کرایا گیا۔ کھانا پانی بند کر دیا گیا۔ دنیٰ دن یہ انسانیت سوز ظالمانہ حرکت ہوی۔ ابو محمد حارثی نے محمد بن مہاجر سے روایت کی ہے کہ ابو حنیفہ کے سامنے ایک پیالہ پیش کیا گیا کہ اس کو نوش فرمالیں آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ متعدد بار پیش کیا گیا۔ ہر بار آپ نے انکار فرمایا اور یہ کہتے رہے مجھے معلوم ہے کہ اس میں کیا ہے۔ میں اپنے قتل کی مدد نہ کروں گا۔

آخر آپ زمین پر گرا ئے گئے اور زہر زبردستی حلقوم سے اتار دیا گیا جس سے آپ وفات پا گئے۔ (اناللّٰہ)

ایسی بے پناہ خصوصیات کے مالک حضرت سید الائمہ امام المتقین امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رح کے خلاف کیچڑ اچھالنے والے حاسدین خدا اور اس کے رسول ؐ کو کیا جواب دیں گے ؟ کیوں کہ تمام اعتراضات کا بالکلیہ جواب دے دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پھر اعتراضات اور وہی طوطے کی رٹ لگانا یہ کسی عقلمند کا کام نہیں ہے۔

ان حاسدین کی تمام شکایتیں مبنی برحسد ہیں اور آپ ؒ کے دامانِ سدا بہار کو داغدار بنانے کی ناپاک کوشش ہے۔ ایسے ہی معاندین کے متعلق حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا : جو آدمی کسی مسلمان کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کر کے مشہور کریگا درحقیقت وہ اس سے بری ہے صرف اس سے اس کو بدنام کرنا مقصد ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے کہ اس کو جہنم میں روک کے رکھے۔

اسی طرح ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم ؐ کو کہتے سنا کہ آپ ؐ نے فرمایا "جو بھی کسی مؤمن پر ایسا عیب لگائے گا جو اس میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنمیوں کے خون و پیپ میں رکھیں گے۔"

آج کل ایک فرقہ جو امام اعظم رح کے متعلق غلط سلط باتیں پیش کر رہا ہے جن کا صدور ایسے شخص سے بھی ہو نہیں سکتا جس میں ادنیٰ درجہ کی بھی دینداری ہو۔ لیکن یہ باطل فرقہ ایسی بابرکت ذات کی طرف ایسی باتیں منسوب کر رہا ہے جن کے زہد و تقویٰ، غور و فکر، فہم و تدبر، اخلاق و اطوار، عادات و کردار، حسنِ عبادت، فراست و صداقت، علم و درایت کی شہادت ان بزرگوں نے دی ہے جنھوں نے ان کو اور ان لوگوں نے بھی دی جو ان کو نہیں دیکھا ہے

کیا وہ سب یکتائے روزگار علماء و فقہاء نے آپ رح کی جھوٹی تعریف کی ؟

کیا وہ سب مردانِ خدا دروغ گوئی پر متفق تھے ؟

کیا وہ سب ان باطل فرقوں کی طرح غیر ملکی ہڈیوں کے خواہاں تھے ؟

(بقیہ صـــ112ــــ پر ملاحظہ ہو۔)
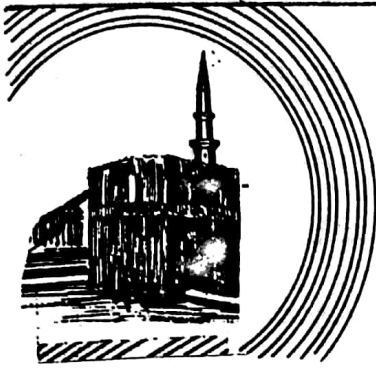
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ

محبت و معرفت الٰہی

خواجہ محمد بیابانی نور چشتی القادری ۔ ادیب کامل ۔ (علیگ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

مناجات

رحم کر ہم پر تو اے ربِّ رحیم — اور بچا فتنہ سے ہم کو اے کریم

اور ہمیں تیری محبت ہو نصیب — دوستوں کی تیرے الفت ہو نصیب

تجھ سے جس کو ہو محبت اے خدا — ہم کو بھی ہو اس سے الفت اے خدا

دے ہمیں اپنی محبت اس قدر — ہر محبت سے بھی ہو وہ بیشتر

ہم ہیں ایسے دل کے تجھ سے خواستگار — عشق میں تیرے رہے جو بیقرار

دل وہ دے یارب جو ہو درد آشنا — اور وہ دل دے جو ہو تیرا مبتلا

حضرت الحاج مولانا ابو الحسنات سید عبداللہ بادشاہ صاحب نقشبندی و قادری قدس اللہ سرہٗ العزیز نے حضرت عبدالرحمٰن جامی قدس اللہ سرہٗ کے نعتیہ اشعار کا خلاصہ مطلب تحریر فرمایا ہے ، ملاحظہ فرمائیے : ؎

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحم یا نبی اللہ ترحم

یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپؐ کا دنیا سے تشریف لے جانا امت سے آپ کا دور ہو جانا ایسی مصیبت ہے کہ اس کے برابر اور کوئی مصیبت نہیں یا نبیؐ ہم پر بھی ایک رحمت کی نظر فرمائیے۔ ؎

نہ آخر رحمۃ للعالمینی — ز محروماں چرا غافل نشینی

اے رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم آپؐ کی امت سیدھے راستہ سے دور رہ کر اپنے نافرمانیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ خدارا ذرا اس امت کی خبر لیجیے۔ ؎

زخاک اے لالۂ سیراب خیز چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

پیارے نبی صلے اللہ علیہ والہ وسلم قبرِ مطہر سے نکل آیئے کب تک آرام فرمائیں گے، ذرا امّت کی بربادی کو دیکھیے : ؎

بروں آور سر از بردِ یمانی کہ روئے تست صبح زندگانی !

یعنی چادر سے سرِ مبارک نکالیے۔ آپ کا چہرۂ مبارک امّت کے لیے باعثِ تسلّی ہے ۔ ؎

شب اندوہ ما را روز گرداں زرویت روزِ ما فیروز گرداں

ہمارے غم و مصیبت کی رات کو ختم کرکے خوشی و فرحت کا دن نکالیے ۔ آپ کے چہرۂ مبارک سے ہمارے دن کو فتح و نصرت کا دن بنائیے

؎ بہ تن در پوش عنبر بوئے جامہ بہ سر بر بند کافوری عمامہ

جسمِ مبارک پر عنبر کی بو رکھنے والے جامہ اور سرِ مقدس و مبارک پر کافوری عمامہ مزیّن فرمائیے ۔ ؎

ادیمِ طائفی نعلین پا کن ! شراک از رشتۂ جانہائے ما کن

طائف کے چمڑے کی نعلین قدمِ مبارک میں پہنیے ۔ اس نعلین کے تسمے ہماری جان کو بنائیے : ؎

جہانے دیدہ کردہ فرش راہند چو فرشِ اقبال پا بوس تو خواہند

ایک جہان دیدوں کا فرش بچھائے ہے ۔ آپ کے قدم بوسی کو اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔ ؎

زحجرہ پائے در صحنِ حرم نہہ بفرقِ خاکِ رہ بوساں قدم نہہ

حجرۂ مبارک سے حرم شریف کے صحن میں تشریف لائیے ۔ ہمارے سر آنکھوں پر چل کر سرفراز فرمائیے : ؎

بدہ دستے زپا افتادگاں را ! بکن دلدارئے دل دادگاں را

امّت کی کشتی مصائب کے بھنور میں پھنسی ہے ۔ اس کو پار لگائیے یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔ مصیبت زدوں کو تسلی دلائیے

حضرت جامی علیہ الرحمۃ والرضوان کی یہ گزارش سمع مبارک تک تو پہنچ چکی ہے ۔ اب امّتِ مسلمہ کا یہ معروضہ بھی قبول

فرمائیے ۔ جو رسمی اسلام پر چلنے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں ہم میں حقیقی عشقِ اسلام پیدا کر دیجئے :

حدیثِ قدسی میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے : كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

یعنی میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو تخلیق فرمایا ۔ مخلوق میں سب سے پہلے نورِ محمدی صلے اللہ

علیہ وسلم کو پیدا فرمایا ۔ جیسا کہ پیارے حبیب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ، اول ما خلق اللہ نوری و

کل خلائق من نوری : یعنی سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالےٰ نے میرے نور کو پیدا فرمایا اور میرے نور سے تمام مخلوق

کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کا مقصد عبادت اور معرفت گردانا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون: یعنی میں نے جن وانس اسی لیے بنائے کہ میری بندگی کریں۔ جس کی تفسیر حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لیعرفون سے کی ہے۔ یعنی عبادت کرنے سے، بندگی کرنے سے مراد معرفتِ الٰہی کا حصول ہے۔ معرفتِ الٰہی ایک عطیہ خداوندی ہے، آتشِ شوق و وجد ہے۔ عارف کو سوائے محبوبِ ازلی کے قرار نہیں ملتا۔ یار کے مشاہدہ سے ہی شاد رہتا ہے۔ عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ عارفین کے قلوب مشاہدۂ حق تعالیٰ اس حال میں کرتے ہیں کہ فقط حق ظاہر ہوتا ہے اور خلق مخفی۔ گویا وہ ہر شئے میں اسی کو دیکھتے ہیں۔ اور جملہ کائنات کا اسی کی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بیک وقت حاضر بھی ہوتے ہیں اور غائب بھی اور دونوں حالتوں میں صرف اللہ ہی کو موجود پاتے ہیں۔ الغرض وہ اللہ کو ظاہراً و باطناً اور اولاً و آخراً دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یعنی وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور وہی سب کو جانتا ہے۔ اور حدیث شریف میں یہ ارشاد بھی موجود ہے۔ وکان اللہ ولم یکن معہ شیء غیرہ: یعنی اللہ ہی تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے موجود نہیں تھی۔ اللہ کے سوا غیر معدوم تھا۔ وھو الاٰن کما کان اور وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ یعنی اب بھی حق تعالیٰ موجود ہے۔ اور غیر معدوم یعنی غیر موجود نہیں ہوا ہے۔ اس مطلب کو حضرت سید شاہ کمال الدین حسینی المتخلص بہ کمالؔ قدس سرہٗ نے ایک شعر میں بہت خوب فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیں: ؎

خدا موجود تھا اول نہ تھا غیر وہ غیر اب بھی عدم ہے گر تو سمجھے (کمالؔ)

حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے ارشاد فرمایا ہے، جو دراصل حضور اقدس نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا ارشاد ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچانا تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ جس کی وضاحت عام فہم انداز میں حضرت سید شاہ کمالؔ علیہ الرحمہ نے اس طرح فرمائی ہے: ؎

حق شناسی کا گر ہنر ہونا خود شناسی سے بہرہ ور ہونا

مطلب یہ ہے کہ معرفتِ خداوندی کا ہنر حاصل کرنے کے لیے سالک کو اپنی پہچانت کے علم سے خوب بہرہ ور ہونا لازمی ہے۔ آگے فرماتے ہیں: ؎

معرفت کی ہوا میں اڑنے کو عینیت غیریت دو پر ہونا

صوفیائے کرام کے نزدیک مسئلہ عینیت و غیریت بہت معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ ان حضرات کے نزدیک یعنی محققین صوفیائے کرام کے پاس خدا اور بندے میں نسبت عینیت حقیقی اور غیریت حقیقی کی ہے۔ خدا میں اور بندے میں حقیقی غیریت ہے اور حقیقی عینیت ہے جو اس مسئلہ کو خوب تحقیق کرلے گا وہی معرفت کے دیگر مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگا اور معرفت الٰہی حاصل کرکے خوب لطف اندوز ہوگا بفضلہ تعالےٰ۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں : ؎

خود بخود نیں خدا رسی ممکن ! پیر شاہ میر را ہبر ہونا !

صوفیائے کرام کے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ بغیر پیرِ کامل کی رہبری کے خدا رسی ممکن نہیں حضرت سید شاہ میر پیر قدس سرہٗ جیسے پیر کامل کے رہبری کی اشد ضرورت ہے۔

مختصراً و مجملاً علم معرفت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرت سید محمد میر حیات علیہ الرحمہ والرضوان قطبِ میسور کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں : ؎

ظاہری کا علم و فن وسواس ہے گُل ہی کیا وہ گُل نہ جس میں باس ہے

اس تمامی علم دفن پر خاک ہے من عرف کا جس میں نہ ادراک ہے

علم وہ ہے جس سے آوے بے خودی باخودی کا علم ہے سو سو بدی

تا دکھاوے علم رُو جس یار کا جہل اس سے خوب ہے سو بار کا

چوں کہ یہ دکنی اشعار بہت عام فہم ہیں اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اَلْحَقُّ مُرٌّ وَّلٰکِنَّ دُرٌّ کے تحت علمائے ظاہر تلخ حقیقت کو جو صوفیائے کرام کے نزدیک تحقیق شدہ ہے مان کر علم معرفت کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کریں جو اُن کے حق میں کیمیائے سعادتِ ابدی کی کنجی ثابت ہوگی۔ جب بندہ بفضلہٖ تعالےٰ و بطفیلِ حبیب اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم علم معرفت کو حاصل کرلیتا ہے وہی عارف باللہ کہلاتا ہے اور اسی کو شہود دیار کی لازوال نعمت میسر ہوتی ہے۔ جس سے وہ مست و مخمور و مسرور ہوجاتا ہے۔ اس کی زبان پر یہ دُعا گہرے دل سے نکلنے لگتی ہے : ؎

رکھ مجھے معرفت میں بے ہمتا علم اعلےٰ مثال دے یارب

ہے مقیدِ موتت فردا آج مطلق وصال دے یارب (شاہ کمالؔ)

ایسے ہی عارفین بصد ذوق و شوق حبیب اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع ظاہراً و باطناً خلوص و محبت سے

کرنے لگتے ہیں اور بمصداق اس آیتِ کریمہ کے : قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ، یعنی اگر تم اللہ کی محبت و دوستی چاہتے ہو تو میری (رسولِ کریم کی) اتباع کرو اللہ تم کو دوست بنا لے گا۔) یقیناً ان حضرات کو بہ سند اتباعِ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سعادتِ ابدی و عزتِ سرمدی حاصل ہو جاتی ہے ۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے بھی کیا خوب ارشاد فرمایا ہے، ملاحظہ ہو : ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں ۔۔۔ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد موجود ہے : یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (یعنی وہ اُن کو دوست رکھتا ہے اور یہ اس کو دوست رکھتے ہیں۔)

حضرت سلطان المحققین مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس اللہ سرہٗ اپنے ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں: " قیامت کے بعد ہر ایک شریعت مٹا دی جائے گی لیکن یہ دو چیزیں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہیں گی ۔ اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ (خدا کے لیے محبت اور خدا کی حمد و ثنا) کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے حج، جہاد، روزہ، نماز کے احکام منسوخ کر دیے جائیں مگر محبت کا پیمان منسوخ نہیں کیا جا سکتا اور بہشت میں روزانہ جس جس کی شکل تیرے سامنے آئے خداوند تعالیٰ کی معرفت کا ایک عالم تجھ کو نظر آئے گا کہ اس سے پہلے تو کبھی دیکھا نہ ہوگا۔ یہ ایسا کام ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور خدا نہ کرے کہ ختم ہو۔"

حضرت قدس سرہٗ نے دوسری جگہ یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ عارف کی جان کو معروف حسن کے ساتھ معرفت کی خلوت میں دم بدم اس قدر فتوحات ہوتے ہیں، جن کو اگر لکھا جائے تو دفتروں میں سمو نہیں سکتے ۔ ؎

در تنگنائے صورت معنی چگونہ گنجد ۔۔۔ در کلبۂ گدایا سلطاں چہ کار دارد

یعنی صورت کے تنگ مکان میں معانی کا وجود کیوں کر سما سکتا ہے ، فقیروں کی جھونپڑی سے بادشاہ کو کیا کام؟ اور اس راہ میں چلنے والوں کے لیے یہ شرط ہے کہ جب تک معروف (دیار) تک رسائی حاصل نہ ہو جائے خاموش نہ بیٹھے اور علم معرفت کا حصول زیادہ سے زیادہ کرتا جائے اور جستجو کا قدم اور بھی زیادہ بڑھاتا جائے ۔ اور جس قدر محبت کے پیالے سے شراب محبت زیادہ پیئے اور زیادہ طلب کرتا جائے تو پیاس بڑھتی ہی جائے گی۔

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے یہ اشعار بھی عشق و محبت سے متعلق ملاحظہ فرمائیں : ؎

خود عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی ۔۔۔ کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرارِ شہنشاہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

"الہاماتِ غوثیہ" میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہٗ سے ارشاد فرمایا: "اے غوث اعظم محب اور محبوب کے درمیان محبت ایک پردہ ہے۔ پس جب محب محبت سے فنا ہو جاتا ہے تو محبوب سے واصل ہو جاتا ہے"۔ ایک دوسرے الہام میں یہ ارشاد بھی موجود ہے، جو بہت غور طلب اور معنی خیز ہے۔ "پھر حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہٗ نے کہا میں رب تعالےٰ کو دیکھا (چشم بصیرت سے) اس نے کہا کہ اے غوث اعظم جو کوئی علم کے بعد (یعنی علم معرفت کے بعد) میری رویت کے متعلق پوچھے تو وہ علم رویت سے محجوب ہے (یعنی مشاہدۂ جمالِ الٰہی سے) اور جس نے بغیر علم کے رویت کے متعلق صرف گمان وقیاس کیا تو وہ حق تعالےٰ کی رویت کے بارے میں دھوکہ میں ہے"۔

برادرانِ طریقت کو اس حقیقت کی طرف ہمیشہ توجہ دینی چاہیے کہ معرفتِ الٰہی محبتِ الٰہی کا بیج ہے۔ جتنی معرفت زیادہ ہوگی اس کی آتشِ عشق تیز ہوتی جائیگی۔ اس سوختۂ عشق کو لذت وسرور اور رویتِ محبوب ومشاہدۂ مطلوب زیادہ حاصل ہوگا۔

بعض اولیائے کرام نے محبتِ الٰہی کے بھی تین درجے ومراتب قرار دیے ہیں ا، عام (۲) خاص (۳) اخص۔ اللہ تعالےٰ جس کسی کو بھی اپنی رحمتِ کاملہ خاصہ سے مختص فرمالیتا ہے تو عشق کی انتہا تک اپنے جذبِ کاملہ سے کھینچ لیتا ہے اور عاشق اور معشوق میں جو عشق کا پردہ ہے وہ اٹھ جاتا ہے اور شرابِ وصل میں مدہوشی کا عالم بیان سے باہر ہے۔ مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہٗ نے حضرت فرید الدین عطار قدس سرہٗ کے عشق سے متعلق فرماتے ہیں: ؎ (منظوم ترجمہ)

پھر لیے عطار ساتوں ملکِ عشق — ہم ابھی ہیں اک گلی کے موڑ پر

عشق کی انتہا تک پہنچنا اور عشقِ الٰہی میں مستغرق ہونا ہر کس وناکس کا کام نہیں یہ تو بڑے ہی جاں باز جواں مردوں کا کام ہے محبتِ الٰہی کے بارے میں یہ احقر زیادہ کیا تحریر کرسکتا ہے۔ برادرانِ طریقت کو چاہیے کہ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعلیمات کا کثرت سے مطالعہ کریں اور مشائخینِ کاملین کی صحبت اختیار کرکے ان کی زبانی معرفت ومحبت الٰہی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ کیوں کہ قال صحیح سے حال صحیح پیدا ہوتا ہے۔ علامہ اکبر الہ آبادی نے بھی کیا خوب کہا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

طوالت کے خوف سے اس مضمون کو یہیں پر اختتام کرتے ہوے حضرت سید شاہ کمال الدین حسینی قادری وچشتی جامی دکن قدس اللہ سرہٗ کی ایک صوفیانہ غزل "مخزن العرفان" سے منتخب کرکے مختصر سی شرح تحریر کرنے کی طرف اپنی توجہ کو مبذول

کرتا ہوں۔ برادرانِ طریقت وحقیقت سے پُرخلوص التماس ہے کہ جو کچھ سہو و لغزش واقع ہوی ہو تو براہ کرم اصلاح کرلیں اور اس احقر کے حق میں دعاے خیر فرمائیں۔ (الحمد للہ علیٰ ذالک)۔

پہلے غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں اور خوب لطف اندوز ہونے کی کوشش کریں: ؎

جو کوئی پایا اپس من کو اسے اس تن سے کیا مطلب
جو دیکھا من کے موہن کو اُسے پھر من سے کیا مطلب

فنا فی اللہ ہوا جس بقا باللہ کیا حاصل!
کھویا داں اُسے خود بینی و میں پن سے کیا مطلب

جو دنیا دین دونوں دے لیا ہے ایک مولا کو
اُسے تبجیل و قدر و جاہ و مال دھن سے کیا مطلب

جو کوئی غواص ہو دریائے وحدت میں لیا غوطہ
ملا دُرِّ یتیم اس کو اسے معدن سے کیا مطلب

کیا جو مزرع عقبیٰ میں حاصل تخم لاہوتی
اُسے اس کثرت ناسوت کے خرمن سے کیا مطلب

جو ہر صورت میں دیکھا ہے جمال شاہد معنی
اُسے رُخسار زشت و وجہ روشن سے کیا مطلب

کیا ہے عشقِ ذاتی سے نظر محبوب جس رُخ پر
اُسے تسبیح و ذکر و فکر و فن سے کیا مطلب

شہودِ غیب سے جو ہے خود غائب بحق حاضر
بجز ذوالمن کہے من اسکو ما و من سے کیا مطلب

جنے مرنے کے آگے مر ہوا ہے زندہ سرمد
کمالؔ الدین اسے پھر موت و جاں کندن سے کیا مطلب

مطلع میں ارشاد فرماتے ہیں، جو طالب صادق نفس کو مجاہدے کی بھٹی تپا کر کشتہ بنا کر تزکیہ کی دولت سے آراستہ ہو جاتا ہے تو اس کے من میں سوا ے حق سبحانہٗ کے دوسرا دھیان نہیں رہتا اور یادِ الٰہی میں اس قدر سرشار ہو جاتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت اور آخرت کی طرف بھی اس کی نظر نہیں جمتی۔ من کی دنیا پاکر مقام قدس میں ناز کرنے لگتا ہے۔ زن و فرزند کی فکر یعنی تن کی دنیا کا اندیشہ اس کے من میں نہیں گزرتا۔ وہ بظاہر دنیا میں معلوم ہوتا ہے مگر اس کا دل حضرت قدس کی تجلیات کی طرف متوجہ رہ کر من کی دنیا کا باشندہ ہو جاتا ہے۔ جب من کے موہن کا مشاہدہ یعنی جمال یار کا مشاہدہ چشم بصیرت سے کرنے لگتا ہے تو اپنے من کا ہوش بھی اڑ جاتا ہے۔ یہ نعمت پیر کامل کے طفیل ہی میں ملتی ہے۔

دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ جو اپنی ذات کو اللہ کی ذات میں فنا کر دیتا ہے یعنی فنا فی اللہ ہو جاتا ہے، وہ بقا باللہ کی لازوال نعمت سے مالامال ہو جاتا ہے۔ خود سے فانی ہو کر اللہ کی ذات سے باقی ہو جاتا ہے۔ اس جگہ صوفیائے کرام کا ایک قاعدہ کلیہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بندہ کتنا ہی عروج کرے خدا نہیں ہو جاتا اور خدا کتنا ہی نزول کرے وہ بندہ نہیں ہوتا۔ جس کو حضرت شاہ کمالؔ علیہ الرحمہ نے ایک شعر میں بہت خوب بیان فرمایا ہے: ؎

صوفیا کا یاد رکھ قاعدۂ کلیہ	خلق نہ ہو جائے حق عبد نہ ہو جائے رب

لہٰذا فرماتے ہیں کہ اے یارو ذرا بتاؤ کہ ایسے صوفیٔ با صفا عارف باللہ کو خود بینی اور میں پن سے کیا کام!

تیسرے شعر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو طالبِ مولا دُنیا اور آخرت سے زہدِ حقیقی اختیار کرکے اپنے مولا یعنی یار کو پالیتا ہے ایسے عاشقِ صادق کو تحجیل قدر و جاہ مال و دھن وغیرہ سے بھی کچھ سروکار نہیں۔ وہ تو اپنے مولا کی دھن میں دونوں جہان کو فراموش کردیتا ہے۔

چوتھے شعر میں فرماتے ہیں کہ جو عارف خدا کی محبت میں غواص کی طرح دریائے وحدت میں غوطے لگانے لگتا ہے تو اُسے دُرِّ یتیم مل جاتا ہے۔ یعنی وحدتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلّیات سے لطف اندوز ہونے کا شرف حاصل کرلیتا ہے۔ ایسے محبِ صادق عارف باللہ کے لیے پھر کسی اور خزانوں کے کان کی طرف رجوع ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

پانچویں شعر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کوئی آخرت کی کھیتی میں لاہوتی بیج بو کر وحدت کی سیر کرنے لگتا ہے تو اسے ناسوتی دنیا کی کثرت میں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ یعنی اس کثرت ناسوت کے خرمن سے اس کو کوئی دلچسپی و لگاؤ نہیں۔

چھٹے شعر میں بڑے راز کی حقیقت کو منکشف فرما دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو عارف جمال شاہدِ معنی یعنی اپنے یار کا مشاہدہ ہر صورت میں کرنے لگتا ہے تو اس کی توجہ بدصورتی اور خوبصورتی پر نہیں رہتی کیوں کہ مشاہدۂ جمال یار میں مستغرق ہونے کی وجہ سے اس کی نظر سے صورتوں کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔ شہود یار بے نقاب حاصل ہونے کی لذت کو صوفیائے کرام مقام یافت و شہود سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ جو وجدانی کیفیت ہے۔

ساتویں شعر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ عشقِ الٰہی میں مستغرق رہنے والے پر اپنے یار کے ذاتی عشق کی نظر پڑتی ہے۔ تو وہ محبوب الٰہی اور معشوق الٰہی ہو جاتا ہے۔ قربِ الٰہی میں شرابِ وصل سے مسرور و مخمور ہو جاتا ہے تو پھر ایسے مقامِ قرب میں تسبیح و ذکر و فکر و فن وغیرہ کی طرف اس کا دھیان نہیں رہتا۔ اس مقام میں واصل کو وصلِ یار ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو جاتا ہے۔ بمصداق: ؎

دیدِ مطلق کی جس کو مئے نوشی	کب ہوئے زائل اس کی مدہوشی	(شاہ کمالؒ)

آٹھویں شعر میں ارشاد فرماتے ہیں جو عارفِ کامل اللہ کی محبت میں اپنے آپ سے غائب ہو کر یعنی پوشیدہ ہو کر حق سے حاضر ہوتا ہے یعنی جو بندہ عشق الٰہی میں غرق ہو کر خدا نما ہو جاتا ہے ایسے عارفِ کامل دل میں نظر میں یادِ الٰہی بس جاتی ہے بجز یادِ الٰہی کے میں و تو کی یاد اس کے من سے فراموش ہو جاتی ہے اور اس کی حالت ایسی ہوتی ہے: ؎

بسا میری نظروں میں تُو اس قدر ہے　　　جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

نویں شعر میں جو مقطع ہے ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بھی صوفی باصفا عارف باللہ مرنے کے آگے مرجاتا ہے اضطراری موت سے پہلے اختیاری موت سے مرجاتا ہے وہ زندۂ جاوید ہوجاتا ہے۔ بمصداق موتوا قبل ان تموتو کے۔ فرماتے ہیں کہ کمال الدین جو مرنے کے آگے مرچکا ہے اور زندۂ جاوید ہوچکا ہے، اس کو ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ہاتھوں جاں کندنی کی موت سے کیا کام۔ اللہ رب العزت کا یہ پیغام سنانا ہی کافی ہے: یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الیٰ ربك مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی: اے نفسِ مطمئن اپنے رب کی طرف راضی ومرضی سے لوٹ جا اور اس کی عبادت کرنے والے بندوں میں شامل ہوجا اور اس کی جنت میں داخل ہوجا۔ حضرت مولانا فریدالدین عطار قدس اللہ سرہٗ نے بھی اپنے ایک شعر میں بہت خوب ارشاد فرمایا۔ ؎　(منظوم ترجمہ)

موت سے پہلے تو اگر مرجاے　　　مثلِ سیماب مارنا دشوار

کسی عارف کا یہ شعر بھی بڑا عمدہ شعر ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو: ؎

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا　　　نیست رہ در بارگاہ کبریا

(اردو ترجمہ)

جب تلک بندہ نہیں ہوتا فنا　　　رہ نہیں ملتی اسے سوائے خدا

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ محض اپنے خاص فضل وکرم سے اپنی محبت ومعرفت عطا فرمائے اور ہم برادرانِ طریقت وحقیقت کو سلوک حقیقی طے کرنے کی توفیق بخشے اور اپنے جذبِ کامل سے اس کے قرب ووصل کی نعمت بھی عطا فرمائے۔ بطفیل حبیب اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

اُمُّ المؤمنین

حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

بنت حیی بن اخطب

محمد شریف برکاتی - آمبور

خواب (۱) "یثرب (مدینہ) سے ایک چاند طلوع ہوا اور وہ میری گود میں آگرا۔"

خواب (۲) "میں نے خواب دیکھا کہ میں اُس ہستی کے ساتھ ہوں جنھیں لوگ اللہ کا رسول مانتے ہیں اور ایک فرشتہ ہم دونوں کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے ہے۔"

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اُسے قبول کرلو تو میں تمھیں عزت واحترام کے ساتھ اپنے پاس رکھ لوں گا اگر اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتی ہو تو تم کو تمھاری قوم کے پاس واپس بھیج دوں گا۔"

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہجرت سے دس سال پہلے مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔ آپؓ کا شجرۂ نسب باپ کی طرف سے صفیہؓ بنت حُیی ابن اخطب ابن سعید ابن عامر ابن عبید ابن خزرج ابن ابی جبیب ابن نضیر ابن تخام ابن ینحوم اور یہ سلسلہ بنی اسرائیل کے عظیم و جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ ماں کا نام برّہ تھا جو قبیلۂ بنی قریظہ کے سردار سموئیل کی بیٹی تھیں۔

حُیی ابن اخطب قبیلۂ بنی نضیر کا سردار، تورات کا بڑا عالم، سیادت، علمی وجاہت اور نبوت کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے تمام یہودیوں میں ایک خاص مقام اور اہم شخصیت کا حامل تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی (اُم المومنین کا چچا) ابو یاسر ابن اخطب بھی ایک اہم مقام کا حامل تھا۔ حضور اکرمؐ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اس وقت مدینہ میں قبیلۂ بنی نضیر، قبیلۂ بنی قینقاع اور قبیلۂ بنی قریظہ آباد تھا۔ قبیلۂ بنی قینقاع ہجرت کر کے مدینہ آبا تھا یا شاید یہیں کا کوئی عرب قبیلہ

تھا جو یہودیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ زراعت پیشہ اور لوہار تھے۔ دوسرے یہودی قبائل کے مقابلہ میں مشہور اور طاقتور تھے، ہجرت کے بعد حضور اکرمؐ نے تمام قبیلوں سے اجتماعی معاہدے کئے تھے۔

قبیلۂ بنو نضیر صدیوں پہلے قبیلۂ بنو قریظہ کے ہمراہ ملکِ شام سے ہجرت کر کے آیا تھا اور مدینہ کے جنوب مشرق وادیٔ بطحان میں آباد تھا۔ اس قبیلہ سے بھی حضور اکرمؐ کا معاہدہ تھا۔ سیّدہ صفیہؓ اسی قبیلہ بنو نضیر کے سردار حیی ابن اخطب کی بیٹی تھی۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ مذہبی اور علمی سیادت اور نبوت کے خاندان میں ہونے کی وجہ سے لاڈو پیار، ناز و نعم سے پرورش پائی تھیں۔ ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں نشو و نما پائیں، صحیح اور غلط، حق اور باطل میں تمیز، سمجھ دار، تہذیب و شائستگی کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھیں۔ اپنی اچھی اور دل پسند عادات و اطوار کی وجہ سے خاندان بھر میں ہر دلعزیز تھیں۔ ان کے باپ اور چچا دونوں سب سے زیادہ ان سے محبت کرتے تھے۔ جب بھی وہ ان کے پاس جاتیں تو وہ سب کو چھوڑ کر ان کی طرف متوجّہ ہو جاتے تھے۔

جب حضرت صفیہؓ چودہ[۱۴] سال کی عمر کو پہنچیں تو آپؓ کی شادی یہودیوں کے نامور شہسوار، بہادر، شاعر سلام بن مشکم سے ہوی جو اسلام دشمنی میں نمایاں تھا۔ قبیلۂ بنو نضیر کا فرد تھا۔ طبقات میں اسے قریظی لکھا ہے، دیگر سیرت نگاروں نے اس کا تعلق بنی نضیر سے جوڑا ہے اس قبیلہ کے اسلام دشمن افراد کی فہرست میں اس کا نام بہت نمایاں ہے۔ اس نے اپنی تلوار اور زبان سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام لیا ہے۔

ہجرت مدینہ کے دو[۲] سال بعد ابو سفیانؓ ملکِ شام سے تجارت کے بعد جنگی سامان اور ہتھیارات خرید کر لا رہا ہے تاکہ مکہ پہنچ کر بڑا لشکر لے کر مدینہ میں بسے مسلمانوں اور حضور اکرمؐ کو ختم کر دے۔ اس کی اطلاع ملتے ہی حضور اکرمؐ نے یہی مناسب سمجھا کہ اس جنگی سامان کو مکہ پہنچنے نہ دیا جاے۔ آپؐ نے مدینہ سے تین سو تیرہ[۳۱۳] مسلمان جن میں ساٹھ[۶۰] مہاجر تھے اور باقی انصار تھے، تیار ہو کر مدینہ سے اسّی میل دُور بدر نامی گاؤں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابو سفیانؓ راستہ بدل کر جنگی سامان بچا لے گیا۔ مکہ سے ایک[۱] ہزار کافر جنگ کے لیے آرہے ہیں۔ رمضان کی سترہ[۱۷] تاریخ کو بدر کے میدان میں دونوں نے پڑاؤ ڈالا۔ حضور اکرمؐ نے دستِ دعا بلند کیا اور رب العالمین سے عرض کی: قریش کے یہ کافر بڑے غرور اور تکبّر سے آئے ہیں تاکہ تیرے اس بندے کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ اے رب تیری مدد آجائے جس کا تُو نے وعدہ کیا ہے۔ اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو اس زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ جنگ میں کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا ماموں، یا چچا، بھتیجا، بھانجا صف آرا تھے۔ اسلام کے یہ تین سو تیرہ[۳۱۳] شیدائی اور رسولؐ کے ماننے والوں نے رشتوں کو بالائے طاق رکھا اور جنگ میں کاٹ کر پھینک دیا۔

جنگِ بدر کے بعد حضور اکرمؐ مدینہ واپس آئے۔ مسلمان خرید و فروخت کے لیے بنی قینقاع کے بازار میں آتے جاتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ستانا شروع کر دیا، مسلمان برداشت کرتے رہے۔ ایک دن ایک مسلمان عورت کو سرِ عام ننگا کر دیا۔ برداشت سے باہر بات تھی۔ فساد ہو گیا، یہودی اور مسلمان جھگڑنے لگے۔ اس فتنہ میں ایک مسلمان اور ایک یہودی مارے گئے۔ حضور اکرمؐ کو اس واقعہ

کی اطلاع ملتے ہی بنی قینقاع کے محلہ تشریف لے گئے اور لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا : معاہدہ کا پاس و لحاظ رکھنا لازمی ہے اور ایسی حرکتوں سے باز آنا چاہیے، جس سے فساد اور فتنہ کا اندیشہ ہو۔ امن وامان کی فضا خراب ہو۔ یہودیوں نے جواب دیا: "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شاید ہمیں آپؐ نے قریش سمجھ لیا ہے، ان کو لڑنا کیا آئے، ہمارے ساتھ لڑو گے تو معلوم ہوگا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں" یہ بات معاہدہ کے خلاف تھی حضور اکرمؐ کے حکم سے مجاہدین اسلام نے بنی قینقاع کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کی تاب نہ لا کر پندرہ ۱۵ دن میں بنی قینقاع نے ہتھیار ڈال دیے تمام قابل جنگ مردوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو قتل کرنے کی بجائے رحمۃ للعالمینؐ نے حکم دیا کہ بنی قینقاع کے لوگ اپنے اسلحہ اور آلاتِ صنعت چھوڑ کر مدینہ خالی کر جائیں۔ اس حکم کے ساتھ بنی قینقاع ملک شام کی طرف چلے گئے۔

قبیلۂ بنی قینقاع کی معاہدہ خلافی اور جلاوطنی کے بعد سیدہ صفیہؓ کے قبیلۂ بنونضیر نے بھی بغاوت اور سرکشی شروع کردی۔ بنو قینقاع کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے معاہدہ سے منحرف ہونے کی روش اختیار کی۔ تفصیل یوں ہے کہ حضور اکرمؐ چند صحابہؓ کے ساتھ ان کے محلہ میں تشریف لے گئے تاکہ خون بہا کی ادائیگی کے معاملہ میں اُن سے مشورہ کیا جائے۔ قبیلہ والوں نے سازش کی کہ حضور اکرمؐ پر پتھر گرا کر ختم کرا دیا جائے۔ سازش کے مطابق حضور اکرمؐ کو باتوں میں لگا کر اس مکان کی طرف لے گئے جس کی چھت پر ایک شخص بھاری پتھر لیے تیار تھا، تاکہ مکان کی دیوار کے سایہ میں تشریف لائیں تو پتھر آپؐ پر گرا دے۔ اللہ نے حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ آپؐ کو اس سازش کی خبر دیدی آپؐ فوراً وہاں سے اٹھے اور مدینہ تشریف لے گئے۔ بنونضیر کی عہد شکنی کی وجہ سے آپؐ نے بغیر کسی رعایت کے انھیں الٹی میٹم دیدیا کہ: "تم نے جو غداری کی سازش کی اس کا مجھے علم ہوگیا، دس دن کے اندر اندر مدینہ خالی کر کے نکل جاؤ۔ جو بھی رہے گا اس کی گردن ماردی جائے گی"۔ انھوں نے مدینہ خالی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے پیغام بھیجا کہ" میں دو ہزار آدمیوں سے تمہاری مدد کروں گا، میرے ساتھ قبیلۂ بنو قریظہ اور عرب کا مشہور جنگجو قبیلہ بنو غطفان بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔ تم ڈٹ جاؤ اور مدینہ ہرگز نہ چھوڑو۔"

عبداللہ بن ابی کے پیغام کے ملنے کے بعد یہودیوں نے حضور اکرمؐ کے الٹی میٹم کے جواب میں کہلا بھیجا۔" ہم مدینہ سے نہیں نکلیں گے، آپؐ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لیجئے"۔ ان کا جواب پا کر حضور اکرمؐ نے ربیع الاول ۴ھ میں ان کا محاصرہ کر لیا۔ بہت ہی سخت محاصرہ تھا، پندرہ ۱۵ دن کے اندر اس شرط پر مدینہ چھوڑنے پر راضی ہوگئے کہ اسلحہ کے سوا جو کچھ بھی وہ اپنے اونٹوں پر لاد سکیں لے جائیں گے۔ اور قبیلہ کا سردار حُیی بن ابی اخطب (حضرت صفیہ کے والد) نے اللہ کو ضامن رکھ کر وعدہ کیا کہ وہ اہل اسلام اور رسول اکرمؐ کی نہ خود مخالفت کرے گا اور نہ دوسروں کو ان مخالفت پر آمادہ کرے گا۔

بنی نضیر کے یہودی ذلیل وخوار ہوتے ہوئے بھی مدینہ چھوڑ کر جانے لگے تو بڑا جشن منایا، خوشی اور سرمستی اور مسرت کا اظہار کیا۔ قافلہ اس شان سے چلا کہ حسین اور دلکش گانوں سے فضا بھر گئی، مشہور شاعر عروہ عبسی کی بیوی جو بے مثال حُسن وجمال اور قدرت کا شاہکار تھی

اپنی مترنم آواز سے جادو بھرے گیت گائے۔ نوجوانوں کا ہجوم اُن کے گرد جمع ہو کر مستی، سرخوشی اور مدہوشی کے عالم میں جھومنے لگا۔ رسوائی اور ذلت پر جشن منایا گیا۔ حمیت اور غیرت کے جنازے نکلے۔ مورخوں نے لکھا کہ بے غیرتی، بے عزتی کے عالم میں ایسا شان والا و طمطراق والا قافلہ لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس قافلہ میں حُیی بن اخطب کی سیدہ صفیہؓ بھی شامل تھیں۔ یہ قافلہ مدینہ سے آٹھ منزل کی دُوری پر واقع خیبر کی طرف روانہ ہوا۔ خیبر بہت سرسبز اور شاداب علاقہ تھا۔ یہودیوں نے یہاں مضبوط اور مستحکم قلعے تعمیر کئے تھے۔ یہ علاقہ ملک شام کے راستہ پر ہے۔

خیبر والوں کو بنی نضیر کی جلاوطنی کی خبر ملی تو لوگ اس قبیلہ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جب قافلہ کو دیکھا اور حُیی بن اخطب پر نظر پڑی تو راستہ میں کھڑے ہو گئے۔ اہلِ خیبر نے شان دار استقبال کیا۔ حُیی بن اخطب توریت کا عالم، سیادت اور علمی وجاہت کے علاوہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے یہودیوں میں منفرد اور بلند مقام رکھتا تھا۔ خیبر والوں نے اس کو اپنا پیشوا بنا لیا۔

صفیہ بنت حُیی بن اخطب کا اصلی نام زینب تھا۔ فتح خیبر کے بعد حضور اکرمؐ کے حصّہ میں آنے کی وجہ سے صفیہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ قد میانہ تھا، حسین و جمیل تھیں۔ نیک اخلاق، صابر، ہمدرد، جود و سخا والی تھیں۔ ایک دن تنہا بیٹھی تھیں کہ باپ اور چچا کی بات چیت کی آواز کانوں میں پہنچی:

باپ: (حُیی بن اخطب)؛ سنا ہے مکہ کی وہ ہستی جس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ہجرت کر کے مدینہ آگئی ہے اور قبا میں قیام ہے۔ چلو اس سے ملنے چلیں۔ ہماری کتابوں میں آخری نبی کی کچھ نشانیاں مذکور ہیں۔ ان سے مل کر دیکھیں۔

چچا (ابو یاسر بن اخطب): نے پوچھا، اگر یہ ہستی وہی آخری نبی ہوی تو؟ حُیی بن اخطب نے کہا: یہ بعد کی بات ہے۔

دونوں بھائی بارگاہِ نبوت میں پہنچے۔ انھیں عزت سے بٹھایا گیا۔ حُیی بن اخطب نے آپؐ سے مختلف سوالات پوچھے۔ حضور اکرمؐ نے تشفی بخش جواب دیے۔ شام تک دونوں نے آپؐ کے اخلاق و عادات، بات چیت کا انداز، لوگوں سے حسنِ سلوک، میل ملاپ، ارشادات و ہدایات کے طور طریقوں کا بغور جائزہ لیا۔ شام کو واپس گھر لوٹ آئے۔ دونوں بھائی راستہ میں یوں گویا ہوئے "محمدؐ بن عبداللہ ہی نبئ برحق ہیں۔ یہی نشانیاں ہماری کتابوں میں درج ہیں۔ یاسر نے حُیی سے پوچھا: اب کیا ارادے ہیں؟ حُیی نے جواب میں کہا: مرتے دم تک ان کی مخالفت کروں گا اور ان کی راہ میں جتنی مشکلات کھڑی کر سکتا ہوں کرتا رہوں گا۔"

سیدہ صفیہؓ نے دونوں کی یہ بات چیت بھی سُنیں۔ باشعور تھیں، خیر و شر، حق و ناحق کا ادراک رکھتی تھیں۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا: میرا باپ تورات کا عالم ہونے کے باوجود اللہ کے نبی کی مخالفت پر کمر بستہ ہے اور نبی کی مخالفت کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس پر ذلت و رسوائی مسلط ہو جاتی ہے۔ فرعون کا انجام یاد آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں سمیت پانی میں غرق ہوا۔ ان خیالات کا آنا تھا کہ باپ کا مقام گر گیا۔ قلب میں اسلام اور حضور اکرمؐ کی محبت اُجاگر ہونے لگی۔

آپؓ کے پہلے شوہر سلام بن مشکم جو تیز مزاج اسلام دشمن تھا۔ اس کے برخلاف حضرت صفیہؓ نرم مزاج بردبار عاقلہ تھیں۔ اور زہد و عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں میں نباہ نہ ہو سکا۔ اس نے آپؓ کو طلاق دے دی حُیی بن اخطب کو اپنی بیٹی کے نکاح کی فکر لگی تھی۔ خیبر آنے کے بعد کنانہ بن ربیع ابن ابی الحقیق کا پیغام آیا۔ باپ نے رشتہ قبول کر لیا۔ دونوں کا نکاح ہو گیا اور آپؓ اپنے خاوند کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں۔

مدینہ میں کئی اور یہودی قبائل بھی رہتے تھے جن میں تورات کے عالم بھی تھے۔ سب سے پہلے حضرت عبداللہؓ بن سلام جو حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اسلام قبول کیا اور اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔ اپنے قبیلے کے سردار کے بیٹے تھے۔ قبیلے کے سامنے جب اپنے اسلام لانے کی بات ظاہر کی تو قبیلہ والوں نے آپؓ کو خوب برا بھلا کہا، جھوٹا اور کاذب کہا اور ان سے الگ ہو گئے۔ حُیی بن اخطب خیبر کے یہودیوں کا سردار بننے کے بعد دوسرے سرداروں کے ساتھ پورے عرب کا دورہ کیا۔ مکہ میں قبیلۂ قریش، بنی غطفان، قبیلۂ ہذیل اور دوسرے قبائل کو اُکسایا اور ان سب نے مل کر بڑی فوج جمع کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کو مٹا دینے کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔ اس کا علم حضور اکرمؐ کو ہو گیا حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے اور مشورہ پسند آیا اور آپؐ نے سلع کی جانب خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بھی اس میں شریک ہو گئے۔ مدینہ میں آباد یہودیوں کا قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں کے حلیف تھے حُیی بن اخطب نے بڑی چالاکی سے انھیں غداری پر ابھار دیا۔ انھوں نے حضور اکرمؐ سے کہلا بھیجا کہ "ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں" شیدائیان اسلام اور حضور اکرمؐ نازک حالات میں گھرے ہوئے تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۱۰ اور ۱۱ میں آیا ہے۔ حضور اکرمؐ کی دانشمندی حکمت عملی اور عسکری قیادت، اللہ کا فضل اور مدد سے کفر کی متحدہ طاقت و قوتِ اہلِ ایمان کی عزیمت، استقامت اور جان نثاری سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ حضور اکرمؐ نے قبیلۂ قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ سے تنگ آ کر بنی قریظہ نے اپنے حلیف قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کو ثالث تسلیم کر لیا۔ سعد بن معاذؓ نے فیصلہ سنایا کہ قبیلہ قریظہ کے تمام مرد قتل کر دیے جائیں، عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے ان کی املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے۔ جب مسلمان ان کے علاقہ میں پہنچے تو دیکھا کہ ان غداروں نے پندرہ سو تلواریں، زرہیں اور ہزاروں نیزے اور ڈھالیں فراہم کر رکھی تھیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے عین مدینہ کے عقب سے حملہ کرتے وقت معلوم ہو گیا حضرت سعدؓ کا فیصلہ حق پر تھا۔ اس کی تائید قرآنِ پاک سورۂ احزاب کی آیات ۲۶ اور ۲۷ سے معلوم ہوتی ہے۔

سعد بن معاذؓ کے فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ بنو قریظہ کے تمام مرد تہ تیغ ہوئے جن کی تعداد چار سو اور سات سو کے درمیان تھی۔ ان مجرموں میں سیدہ صفیہؓ کے باپ حُیی بن اخطب بھی تھا۔ وہ جب مقتل میں آیا تو حضور اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا:

"میں نے اپنے آپ کو تیری مخالفت، دشمنی اور عداوت پر افسوس نہیں کرتا۔ اللہ جس کو رسوا کرے اسے عزت نہیں ملتی۔ جو اللہ کو چھوڑ دے اللہ بھی اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل ہونی چاہئے۔ یہ ایک سزا ہے جو بنی اسرائیل کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ میں ایسا کر کے عزت تلاش

کی۔ حق تعالیٰ نے مجھے مغلوب اور تجھے ظفر مند فرمایا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے تلوار کھینچی اور اس کی گردن اڑا دی۔ حُیی بن اخطب کے قتل کے بعد ابو رافع بن ابی الحقیق جو حضرت صفیہؓ کے شوہر کنانہ کا چچا تھا، سردار بنا۔ اس نے بھی اسلام دشمنی میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی اور اپنی جان حق دشمنی میں کھو دی۔ ۶ھ میں کنانہ بن ربیع سردار ہوا۔ بنی غطفان کے ساتھ مل کر خیبر کو اسلام دشمنی کا مرکز بنا دیا۔ مدینہ پر چڑھائی کر کے حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کو مٹا دینے کی سازش کرتا رہا۔ اس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ اس کی تمام خبریں جاسوسوں کے ذریعہ حضور اکرمؐ کو ملتی رہیں۔ آپؐ نے امن و سلامتی کے لیے بار بار سفارتیں بھیجیں، خطوط بھی لکھے۔ لیکن اُن کے دلوں پر ہٹ دھرمی، ضد، تعصب، نسلی غرور، نفس پرستی کا قبضہ تھا۔ ٹس سے مس نہ ہو سکے۔

سیدہ صفیہؓ نے خواب دیکھا تھا کہ "میں اس ہستی کے ساتھ ہوں جنھیں لوگ اللہ کا رسول مانتے ہیں اور ایک فرشتہ ہم دونوں کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے ہے۔" یہ خواب جب اپنے گھر والوں کو سنایا تو خاندان والوں نے انھیں برا بھلا کہا۔ پھر آپؓ نے ایک اور خواب دیکھا کہ "یثرب سے ایک چاند طلوع ہوا اور وہ میری گود میں آگرا۔" اس خواب کا ذکر انہوں نے اپنے شوہر کنانہ بن ربیع سے کیا تو وہ غضبناک ہو گیا اور کہا: "اچھا تو مدینہ کے بادشاہ کی ملکہ بننا چاہتی ہے۔" پھر جذبۂ غیرت سے بھر کر آپؓ کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا جس کا نشان بہت دنوں تک آپؓ کے چہرہ پر موجود تھا۔ آپؓ کے یہ دونوں خوابوں کا حرف بہ حرف صحیح ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

۶ھ ہجری میں صلح حدیبیہ کی شکل میں صلح اور آشتی کی فضا پیدا ہو گئی۔ خیبر پورے عرب میں اسلام دشمنی کا بہت بڑا مرکز بن گیا تھا۔ خیبر کے یہودیوں کی جنگی تیاریوں اور ریشہ دوانیوں کی تصدیق ہو گئی کہ بنی غطفان اور دوسرے قبائل سے مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضور اکرمؐ اپنے سولہ سو جانبازوں کو لے کر خیبر کی طرف اتنی تیز رفتاری سے بڑھے کہ آٹھ منزلوں کا راستہ صرف تین دنوں میں طے کیا اور مقام رجیع میں ڈیرے ڈال دیے۔ یہ مقام غطفان کے علاقہ اور خیبر کے درمیان واقع تھا۔ بنی غطفان خیبر والوں کی مدد کے لیے اپنے گھروں سے نکلنے سے رہ گئے۔ لشکر اسلام کی آمد کی خبر خیبر والوں کو ہوئی تو قلعہ بند ہو گئے۔ فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ قلعہ ناعم حضرت علیؓ کی قیادت میں فتح ہوا۔ اس کے بعد جنگیں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں میں یہودیوں کے بہت سے قلعوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا گیا۔ یہودی مایوس ہو گئے۔ آخر کار یہودیوں نے جاں بخشی کی شرط پر صلح کر لی۔ مسلمانوں اور حضور اکرمؐ کو کسی طرح یہ خبر ہو گئی کہ بنی نضیر کے خزانے کنانہ بن ربیع کے پاس ہیں۔ اُسے دربارِ نبوت میں طلب کیا گیا۔ حضورؐ نے خزانے کے بارے میں دریافت فرمایا تو اُس نے کہا۔ "ہم نے اُسے خرچ کر دیا۔" حضور اکرمؐ کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی اور قسم کھائی۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: "اس کے خلاف ظاہر ہوا تو تمہارا خون مباح ہے اور امان سے نکل جاؤ گے۔" اُس نے کہا: "بے شک۔" حضرات شیخین اور یہودیوں کی ایک جماعت کو اس پر گواہ بنایا۔ آپؐ نے حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں صحابہؓ کی ایک جماعت اس ویرانہ کی طرف بھیجی جہاں خزانہ دفن تھا۔ یہ ویرانہ میں پہنچے اور کھود کر مال باہر نکالا اور حضور اکرمؐ کے روبرو لے آئے۔ کنانہ اور اس کے ساتھیوں کا جھوٹ ثابت ہو گیا۔ لہٰذا امان اٹھ گئی۔ آپؐ نے کنانہ بن ربیع کو حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے حوالے

کردیا۔ انھوں نے اپنے بھائی محمودؓ بن مسلمہ کے قصاص میں قتل کردیا۔

فتح خیبر کے بعد گرفتار شدہ قیدیوں کو دربار نبوت میں پیش کیا گیا۔ ان قیدیوں میں اور عورتوں کے ساتھ صفیہ بنت حُیی بن اخطب بھی تھیں۔ حضرت دحیہ کلبیؓ بارگاہِ نبوت میں ایک لونڈی کی درخواست پیش کی جو قبول ہوی حضورؐ کی اجازت پاکر انھوں نے صفیہ بنتِ حُیی کو چن لیا چند صحابہؓ آپؐ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ دحیہ کلبی نے صفیہ کو لیا ہے جو بنی نضیر کے سردار کی بیٹی اور بنی قریظہ کی رئیسہ ہے۔ شرافت، نجابت عزت و وقار سے بھرپور یہ آپؐ کے سوا کسی اور کے لائق نہیں۔ حضور اکرمؐ نے دحیہ کلبیؓ کو طلب کیا کہ وہ صفیہ بنت حُیی کے ساتھ حاضر ہوں۔ جب حاضر ہوے تو آپؐ نے صفیہ کو اپنے لیے لے لیا اور انھیں دوسری لونڈی عطا کی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ قیدیوں کے کیمپ کے معائنہ کے لیے تشریف لے گئے تو صفیہ بنت حُیی نے آپؐ سے عرض کیا: "میں اپنی قوم کے سردار کی بیٹی ہوں، میری حیثیت کا خیال کرکے مجھ سے سلوک کیا جاے۔" حضورؐ اکرم نے آپؓ کی بات سن لی اور آپؓ کو دحیہ کلبیؓ سے لے لیا گیا۔ (اسد الغابہ) حضور اکرمؐ نے صفیہ بنت حُیی سے فرمایا: "میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں اگر اسے قبول کرلو تو تمھیں عزت واحترام سے اپنے پاس رکھوں گا۔ اگر اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتی ہو تو تم کو تمہاری قوم کے پاس واپس بھیج دوں گا۔"

حضور اکرمؐ کے اس رحیمانہ اور کریمانہ ارشاد نے صفیہؓ بنت حُیی کے ذہنی اسکرین پر چھ سال پہلے کے واقعات ابھر آے۔ باپ اور چچا کی گفتگو، نبیٔ آخر الزماں کو پہچان لینے کے باوجود انؐ کی مخالفت، مزاحمت اور اس کا دردناک انجام، پہلے اور دوسرے شوہر کی اسلام دشمنی کا انجام قبیلۂ قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر کی تباہی وغیرہ۔ صفیہ بنتِ حُیی نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! میں نے اپنے دل ودماغ کو اللہ اور اس رسولؐ پر ایمان کے نور سے منور کرلیا ہے۔ اب یہودیت اور یہودیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اسلام سے وابستہ ہوچکی ہوں۔"

حضور اکرمؐ نے آپؓ سے نکاح فرمایا اور اُن کی آزادی کو اُن کا مہر قرار دیا۔ یہ تقریب جمادی الاول ۷ھ ہجری میں ہوی۔ بی بی صفیہؓ اُن دنوں عورتوں کی مخصوص حالت میں تھیں۔ خیبر کی فتح کے بعد حضور اکرمؐ چند روز یہیں قیام فرمایا اور امن وامان کی بحالی فرماتے رہے۔ اسی دوران یہودیوں نے آپؐ کی دعوت کی۔ باوجود یہودیوں کی سرشت اور فطرت سے واقفیت رکھتے ہوئے بھی مروت اور احسان کے جذبے سے دعوت قبول فرمائی۔ سلام بن مشکم کی دوسری بیوی زینب بنتِ حارث، جو بیوہ ہوچکی تھی گوشت میں زہر ملا دیا۔ سلام بن مشکم کی طرح یہ اسلام کی دشمن تھی۔ حضور اکرمؐ نے پہلا لقمہ لیا ہی تھا کہ تھوک دیا اور کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ آپؐ کے ساتھ بشیر بن براءؓ بھی شریک طعام تھے۔ انہوں نے لقمہ چبا کر نگل لیا۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: "گوشت مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں زہر آلود ہوں۔" پھر بیوۂ سلام بن مشکم کو بلایا گیا۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: "آپؐ نے میری قوم کا جو حال کیا ہے وہ معلوم ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اگر عام بادشاہ ہیں تو اس زہر کے ذریعہ ہمیں نجات مل جائے گی۔ اگر آپؐ واقعی اللہ کے رسولؐ ہیں تو زہر کی خبر اللہ کی طرف سے ہوجائے گی۔"

حضور اکرمؐ نے اس مجرم عورت کو اپنی ذات کی خاطر بدلہ نہ لینے کا فیصلہ کر کے اُسے کچھ نہ کہا۔ البتہ تین دن کے بعد حضرت بشیرؓ بن براء زہر کے اثر سے شہید ہو گئے تو ان کے قتل کے جرم کے قصاص میں اس عورت زینب بیوہ سلام بن مشکم کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے مدینہ جانے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت تک حضرت صفیہؓ نہا دھو کر پاک صاف ہو چکی تھیں۔ واپسی کے لیے اونٹ لایا گیا۔ آپؐ نے اپنی رانِ مبارک کو زینہ بنایا۔ حضرت صفیہؓ نے کہا: "میں اس طرح اونٹ پر سوار نہیں ہوں گی یا رسول اللہ!" دریافت فرمایا: "کیوں؟" تو آپؓ نے جواب دیا: "یہ ادب کے خلاف ہے۔" تب آپؓ نے اپنا گھٹنہ آپؐ کی رانِ مبارک پر رکھا اور اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ آپؐ نے پردہ کا انتظام فرمایا اور سوئے مدینہ چل پڑے۔ تمام صحابہؓ کرام ہمرکاب تھے۔ مقامِ تباء جو خیبر سے چھ میل دُور ایک منزل تھی آپؐ نے خلوت چاہی تو بی بی نے انکار فرما دیا۔ اگلی منزل صہبا تھی جو خیبر سے دو رتھی، حضور اکرمؐ کے حکم سے حضرت اُم سنان اسلمیہ آمنہ بنت ابی القیس غفاریہ نے بی بی کو سنوار سنگھار کر دلہن بنایا۔ بی بی کی عمر سترہ سال کی تھی۔ آپؐ پیدل چل کر اُن کی طرف گئے تو استقبال کیا۔ خواتین باہر چلی آئیں۔ حضورؐ نے بی بی سے پوچھا: "تباء میں کیا ہوا تھا؟" بی بی نے فرمایا: "مجھے یہودیوں کے قریب ہونے کی وجہ سے ڈر تھا کہ کہیں وہ آپؐ کو تکلیف نہ پہنچائیں۔" حضرت ابوایوب انصاریؓ رات بھر ننگی تلوار لیے خیمہ کے گرد پہرہ دے رہے تھے۔ صبح جب حضور اکرمؐ نے یہ حالت دیکھی، آپؓ سے دریافت فرمایا تو عرض کیا: "مجھے بی بی صفیہ کی طرف سے خدشہ تھا۔ ان کے باپ اور شوہر اور رشتہ دار ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے انھوں نے ابھی اسلام قبول کیا، ایسا نہ ہو کہ آپؐ پر وار کر بیٹھے۔"

صبح کو حضور اکرمؐ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا: "جس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بچی ہوں وہ ہمارے پاس لے آئیں۔" ارشاد کی دیر تھی کہ کسی نے کھجوریں، کسی نے گھی، کسی نے ستو پیش کیا۔ اس طرح بہت کچھ جمع ہو گیا۔ ان تمام چیزوں کا حلیس بنایا اور حضورؐ کے ہمراہ کھانے پینے لگے۔ یہ تھا حضور اکرمؐ کا ولیمہ۔ سفر جاری رہا۔ مدینہ کے مکانات اور در و دیوار نظر آتے ہی سب نے اپنی اپنی سواریوں کو دوڑایا۔ آپؐ نے بھی اپنی سواری تیز کی۔ اونٹ کا پاؤں پھسل گیا اور دونوں گر پڑے۔ ابوطلحہؓ اونٹ سے اتر کر حضور اکرمؐ سے پوچھا: "آپؐ کو چوٹ تو نہیں لگی؟" حضورؐ نے فرمایا "صفیہؓ کی خبر لو۔" ابوطلحہؓ نے اپنے منہ پر چادر ڈالی اور بی بی صفیہ کی طرف بڑھ کر اُن پر چادر ڈال دی۔ آپؓ اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ حضورؐ نے آپؓ کو پھر سوار کرا لیا اور چل پڑے۔ مدینہ کی پشت پر پہنچ کر آپؐ نے دُعا فرمائی: "ہم لوٹنے والے ہیں، اپنے اللہ سے توبہ مانگنے والے، اس کی عبادت کرنے والے اور اس کی حمد و ثنا بیان کرنے والے ہیں۔" مجاہدین اسلام آپؐ کی قیادت میں فتح خیبر کے بعد اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ خیبر کی فتح مدینہ والوں کے لیے ذہنی، روحانی اور جسمانی تکالیف سے چھٹکارے کا باعث بنی۔

مدینہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ صفیہ بنتِ حُیی بن اخطب حضور اکرمؐ کی زوجۂ محترم بن کر آئی ہیں تو عورتیں انھیں دیکھنے کے لیے آئیں۔ چند وہ بھی آئیں جنھوں نے سُن رکھا تھا کہ وہ بہت حسین و جمیل ہیں۔ امہات المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت

حفصہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت جویریہ رضوان اللہ علیہن بھی تشریف لائیں۔ یہ سب کی سب چادر اوڑھی ہوئی تھیں حضورؐ نے بی بی عائشہ صدیقہؓ کو پہچان لیا باہر آئیں تو حضورؐ نے پوچھا: "تم نے صفیہ کو کیسے پایا"۔ بی بی نے کہا: "میں نے یہودیہ کو دیکھا"۔ حضورؐ نے فرمایا: ایسا مت کہو وہ صدق دل سے ایمان لائی ہیں۔ آپؓ کی لاڈلی لخت جگر سیدہ فاطمۃ الزہرہؓ بھی آئیں۔ بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئیں اور اپنے کانوں سے قیمتی جھمکے اتار کر سیدہؓ کی نذر کیں۔

دوسری ازواج کی طرح مسجد نبوی سے لگا ہوا ایک علیحدہ مکان فراہم کیا۔ انھیں سالانہ اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جو مقرر فرمادی اور انھیں اس کے خرچ کا مختار بنادیا اور اُن کی باری کا دن بھی مقرر کردیا۔ آپؓ کی پرورش بڑے نازو نعم اور لاڈو پیار سے ہوی۔ سرداروں کا گھرانا تھا۔ اس کے باوجود امور خانہ داری میں یکتا اور ماہر تھیں۔ عمدہ اور مزیدار کھانے پکانے میں مہارت رکھتی تھیں حضور اکرمؐ کا مرغوب اور پسندیدہ کھانا بڑے اہتمام سے تیار کرتیں۔ اکثر آپؓ دوسری ازواج کے گھر میں ہوتے تو کھانے پکا کر تحفتاً بھیجا کرتیں۔ ایک بار آپؐ بی بی عائشہؓ کے گھر تشریف فرما تھے کہ آپؓ نے کھانا بھیجا حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: عمدہ اور مزے دار کھانے تیار کرنے میں صفیہؓ سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

آپؐ کا برتاؤ حضرت صفیہؓ کے ساتھ نہایت مشفقانہ و محبت آمیز تھا۔ ایک بار حضورؐ نے آپؓ کو روتے دیکھا۔ یہ آپؓ کی باری کا دن تھا۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ بی بی عائشہؓ نے کہا کہ وہ مجھ سے افضل اور برتر ہیں۔ کیوں کہ اُن کو آپ کے نسب سے تعلق ہے اور شرافت حاصل ہے اس پر حضورؐ نے فرمایا: "تم انھیں اس طرح کہہ دیتیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام میرے باپ، حضرت موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، میرے شوہر ہیں۔ اس لیے تم مجھ سے افضل کیوں کر ہوسکتی ہو"۔ آپؓ نے رونا بند کردیا اور مسکرادیا۔ اس طرح آپؐ کی دلجوئی فرماتے تھے۔

ایک بار سفر میں کئی ازواج مطہرات کے ساتھ بی بی صفیہؓ بھی حضور اکرمؐ کے ہمراہ تھیں۔ راستہ میں صفیہؓ کا اونٹ بیمار ہوگیا اور آپؓ پیچھے رہ گئیں۔ حضور اکرمؐ نے سیدہ زینب بنتِ جحشؓ سے کہا کہ وہ اپنا ایک زائد اونٹ صفیہؓ کو دیں تاکہ وہ منزل پر پہنچ جائے۔ بی بی زینب بنتِ جحشؓ جو فیاض اور بامروت تھیں اُن کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ اس یہودیہ کو اپنا اونٹ کیوں دوں۔ حضور اکرمؐ کو یہ بات پسند نہ آئی آپؐ دو ماہ تک اُنؓ سے تعلق نہیں رکھا۔ آخر سیدہ عائشہؓ کی کوشش سے حضور اکرمؐ ان سے راضی ہوے۔

۱۱ھ ہجری ماہِ ربیع الاول میں حضور اکرمؐ اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے۔ عاشقانِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دنیا میں غم کے بادل چھاگئے اور ازواجِ مطہراتؓ کی دنیا اندھیری ہوگئی۔ بی بی صفیہؓ کی عمر اس وقت اکیس۲۱ یا بائیس۲۲ سال کی تھی۔ آپؓ نے حضورؐ کی زوجیت میں چار سال گزارے۔

حضور اکرمؐ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد حضرت صفیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے بڑی لمبی زندگی گزاریں اور اس طویل زندگی میں آپؓ نے مختلف مسائل کی تشریح اور وضاحت فرماتی رہیں۔ اکثر آپ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں سوالات پوچھتے اور آپؓ
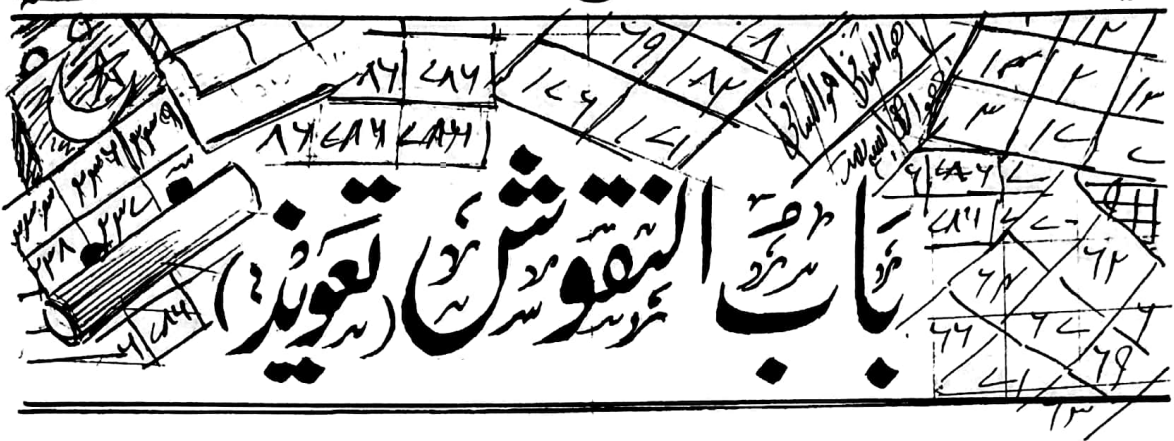
حافظ عبد المنعم قادری مرحوم آرنوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ! اساتذہ عاملین نے جہاں پر ایک ایک آیات قرآنیہ اور اسماء الٰہیہ کے بہت سے فضائل اور بے حساب فائدوں سے ہم سب کو روشناس کرایا ہے وہیں پر ان اساتذہ عاملین نے ان آیاتِ قرآنیہ اور اسماء الٰہیہ کے حروف کو اعداد میں تبدیل کر کے نقوش کے ذریعہ سے فوائد حاصل کرنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا ہے اور آیات قرآنیہ اور اسماء الٰہیہ وغیرہ سے بہت سی بیماریوں اور علتوں کا دور ہونا اور شفا کا حاصل ہونا اظہر من الشمس ہے اور یہ چیز علماءِ کرام، بزرگانِ دین وصوفیاءِ کرام کے عمل سے ثابت ہے اور ساتھ ہی ساتھ اساتذہ عاملین نے قرآنی آیات اور اسماءِ الٰہیہ کے حروف کو اعداد میں تبدیل کر کے نقوش کے ذریعہ سے فوائد حاصل کرنے کو ثابت کیا ہے اور ان نقوش کے ذریعہ سے استفادہ کو اکثر علماءِ کرام اور صوفیاءِ عظام نے قبول کیا ہے۔ چناں چہ علاج و معالجہ اور اپنے مقاصد کے حصول میں نقوش کا استعمال ہونا بہت مشہور ہے۔ لہٰذا ہمیں نقوش کے استعمال کے اثبات میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ پس اس وقت ہمارا موضوع حروف کو اعداد میں تبدیل کرنے اور نقوش کے پُر کرنے کے طریقوں میں سے ہے چوں کہ آیاتِ قرآنیہ اور اسماءِ الٰہیہ کو اعداد میں تبدیل کرنے اور نقوش کے پُر کرنے سے اکثر حضرات ناواقف ہیں۔ اس لیے اس رسالہ (اللطیف) کے ذریعہ سے حروف سے اعداد کے حاصل کرتے اور نقشوں کے پُر کرنے کے طریقوں کو مختصر طور پر تعارف کرایا جارہا ہے۔

جاننا چاہیے کہ حروف کو اعداد میں تبدیل کرنے کے واسطے عربی کے اٹھائیس ۲۸ حروف بنیاد ہیں۔ ہر قسم کے حروف جیسے فارسی اور اردو کے زائد حروف یعنی پ۔ ٹ۔ چ۔ ڈ۔ ڑ۔ ژ۔ گ وغیرہ کو عربی کے اٹھائیس حروف کے قریب المخارج حرف سے مطابقت پیدا کرنا پڑے گا۔ عموماً اکثر عاملین کے نزدیک پ کا بدل ب

اور ٹ کا بدل ت اور چ کا بدل ج، ڈ کا بدل د اور ڑ کا بدل ر اور ژ کا بدل ز۔ گ کا بدل ک مقرر ہیں۔
اور زبانِ عربی میں پ کا بدل ف اور گ کا بدل ج مروج ہے۔ مگر عاملین پ کا بدل ب اور گ کا بدل
ک ہی لیتے ہیں۔ واللہ اعلم

عربی کے اٹھائیس ۲۸ حروف کے قمری اعداد حسبِ ذیل ہیں۔ اس کو ابجد قمری اور جمل کبیر بھی کہتے ہیں، اور کسی بھی جگہ یہ کہا جائے کہ ابجد سے اعداد حاصل کرو تو یہی ابجدِ قمری مراد ہوگا۔

ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰

ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

دوسرا ابجدِ شمسی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابجدِ شمسی سے اعداد حاصل کرو تو یہ حسبِ ذیل ہے اور اس کا دوسرا نام ابجدِ اَبتَثْ ہے۔

ا	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ذ	ر	ز	س	ش	ص	ض
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰

ط	ظ	ع	غ	ف	ق	ک	ل	م	ن	و	ہ	ی
۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ان کے علاوہ اور بھی ابجدیں ہیں مگر مشہور یہی دو ہیں۔ ان دو میں بھی ابجد قمری ہی کا استعمال زیادہ ہے اور ابجدِ شمسی کا استعمال بہت ہی قلیل ہے اور دیگر ابجدوں کا استعمال تو اساتذہ عاملین کرتے ہیں۔ عموماً ہر ایک کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جاننا چاہیے کہ جو حروف لکھنے میں آتے ہیں ان ہی حروف کے اعداد لیے جائیں گے۔ چاہے پڑھنے میں نہ آئیں مثلاً والقمر، اذا الشمس، کان الناس، اقیموا الصلوۃ۔ یعنی والقمر میں الف اور اذا الشمس میں دو الف اور ایک لام اور کان الناس میں الف اور لام اور اقیموا الصلوۃ میں واؤ اور الف اور لام نہیں پڑھے جاتے۔ مگر مذکورہ ہ نوں کے اعداد لیے جائیں گے اور اسی طرح سے موسیٰ، عیسیٰ، اسحٰق

رحمٰن وغیرہ میں موسیٰ اور عیسیٰ میں ی کو حساب میں شمار کیا جائے گا اور بولا جانے والا الف کو شمار نہیں کیا جائے گا اور اسی طرح سے رحمٰن اور اسحٰق میں چاہے اردو رسم الخط کا لحاظ کرتے ہوے رحمان اور اسحاق لکھ بھی دیا جائے مگر الف کو نہیں لیا جائے گا۔ اردو رسم الخط کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح حرف مشدّد ایک ہی حرف شمار کیا جائے گا۔ مثلاً اَبّ ، اَمّ ، مُحَمَّدْ یعنی اَبّ میں ایک ب اور اَمّ میں ایک م اور مُحَمَّدْ کے دوسرے میم میں ایک ہی میم لیا جائے گا۔ چناں چہ اچھی طرح سے چھان بین کرنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ قرآنی آیات اور اسماءِ الٰہیہ کے اعداد میں کمی بیشی سے نقوش (تعویذ) غلط ہوجائیں گے اور صحیح اثرات حاصل نہیں ہونگے۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفصیل جان لیں۔

الرحیم	الرحمٰن	اللہ	بسم
ا ل ر ح ی م	ا ل ر ح م ا ن	ا ل ل ا ہ	ب س م
۴۰+۱۰+۸+۲۰۰+۳۰+۱	۵۰+۰+۴۰+۸+۲۰۰+۳۰+۱	۵+۰+۳۰+۳۰+۱	۴۰+۶۰+۲
۲۸۹	۳۲۹	۶۶	۱۰۲

۷۸۶ = ۲۸۹ + ۳۲۹ + ۶۶ + ۱۰۲

جب آپ نے آیاتِ قرآنیہ اور اسماءِ الٰہیہ وغیرہ سے اعداد حاصل کر لیے تو اس جگہ نقش پُر کرنے کے ۲ دو طریقے مشہور و معروف ہیں اب ان کو ہم بیان کرتے ہیں۔ ایک مثلث نقش جن کے خانے نو (۹) ہوتے ہیں۔ دوسرا مربع نقش جن کے خانے ۱۶ سولہ ہوتے ہیں۔ مذکورہ ہر نقوش کے چار چار قسمیں ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

مثلث آتشی چال

۸	۱	۶
۳	۵	۷
۴	۹	۲

مثلث بادی چال

۲	۷	۶
۹	۵	۱
۴	۳	۸

مثلث آبی چال

۶	۷	۲
۱	۵	۹
۸	۳	۴

مثلث خاکی چال

۴	۹	۲
۳	۵	۷
۸	۱	۶

مربع آتشی چال

۸	۱۱	۱۴	۱
۱۳	۲	۷	۱۲
۳	۱۶	۹	۶
۱۰	۵	۴	۱۵

مربع بادی چال

۴	۹	۷	۱۴
۱۵	۶	۱۲	۱
۱۰	۳	۱۳	۸
۵	۱۶	۲	۱۱

مربع آبی چال

۵	۱۶	۲	۱۱
۱۰	۳	۱۳	۸
۱۵	۶	۱۲	۱
۴	۹	۷	۱۴

مربع خاکی چال

۱۰	۵	۴	۱۵
۳	۱۶	۹	۶
۱۳	۲	۷	۱۲
۸	۱۱	۱۴	۱

عام طور پر یہ کہا جائے کہ نقش پُر کرلو تو مثلث ہو یا مربع صرف آتشی چال سے ہی پُر کیا جائے گا کیوں کہ عموماً آتشی چال سے ہی نقوش پُر کیا کرتے ہیں۔ البتہ کسی کوئی خاص کام کے لیے بادی، آبی یا خاکی کہا جائے تو پھر بادی چال سے یا آبی چال سے یا خاکی چال سے نقوش کو پُر کرنا پڑے گا۔ نقوش کے پُر کرنے میں مثلث ہو یا مربع، پہلا خانہ وہی ہے جہاں پر نمبر ایک۱ کا ہندسہ لکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا خانہ وہی ہے، جہاں پر دو۲ کا ہندسہ لکھا ہوا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آخیر تک اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔

دیگر نقش کے درست اور صحیح ہونے کی پہچان یہ ہے کہ ہر ایک سطر میں جدھر سے بھی اعداد کو جمع کریں عددِ اصلی آنا چاہیے، شلاً مذکورہ مثلث نقوش میں ہر ایک نقش کا عدد اصلی یا "عددِ طبعی" پندرہ۱۵ ہے۔ اب آپ اوپر سے نیچے جمع کریں یا دائیں سے بائیں جمع کریں عدد پندرہ ہی آئے گا۔ ورنہ نقش غلط ہوگا۔ اسی طرح مربع نقوشِ مذکورہ میں ہر ایک نقش کا عدد اصلی یا عدد طبعی چونتیس۳۴ ہے۔ اب آپ اوپر سے نیچے جمع کریں یا دائیں سے بائیں جمع کریں چونتیس۳۴ کا عدد آئے گا۔ جیسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے عدد ۷۸۶ کو نقش پُر کرنا چاہتے ہیں تو مثلث نقش ہو یا مربع نقش جب آپ نے نقش پُر کرلیا تو اب ہر ایک سطر کو اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں جمع کر کے دیکھ لیں ہر سطر عدد اصلی ۷۸۶ ہونا چاہیے۔ اگر ۷۸۶ کا عدد نہ آئے تو سمجھو کہ حساب کے کرنے میں یا نقش کے پُر کرنے میں کہیں نہ کہیں غلطی ہوئی ہے۔

سب سے پہلے مثلث نقوش پُر کرنے کا طریقہ جان لیں وہ یہ کہ جو عدد آپ کو قرآنی آیات یا اسمائے الٰہیہ کے حروف سے حاصل ہوے اس عدد میں سے قانون کے بارہ۱۲ عدد کم کرلیں کم کرنے کے بعد جو عدد حاصل ہوا اس عدد کو تین سے تقسیم کریں تقسیم کرنے کے بعد جو خارج قسمت ہے اس سے نقش پُر کرنا شروع کریں۔ یعنی خارج قسمت کو پہلے خانہ میں اور دوسرے خانہ میں ایک عدد کا اضافہ کے ساتھ پُر کریں اسی طرح ہر ایک خانہ میں ایک ایک عدد کا اضافہ کرتے ہوئے نقش کو مکمل کریں۔ مثلاً مثلث نقش کا طبعی عدد پندرہ۱۵۔ قانون کے بارہ۱۲ بچت تین۳ اس بچت تین۳ کو تین۳ سے تقسیم کریں ۱ (۳ ۳ پس خارجِ قسمت ایک۱ ہوا، اور کسر نہیں۔

۱۵-۱۲ = ۳ ، ۳ ÷ ۳ = ۱ ۔ کسر نہیں۔

مثلاً ہم کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا نقش تیار کرنا ہے۔ جس کے کل اعداد ۷۸۶ ہے۔

عدد اصلی = ۷۸۶ قانون کے خارج = ۱۲ = ۷۸۶ - ۱۲ = ۷۷۴

خارج قسمت ۲۵۸ (۳ سے تقسیم ۷۷۴

کسر نہیں

عددِ اصلی ۷۸۶

۲۶۵	۲۵۸	۲۶۳
۲۶۰	۲۶۲	۲۶۴
۲۶۱	۲۶۶	۲۵۹

۷۸۶

عددِ طبعی ۱۵

۸	۱	۶
۳	۵	۷
۴	۹	۲

۱۵

اب نقش کو غور سے دیکھیں اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں جس سطر میں بھی اعداد کو جمع کریں عدد اصلی یعنی ۷۸۶ آئے گا اور اس طرح جمع کرنے میں عدد اصلی ۷۸۶ نہ آئے تو سمجھو کہ کسی نہ کسی جگہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ پھر سے حساب کر کے دیکھنا ضروری ہے، ورنہ نقش کے فائدے سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ تو ہوا وہ نقش جس کے اعداد سے کسر نہیں آیا۔ اگر اصلی اعداد سے مثلث نقش کے لیے ایک عدد کسر آئے تو اس کے پُر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ساتویں خانہ میں ایک عدد کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ مثلاً چاروں عنصروں کے مثلث نقوش جو اوپر مذکور ہوئے وہ ۱۵ کے اعداد کا تھا۔ اگر عدد اصلی پندرہ ۱۵ کے بجائے سولہ ۱۶ ہوئے تو ظاہر ہے کہ ایک عدد کسر ضرور آئے گا جیسے

۱۶ - ۱۲ = ۴ ۱) ۴ (۳

۳/۱ کسر ایک عدد ہوا

۹	۱	۶
۳	۵	۸
۴	۱۰	۲

یعنی ہر ایک خانہ پر کرنے کے لیے ایک عدد کا اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر ساتویں خانہ میں مزید ایک عدد کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ مذکورہ اس نقش پر غور کریں ساتویں خانہ میں سات کی جگہ آٹھ ۸ کا عدد پھر بدستور آٹھویں خانہ میں نو ۹ اور نویں خانہ میں دس ۱۰ کا عدد لکھا گیا ہے۔ اس کو مزید تھوڑی تفصیل سے جان لیں۔ مثلاً شہید کے کل عدد ۳۱۹ - ۱۲ = ۳۰۷ ÷ ۳ = ۱۰۲ ۱ ایک عدد کسر کا ہے۔

ش ۳۰۰ پس کل عدد = ۳۱۹

ھ ۵ قانون کے خارج = ۱۲

ی ۱۰ بچت ۳۰۷

د ۴ = کل عدد ۳۱۹ تین سے تقسیم ۳ = ۱۰۲ خارج قسمت کسر = ۱

۱۱۰	۱۰۲	۱۰۷	
۱۰۴	۱۰۶	۱۰۹	۳۱۹
۱۰۵	۱۱۱	۱۰۳	
	۳۱۹		

اور اسی طرح وہ عدد جس سے دو عدد کسر کے آئیں تو چاروں خانہ میں ایک عدد کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ مثلاً اگر اصلی عدد ۷۰ استر آوے

عدد اصلی ۱۷ - ۱۲ = ۵ ÷ ۳ = ۱ خارج قسمت ایک ۱ اور کسر کے عدد دو ۲ ہوئے

مثلاً منعم کے کُل عدد ۲۰۰ - ۱۲ = ۱۸۸ ÷ ۳ = ۶۲ ۲ یعنی کسر کے عدد دو ۲ ہوئے

۱۷	۹	۱	۷
۷	۳	۶	۸
۱۷	۵..	۱۰	۲
	۱۷	۱۷	۱۷

۲۰۰	۷۰	۶۲	۶۸
۲۰۰	۶۴	۶۷	۶۹
۲۰۰	۶۶..	۷۱	۶۳
	۲۰۰	۲۰۰	۲۰۰

م ۴۰
ن ۵۰
ع ۷۰
م ۴۰ = کُل ۲۰۰

اوپر سے نیچے، دائیں سے بائیں جمع کرنے پر عدد اصلی آئیں گے۔ پس اس طرح سے مثلث بادی چال، مثلث آبی چال، مثلثِ خاکی چال پُر کر لیں۔ ہر قسم کے چالوں کے نمبروار خانے یاد رکھیں۔ طریقہ وہی ہے جو کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ مگر مثلث کے کسر میں ایک عیب یہ ہے کہ اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں سطریں تو اعداد اصلی ٹھیک رہے گا لیکن ایک گوشہ کنارہ کا تو برابر رہے گا اور ایک گوشہ کنارہ کا اگر کسر عدد ایک ہے تو ایک ۱ عدد نکل جائے گا اور اگر کسر دو ۲ ہوں تو ایک گوشہ کنارہ کا بڑھ جائے گا مثلاً ذیل کے نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں

کسر کا عدد ایک ۱

۱۶			
	۹	۱	۶
	۳	۵	۸
	۴	۱۰	۲
۱۵			

عدد اصلی ۱۶

کسر کا عدد دو ۲

۱۷			
	۹	۱	۷
	۳	۶	۸
	۵..	۱۰	۲
۱۸			

عدد اصلی ۱۷

یہ وہ عیب ہے جس کو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے بعض اساتذہ

عاملین مثلث نقش بلا کسر کے بڑے اہتمام سے قبول کرتے ہیں۔ مگر جب مثلث نقش میں کسر آتا ہے تو اس کو قبول کرنے کے بجائے مربع نقش کی طرف اعداد کو منتقل کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ مربع نقوش میں اگر کسر آئے تو کسی قسم کا عیب پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی تمام گوشے ٹھیک آتے ہیں۔ کمی بیشی ہرگز نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

مربع نقش پُر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس قدر اعداد ہوں ان اعداد میں سے قانون کے عدد تیس ۳۰ کم کریں۔ باقی کو چار ۴ سے تقسیم کریں۔ خارج قسمت کو پہلے خانہ میں رکھ کر نقش پُر کرنا شروع کریں اس کو اعدادِ طبعی سے سمجھ لیں۔

عددِ طبعی ۳۴، قانون کے خارج تیس ۳۰، بچت عدد ۴ اور چار سے تقسیم ۱) ۴ (۴ / ۴

پس ایک عدد سے نقش پُر کرنا شروع کریں۔ عدد طبعی ۳۴ - ۳۰ = ۴ ÷ ۴ = ۱ ۔ کسر نہیں۔

نقش مربع عدد طبعی ۳۴

				۳۴
۳۴	۸	۱۱	۱۴	۱
۳۴	۱۳	۲	۷	۱۲
۳۴	۳	۱۶	۹	۶
۳۴	۱۰	۵	۴	۱۵
۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴

مثلاً تواب الرحیم کے عدد اصلی ۶۹۸ ہوئے

۶۹۸ - ۳۰ = ۶۶۸ ÷ ۴ = ۱۶۷ ، ۰ پس خارج قسمت ۱۶۷ ہوا اور کسر نہیں۔

تواب الرحیم کے عدد اصلی ۶۹۸

۱۷۴	۱۷۷	۱۸۰	۱۶۷
۱۷۹	۱۶۸	۱۷۳	۱۷۸
۱۶۹	۱۸۲	۱۷۵	۱۷۲
۱۷۶	۱۷۱	۱۷۰	۱۸۱

یہ تو ہوا وہ نقش جس میں کسر کا عدد نہیں آیا۔ اگر کسر کا ایک عدد آئے جیسے عدد طبعی ۳۴ کے بجائے پینتیس ۳۵ ہوئے تو ظاہر ہے ایک ۱ عدد کسر کا آئے گا۔ ایسی صورت میں تیرھویں ۱۳ خانہ میں ایک ۱ عدد کا اضافہ کردیا جائے گا۔ مثلاً رب کریم کے عدد کل ۵۰۳ - ۳۰ = ۴۷۳ ÷ ۴ = ۱۱۸ کسر کا عدد ایک ۱ ہوا۔

۸	۱۱	۱۵	۱
۱۴	۲	۷	۱۲
۳	۱۷	۹	۶
۱۰	۵	۴	۱۶

عدد اصلی ۳۵

۱۲۵	۱۲۸	۱۳۲	۱۱۸
۱۳۱	۱۱۹	۱۲۴	۱۲۹
۱۲۰	۱۳۴	۱۲۶	۱۲۳
۱۲۷	۱۲۲	۱۲۱	۱۳۳

عدد اصلی ۵۰۳

کل عدد اصلی ۵۰۳
قانون خارج ۳۰
بچت ۴۷۳
تقسیم ۴ سے ÷ ۴
خارج قسمت ۱۱۸
کسر کا عدد ایک ۱

اوراگر کسر کا عدد دو۲ آئے مثلاً ۳۶ کا عدد تو ظاہر ہے کسر کا عدد دو۲ ہی آئے گا اس کا طریقہ یہ ہے کہ نویں خانہ میں ایک۱ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔

مثلاً غنی کے کُل عدد ۱۰۶۰ - ۳۰ = ۱۰۳۰ ÷ ۴ = ۲۵۷، کسر کا عدد دو۲ ہوے۔

غنی کے عدد اصلی	۱۰۶۰
قانون کے خارج	۳۰
بچت عدد	۱۰۳۰
۴ سے تقسیم	۴
خارج قسمت	۲۵۷
کسر	۲

۲۶۴	۲۶۸	۲۷۱	۲۵۷
۲۷۰	۲۵۸	۲۶۳	۲۶۹
۲۵۹	۲۷۳	۲۶۶	۲۶۲
۲۶۷	۲۶۱	۲۶۰	۲۷۲

عدد اصلی ۱۰۶۰

۸	۱۲	۱۵	۱
۱۴	۲	۷	۱۳
۳	۱۷	۱۰	۶
۱۱	۵	۴	۱۶

عدد اصلی ۳۶

اگر مربع نقش میں کسر کے عدد تین۳ آویں۔ جیسے عدد طبعی ۳۴ کے بجائے ۳۷ کا عدد آوے تو ظاہر ہے کہ کسر کے عدد تین۳ آئیں گے تو خانہ پانچ۵ میں ایک۱ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ مثلاً رب المشرقین کے عدد اصلی ۹۳۳ ہوتے ہیں

عدد اصلی ۹۳۳ - ۳۰ = ۹۰۳ ÷ ۴ = ۲۲۵ پس کسر کے عدد میں تین۳ ہوے۔

۲۳۳	۲۳۶	۲۳۹	۲۲۵
۲۳۸	۲۲۶	۲۳۲	۲۳۷
۲۲۷	۲۴۱	۲۳۴	۲۳۱
۲۳۵	۲۳۰	۲۲۸	۲۴۰

رب المشرقین کے کُل عدد ۹۳۳

۹	۱۲	۱۵	۱
۱۴	۲	۸	۱۳
۳	۱۷	۱۰	۷
۱۱	۶	۴	۱۶

عدد اصلی ۳۷

یہ مذکورہ نقش مربع آتشی چال سے تھا۔ بالکل اسی طرح سے نقش مربع بادی چال، نقش مربع آبی چال، نقش مربع خاکی چال کو پُر کرنا پڑے گا۔ صرف خانے بدل جائیں گے مگر قانون وطریقہ وہی رہے گا کوئی فرق نہ ہوگا اور ایک بات یاد رہے کہ پندرہ۱۵ عدد سے کم کا مثلث نقش نہیں ہوتا اور چونتیس۳۴ عدد سے کم کا مربع نقش نہیں ہوتا۔

مربع نقش پُر کرنے میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس قدر عدد اصلی ہوں ان میں سے قانون کے اکیس۲۱ عدد کم کریں اور کم کرنے کے بعد جو عدد باقی رہے ان کو اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ پھر مربع چال سے چاہے آتشی

نقش ہو یا بادی نقش ہو یا آبی نقش ہو یا خاکی نقش ایک ۱ عدد سے پُر کرنا شروع کریں۔ بارہ خانے تک پُر کرنے کے بعد اس محفوظ عدد کو تیرھویں خانے سے پُر کرنا شروع کر کے سولہ ۱۶ خانے مکمل کر لیں۔ مثلاً سلام

کے اصلی عدد ۱۳۱
قانون کے خارج ۲۱
بچت محفوظ ۱۱۰

۱۳۱

۸	۱۱	۱۱۱	۱
۱۱۰	۲	۷	۱۲
۳	۱۱۳	۹	۶
۱۰	۵	۴	۱۱۲

۱۳۱ ۱۳۱ ۱۳۱

اس طریقے میں کسر کا قصہ نہیں ہوتا بلکہ بلا کسر کے نقش مکمل ہو جاتا ہے۔

یہاں پر مختصر یہ بھی جان لیں کہ عملیات میں زکواۃ کا ادا کرنا ضروری ہے۔ بغیر زکواۃ کے عمل کام نہیں دیتا مگر نقش میں زکواۃ کا ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ نقش زکواۃ کے بغیر بھی کام دیتا ہے۔ البتہ زکواۃ ادا کرنے کے بعد اثر میں ترقی ہو جاتی ہے اور نقش بھی عمل کی طرح کام دینے لگتا ہے۔ عمل اور نقوش کی زکواۃ میں جو فرق ہے وہ یہ کہ عمل یا وظیفہ پڑھا جاتا ہے مگر نقش کی زکواۃ پڑھنے سے ادا نہیں ہو گی بلکہ نقش کی زکواۃ لکھنے سے ادا ہو گی۔

نقش کی زکواۃ ادا کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ منجملہ نقش مثلث کی زکواۃ بھی ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلث نقش کے اعداد طبعی (۱۵) پندرہ ہیں۔ پس نقش کو روزانہ پندرہ ۱۵ مرتبہ پندرہ ۱۵ روز تک لکھیں۔ زکواۃ ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح مربع نقش کے اعدادِ طبعی چونتیس ۳۴ ہوتے ہیں۔ چناں چہ مربع نقش کو روزانہ چونتیس ۳۴ مرتبہ چونتیس ۳۴ روز تک لکھیں۔ مربع نقش کی زکواۃ ادا ہو جائے گی۔

ایک اور دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ جس قدر اعداد اصلی نقش کے ہوں اتنے ہی مقدار پر نقش کو پُر کر دینے سے زکواۃ ادا ہو جائے گی۔ مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کل اعداد قمری ۷۸۶ ہے پس ۷۸۶ مرتبہ نقش پُر کرنے سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نقش کے اعداد کی زکواۃ ادا ہو جائے گی۔ چاہے کئی دن میں مکمل کرے مگر شروع کرنے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو اتنی جلدی زکواۃ کو مکمل کر لیں اور ایک تیسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر نقش کو روزانہ ۳۶۰ تین سو ساٹھ مرتبہ چالیس ۴۰ دن تک لکھیں یہ زکواۃ مذکورہ دونوں زکواۃ سے بھی کامل اثر پیدا کرتی ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ نقش کے زکواۃ ادا کرتے وقت جگہ کا پاک ہونا اور باوضو ہونا اور قبلہ رُخ، پابندی مقام کے ساتھ خوشبو وغیرہ کا اہتمام بھی ضروری ہے اور زعفران سے لکھنا بہتر اور اولیٰ ہے بصورت دیگر ہلدی کو اچھی طرح باریک پیس کر پانی
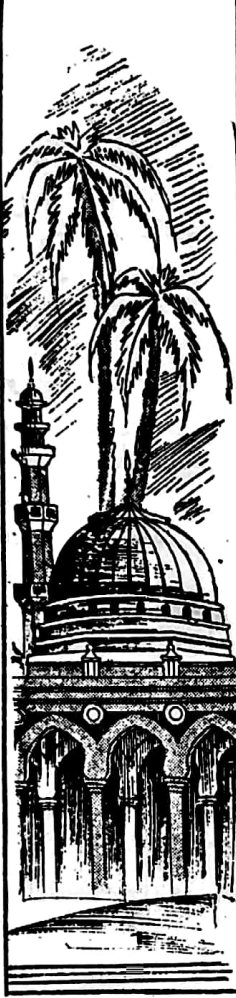
بقیہ صفحہ نمبر ۱۴۸

مولانا ڈاکٹر سید شاہ عثمان قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان قطب ویلور

اللہ رب العزت نے اپنے پیارے حبیب محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ بعد از خدا بزرگ توہی قصہ مختصر۔ لہٰذا آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ مندرجۂ ذیل واقعات سے ہم کو بخوبی معلوم ہوجائے گا۔

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ آپ مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ خلیفۂ بغداد منصور مدینہ منورہ آیا اور مسجد نبوی میں جا کر حضرت امام مالک سے ملاقات کیا اور گفتگو میں مشغول ہوا۔ دورانِ گفتگو خلیفہ کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی تو حضرت امام مالک نے خلیفہ کو ڈانٹ کر کہا:

"اے امیر المومنین! کیا آپ آداب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف نہیں ہیں! اللہ تعالیٰ مومنین سے فرما رہا ہے: یا ایھا الذین اٰمنو لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی: تم اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔ حضرت صلے اللہ علیہ وسلم حیات النبیؐ کی ظاہری میں ہو یا حیات النبیؐ باطنی میں ہو ہم کو آداب ملحوظ رکھنا چاہیے" خلیفہ یہ ڈانٹ پا کر دبی آواز میں گفتگو کرنے لگے اور آپ نے اس مسئلہ کا حل طلب کیا کہ میں جب دعا مانگوں تو اپنے چہرے کا رخ روضۂ اطہر کی طرف رکھوں یا کعبۃ اللہ کی طرف۔ آپ نے فرمایا: کیا کوئی شخص حیات النبی صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اپنے چہرے کو پھیرے اور دعا کی مقبولیت کی امید رکھے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں۔

اے منصور اپنے چہرے کا رخ روضۂ اقدس کی طرف کر کے دعا مانگو اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا شفیع بناؤ کیوں کہ جو دعا آپؐ کے وسیلہ سے مانگی جاتی ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس دعا کو مقبول و مستجاب فرماتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ دربار نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضری دینے کے آداب کے کیا ہی عمدہ مثال پیش فرمائی ۔ ایک روز صبح میں بعد نماز فجر صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس سے لپٹے ہوئے تھے ۔ ایک شخص قریب آیا اور ان کی گردن پکڑ کر اٹھایا اور کہنے لگا: تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کرتے ہو؟ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھ کر ڈانٹ کر کہنے لگے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں مٹی اور پتھر سے چمٹا ہوا ہوں، میں حضورؐ کے دربار میں حاضر ہوں ۔ اے مروان! جب اہل لوگ حاکم بنتے ہیں تو کچھ کہنا نہیں ہے اور جب نا اہل حاکم بنتے ہیں تو رونا پڑتا ہے ۔ اسی لیے دربار نبوت میں فریاد کر رہا ہوں ۔ مروان ان گرم جملوں کو سن کر وہاں سے خاموش چلا گیا ۔

یہ وہ مقام ہے کہ جب عشق رسولؐ میں فنا فی الرسولؐ ہو جاتے ہیں تو یہ بلند مرتبے پاتے ہیں اور جب چاہے دربار رسولؐ میں حاضری دیتے ہیں ۔

اللہ رب العزت ہم تمام مسلمانوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سچی عقیدت و محبت اور الفت کا جذبہ عطا فرمائے اور ہر لمحہ، ہر قدم آداب النبی صلے اللہ علیہ وسلم کو ملحوظ رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور سید المرسلین شفیع المذنبین حیات النبی رحمۃ للعالمین کا فیضان کرم ہم تمام مسلمانوں پر یکساں رہے ۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین

ندائے قرآن

"۔۔۔اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ، وہ آگ کیسی ہے؟ اس آگ کا ایندھن لکڑیاں اور کوئلے نہیں ہیں، بلکہ اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، اور اس آگ کے اوپر اللہ پاک کی طرف سے ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے قلیظ اور تند خو ہیں، سخت مزاج ہیں......" (سورہ تحریم)
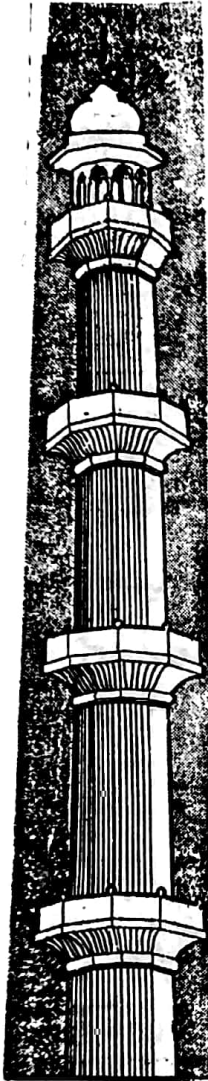
عملِ کثیر اجرِ عظیم

ٹی۔ شیخ محبوب صاحب (اننت پور) آندھرا پردیش

اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (سورۃ عصر)

ترجمہ: عصر کی قسم ہے کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور نیک عمل کرتے رہے۔ اور آپس میں حق کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ ایمان لانے والے، نیک عمل کرنے والے، حق کی تلقین کرنے والے اور صبر کی تاکید کرنے والوں کے علاوہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد عمل کا بڑا حصہ ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہاں ہم احادیث کی روشنی میں چند ایسے اعمال کا ذکر کر رہے ہیں جس پر عمل کرنا آسان ہے لیکن ثواب بہت زیادہ ہے۔

کبیرہ گناہ معاف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو چالیس قدم جنازہ کے ساتھ چلے اس کے چالیس گناہِ کبیرہ مٹا دیے جائیں گے۔ (بہارِ شریعت: جنازہ لیے چلنا کا بیان)

حج و عمرہ کا ثواب: (الف ایک حج کا ثواب) سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ تاجدارِ مدینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے جب بھی رحمت

کی نظر سے ان کو دیکھیں تو اللہ عزوجل ہر بار دیکھنے کے عوض ایک مقبول حج کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر روزانہ سو بار اسی طرح دیکھیں: حضور علیہ الصلوٰۃ و سلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے اور بہت پاک ہے۔ (بیہقی)

(ب) **حج و عمرہ کا ثواب:** حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ حضور سید عالم نور مجسم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ عالی شان ہے کہ: "جو فجر کی نماز باجماعت پڑھ کر ذکر اللہ کرتا رہے یہاں تک کہ آفتاب بلند ہو گیا۔ پھر دو رکعت (اشراق) پڑھے تو اُسے پورے حج و عمرہ کا ثواب ملے گا۔" (ترمذی)

(ج) **دو حج اور دو عمرہ کا ثواب:**

سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ باعثِ تخلیقِ کائنات حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے رمضان میں دس دنوں کا اعتکاف کیا تو ایسا ہے جیسا دو حج اور دو عمرہ کیا۔" (بیہقی)

ہر قدم کے بدلے سات کروڑ نیکیاں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "جو مکّہ سے پیدل حج کو جاے یہاں تک کہ مکّہ واپس آئے اس کے لیے ہر قدم پہ سات سو نیکیاں حرم شریف کی نیکیوں کے مثل لکھی جائیں گی۔ کہا گیا' حرم کی نیکیوں کی کیا مقدار ہے، فرمایا: ہر نیکی لاکھ لاکھ نیکی ہے تو اس حساب سے ہر قدم پہ سات کروڑ نیکیاں ہوئیں۔ (بیہقی)

بیس لاکھ نیکیاں

حضرت عبداللہ ابن اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو شخص لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ اَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ پڑھے تو اس کے لیے بیس لاکھ نیکیاں لکھی جائیں گی۔" (طبرانی)

ستّر ہزار فرشتے استغفار

حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو مسلمان کسی مسلمان کی عیادت کے لیے صبح کو جاے تو شام تک اس کے لیے ستّر ہزار فرشتے استغفار کرتے ہیں اور اس کے لیے جنّت میں ایک باغ ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد)

ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا بیان ہے کہ حضور اکرم رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"اے ابوذر، اگر تو صبح جاکر قرآنِ مقدس کی ایک آیت سیکھ لے تو سو رکعت نوافل سے بہتر ہے اور اگر ایک باب علم (دین) کا سیکھ لے چاہے اس وقت اس پر عمل کیا جاتا ہو یا نہ ہو، ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے" (ابن ماجہ)

بارہ برس کی عبادت کا ثواب

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ "جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھے اور ان کے درمیان کوئی بری بات نہ کہے تو وہ چھ رکعتیں (اوابین) بارہ برس کی عبادت کے برابر شمار کی جائیں گی" (ترمذی)

دو سو برس کے عمل کا ثواب

امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ "جو جمعہ کے دن نہائے تو اس کی خطائیں مٹادی جاتی ہیں اور جب چلنا (نماز جمعہ کے لیے) شروع کیا تو ہر قدم پر بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں" اور دوسری روایت میں ہے کہ "ہر قدم پر بیس سال کا عمل لکھا جاتا ہے اور جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اسے دو سو سال کے عمل کا ثواب ملتا ہے" (طبرانی)

دو لاکھ نیکیاں

سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"اے عورتو! جب تم حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان و اقامت کہتے سنو، تم بھی اسی طرح کہو۔ اللہ عزوجل شانہٗ تمہارے لیے ہر کلمہ کے بدلے ایک لاکھ نیکیاں لکھے گا اور ہزار درجے بلند فرمائے گا اور ہزار گناہ مٹادے گا" عورتوں نے عرض کیا یہ تو عورتوں کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے کیا ہے" حضور سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مردوں کے لیے دوگنا ہے" (طبرانی)

ایک ہزار نیکیاں

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان علیہم عنہم سے پوچھا:

"کیا تم میں سے کسی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر روز ایک ہزار نیکیاں کما لیا کرے؟" عرض کیا گیا: "یا رسول اللہ! یہ کس طرح ممکن ہے؟" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وہ اس طرح کہ سو مرتبہ سبحان اللہ کہہ لیا کرے۔ اس عمل کے نتیجہ میں ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی اور ایک ہزار گناہ معاف کئے جائیں گے" (مسلم شریف)

یہ چند احادیث ہیں ان پر عمل کر کے ہم اپنی دنیا و آخرت سنوار سکتے ہیں۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ۔۔

مولوی سید شاہ محمد کمال اللہ ظہوری لطیفی چشتی القادری جنیدی: گورنمنٹ قاضی۔ چتور

اللہ تعالےٰ کے بھٹکے ہوے بندوں کو راہ راست پر لے آنے کے لیے یا بالفاظِ دیگر اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کے لیے اس عالم گیتی میں بہت سے نفوسِ قدسیہ کا ورد مسعود ہوا جو آسمانِ ولایت میں ستاروں کی طرح روشنی دیتے رہے۔

انھیں میں ایک روشن و تابناک ستارہ حضرت قطب الاقطاب غوث الاسلام رکن الحق و دین بندگی مخدوم شیخ سراج الدین جنیدی قدس سرہٗ العزیز کی ذاتِ والاصفات ہے۔ جس کی رہبری و رہنمائی سے ہزاروں گم گشتگان کو راہِ ہدایت و صراطِ مستقیم کی صورت میں اپنی منزلِ مقصود حاصل ہوی۔

حضرت ممدوح حضور سید الطائفہ حضرت خواجہ جنید بغدادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی اولاد ہیں۔ آپ کا نسب حضرت مسلم بن عبد المناف جدِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہے۔

آپ کے والد بزرگوار بغداد شریف سے فشور (پشاور) پہنچے۔ وہاں پر آپ کا نکاح عبد اللہ بادشاہ فشور کی دختر سے ہوا۔ ابو المظفر حضرت شیخ سراج الدین آپ کے والد گرامی کا اسم شریف ہے۔ آپ کا حقیقی نام حضرت مخدوم شیخ محمد رکن الدین ہے۔ لیکن والد ماجد کے نام سے شہرت پائی۔ گویا حضرت شیخ محمد رکن الدین عرف شیخ محمد سراج الدین جنیدی قدس سرہٗ ہے۔ آپ اس عالم رنگ و بو میں ۶۷۰ھ کو تشریف لائے۔ کم سنی میں والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

آپ سلطان غیاث الدین تغلق کے دور میں دہلی تشریف لائے۔ بادشاہ وقت بہت ادب و احترام سے آپ کے قیام و طعام کا انتظام و انصرام کئے۔ کچھ مدت گزار کر دولت آباد اپنے مرشد کی خدمت بابرکت میں رہے۔

ایک شب سید المرسلین امام الانبیاء حبیب کردگار صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خواب میں آکے ارشاد فرمائے کہ اے شیخ سراج الدین دکن جاؤ اور اسلام کی اشاعت کرو۔ اس بشارتِ عظمیٰ سے آپ بہت شادماں ہوئے

اپنے مرشد سے اس کا تذکرہ کیا۔ پیرو مرشد نے اجازت دے دی کہ دکن جاؤ۔ دریائے کرشنا کے قریب کوڑچی مقام ہے۔ اس کو اپنا مسکن بنالو۔ آپ جانب دکن روانہ ہوئے۔ دوران سفر جب بیجاپور پہنچے وہیں آپ کی والدہ محترمہ بیمار ہوئیں۔ ۱۲ شعبان المعظم ۷۳۰ھ داغ مفارقت دے گئیں۔ وہیں تدفین عمل میں آئی۔

حضرت شیخ وہاں سے کوڑچی جو دریائے کرشنا کے قریب واقع ہے، وہاں سے ڈیڑھ میل دور پر املی کے درخت کا گھنا جنگل ہے اس جگہ مسکن بنائے۔ وہیں بت خانہ میں ایک جوگی بہت ہی محنتِ شاقہ سے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کمل سائباں کی طرح معلق اس کے سر پر سایہ کئے رہتا۔ اس کے تین سو زیادہ شاگرد رہے۔ بہت سے لوگ اس کے اس کرتب کو دیکھ کر گرویدہ ہو گئے۔ ایک دن اسی حالت میں باہر آکر بیٹھا۔ حضرت کو اس سے آگہی ہوی تو جوشِ غیرتِ اسلامی سے اپنی جوتی پر جلالی نظر جوڈالی تو وہ اُڑکر کمل کو مار مار کے تار تار کردیا۔ جوگی اس ناگہانی کیفیت سے بہت حیران اور ششدر ہو کے رہ گیا۔ بالآخر حضرت کی خدمت میں پہنچ کر اپنی جسارت پر توبہ کی اور آپ کے دستِ حق پرست پر معافی مانگ کر اسلام قبول کرلیا۔ نام بابا محمد پایا۔ یہ تمام دیکھ کر اس کے سارے شاگرد و عقیدت مند سبھی دولت ایمان سے مالامال ہو گئے۔ آپ کے کشف و کرامات بہت ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کا شہرہ ہونے لگا۔ اطراف و اکناف اسلام کی روشنی پھیلنے لگی۔

آپ عابد و زاہد شب بیدار تھے۔ رات کے آخری حصہ میں تازہ غسل فرماتے تھے تہجد سے فراغت پاکر ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف میں مشغول ہوتے۔ نماز فجر کے بعد اپنے حجرہ میں خصوصی عبادات میں منہمک ہوتے اور دن کے نو بجے باہر تشریف لے آتے۔ خدام کو حکم تھا کہ بائیں جانب گیارہ مٹکے پانی سے لبریز رکھیں۔ جیسے ہی جلالی نظر اُن پر مرکوز ہوتی تو ایک دوسرے سے ٹکرا کر چُور چُور ہو جاتے۔ دائیں جانب ہمہ قسم کے مریض منتظر رہتے تھے حضرت کی جمالی نظر جیسے ہی اُن پر پڑی انھیں شفائے کلیہ ہو جاتی۔ اس طرح ہزاروں مریض اپنے مرض سے صحت کا ملہ پاتے۔ گویا ایک فیض کا دریا ہے جو رواں دواں ہے۔

علاء الدین نامی غریب مزدور حضرت شیخ کا مرید صادق ہمیشہ آپ کی خدمت پر مامور تھا۔ حضرت نے پیش گوئی فرمائی کہ یہ دکن کا بادشاہ ہوگا۔ حضرت کی اجازت سے قلعہ مرچ فتح ہوا دیگر قلعے فتح ہوے۔ رائے بھیرن حاکم گلبرگہ محمد بن تغلق کا باج گزار تھا وہ لڑائی میں مرگیا۔ اس طرح ۷۴۸ھ میں علا والدین حسن گلبرگہ کو دارالسلطنت بنا کر تخت نشین ہوا۔ اپنے نام سے موسوم حسن آباد رکھا۔

حضرت شیخ کوڑچی سے گلبرگہ تشریف لے آئے۔ اپنے قیام کے لیے ارشاد فرمایا کہ یہاں مجھے بغداد شریف کی بو آتی ہے۔ اسی جگہ سکونت فرمائی۔ بادشاہ روزانہ قدمبوسی کا شرف حاصل کرتا تھا۔

حضرت شیخ کا جب اس دار فانی سے کوچ کرنے کا وقت آیا تو اپنے پوتے حضرت خواجہ ابوالفضل جنیدی کو خلافتِ فاخرہ سے نوازے۔ اور خادموں کے ذریعہ چاول، دال وغیرہ منگواکر کھچڑی تیار کروائے اور اس کے ساتھ گیارہ فلوس و تسبیح رکھ کر وصیت فرمائی کہ میرے دُنیا سے جانے کے بائیس سال بعد میرے دوست سید محمد حسین نامی دہلی سے آئیں گے۔ یہ امانت اُن کے حوالے کر دینا۔

حضرت شیخ المشائخ شیخ علاء الدین عرف لاڈلے مشائخ انصاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ کی ملاقات کی غرض سے آئے لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ ایسے ہی دوسرے مرتبہ بھی ہوا۔ تیسری مرتبہ کچھ شیرینی تحفہ بھیج کر شرف ملاقات کی خواہش کی۔ جواب آیا کہ دُنیا دو روزہ ہے، یہاں سے وہاں کی ملاقات بہتر ہے۔ بدھ کے دن میرا انتقال ہوگا۔ لہٰذا تدفین و تکفین کے انتظامات کے ساتھ آئیں اور قیام کا ارادہ ہے تو جانب مغرب اللہ مقام ہے، اس کو اپنا مسکن بنالو۔ حضرت کا روضہ زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ آخر بدھ کے دن حسبِ حکم سارے اسباب اونٹ پر لاد کر پہنچے۔ ۷۸۱ھ بعمر ایک سو گیارہ سال حضرت شیخ کا وصال ہوا۔

بائیس سال کے بعد حضرت قطب الاقطاب سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز علیہ الرحمۃ والرضوان گلبرگہ تشریف لائے۔ جیسے ہی شاہ بازار پہنچے تو سواری سے اتر کر پیدل چلنے لگے۔ جب آستانہ کی چوکھٹ پر پہنچے وہاں سے مزار پُر انوار تک اپنے انگوٹھوں کے بل حاضر ہوے۔ دو گھنٹہ تک دستہ بستہ روبرو مزار شریف کھڑے رہے۔ بعد سلام و فاتحہ خوانی کے باہر آکر صاحب سجادہ حضرت شیخ ابوالفضل جنیدی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات و گفتگو ہوی۔ آنکھ کی بصارت ختم ہوگئی تھی۔ حضرت کی دعا سے بینا ہوگئے۔ اپنا عصا مرحمت فرما کر چشتیہ خلافت و اجازت مرحمت فرمائی۔

اپنی امانت جو ۲۲ سال سے طاقچہ میں مقفل رہی وہ طلب کرنے پر آپ کو ہمراہ لے کر پہنچے۔ بسم اللہ کہہ کر اپنا دست مبارک جونہی رکھا بغیر کنجی کے خود بخود کھل گیا۔ کھچڑی بالکل تر و تازہ تھی۔ آپ بنفسِ نفیس اس کو نوش فرمائے۔ خالی برتن آپ کے خلفاء دھوکر پیئے۔ عرض کئے کہ کھچڑی کے ہم اور صاحبزادگان شاہ محمد اکبر حسینی و شاہ محمد اصغر حسینی بھی متمنی تھے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ اس کھانے کو ہضم کا حق تھا۔ تم اس کے روادار نہیں۔

حضرت سے سوال کرنے پر جواباً ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ دکن کی زیارت کے لیے ہزاروں اولیاء اقطاب و

غوث پیدل رواں دواں ہیں۔ میں نے اُن کی متابعت کی ہے۔

حضرت قطبِ دکن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ رکن الدین علیہ الرحمۃ والرضوان کی شانِ اقدس میں فرمایا

"مردِ غوث خوابیدہ است تا قیامت چراغ ایں مردِ درویش خواہد ماند۔"

حضرت قطبِ دکن رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ کا گنبد بہت عالی شان بلند و برتر ہے۔ آپ کا آستانہ مرجع خلائق ہے۔

جانب مغرب حضرت شیخ الشیوخ شیخ رکن سراج الدین جنیدی قدس سرہٗ کا روضۂ انور بنام "شیخ روضہ" آستانۂ مبارک ہے۔ عوام و خواص کے لیے روحانی سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

محترم ڈاکٹر راہی قریشی صاحب۔ گلبرگہ نے حضرت کی شان میں بہت سے قطعات کہے ہیں۔ ان میں ایک قطعہ پیشِ خدمت ہے: ؎

اک نور کا جلوہ ہے ادب سے آؤ
رحمت کا اثاثہ ہے ادب سے آؤ
اس روضہ پہ ہے فضلِ خدائے قدوس
یہ شیخ' کا روضہ ہے ادب سے آؤ

اسی خانوادہ کے چشم و چراغ بزرگ ہستی عاملِ شریعت و رہبرِ طریقت، صوفیٔ باصفا، حضرت الحاج شاہ محمد تاج الدین جنیدی صاحب قبلہ مدظلہ العالی سجادہ نشین بارگاہِ شیخ دکن علیہ الرحمہ گلبرگہ شریف کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہزار ہا مریدین و معتقدین آپ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہ فقیر بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہے۔ آپ سے شرفِ بیعت و خلافت حاصل ہے۔ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا یہ شعر صادق آتا ہے: ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ انکو — ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

آپ شہر کولار ماہ دو ماہ تشریف لاتے ہیں وہاں پر عظیم الشان خانقاہ و مدرسہ ہے۔ خدائے عزوجل بطفیل حبیبِ پاک صلے اللہ علیہ وسلم اولیائے کرام کے فیوض و برکات سے ہمارے دلوں کو منوّر و ارواح کو معطر رکھے۔

آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم و اہلبیتہ وصحبہ اجمعین۔ ▲▲▲

حکیم محمود بخاری ۔ محل ۔ (ضلع چتور ۔ آندھرا پردیش)

دکن میں صوفیۂ صافیہ کے مختلف خاندان آباد ہیں۔ جن کے آباء و اجداد نے تبلیغ اسلام اور اصلاح و ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ ان میں قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، طبقاتیہ اور نقشبندیہ سبھی سلسلوں کے بزرگ شامل ہیں۔ دکن کے ایک قدیم الآباد بزرگ (از اولاد حضرت سید حسین جلال الدین مخدوم جہانیانِ جہاں گشتؒ) حضرت سید جمال الدین بخاریؒ، اوچھ ملتان سے گلبرگہ تشریف لاکر حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ کے خاندان میں شادی کی۔ آپ کے پوتے حضرت سید محمد حسینی المتخلص بہ میر الملقب بہ شہ میر نے جو ایک جید عالم محقق صوفی اور صاحب وجد و حال بزرگ تھے، عالمگیر شہرت پائی۔ آپ کے دو بھائی تھے۔ حضرت سید نور اللہ بخاری، حضرت سید کمال اللہ بخاری۔ ان میں سے سید نور اللہ بخاری کا مختصر تذکرہ ہدیۂ ناظرین ہے:

تعارف اسم گرامی سید نور اللہ، نورؔ تخلص فرماتے تھے اور نور اللہ بادشاہ مشہور ہیں

آپ حضرت سید جمال الدین بخاری اول کے دوسرے صاحب زادے، حضرت سید محمد حسینی المتخلص بہ میر کے منجھلے بھائی تھے۔۔ والد بزرگوار اور بڑے بھائی سے تعلیم و تربیت پائی اور بھائی بزرگوار کے مرید اور خلیفہ ہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ کہا ہے: ؎

شہ میر کہ مرشد است و پیرم　　　او ساختہ مرشدم ہمیشہ

ایک روایت کے مطابق سنہ ولادت ۱۱۳۱ھ ہے۔ نہایت خلیق، دلیر اور سخی تھے۔ ریاضت اور سخاوت میں مردیگانہ تھے۔ جو روپیہ نذر و نیاز کا آتا محتاج اور مساکین میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ روزہ یا فاقہ آپ کو بہت پسند تھا۔ فرماتے تھے کہ: فُقیر وہ ہے جو پورا ہفتہ سوائے دو ایک روز کے روزہ یا فاقہ سے گزارے۔" خود آپ کا یہی معمول تھا۔ ایک تذکرہ نگار جنھوں نے آپ کے خاندان کا فارسی میں "اثر اعتقاد" کے نام سے ایک کتابچہ لکھا ہے، آپ کے تعلق سے بیان کیا ہے:

"قائم اللیل وصائم النہار دائماً فی الصلوٰۃ والتحیات چنیں مشائخ بے ریا وصاحب جودوسخا چشم جہاں کمتر دیدہ باشد" (ملاحظہ ہو "اثر اعتقاد" مخطوط: آصفیہ حیدرآباد دکن: وکتب خانۂ قادریہ، کڈپہ)

زیادہ تر ذکر ومراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ عملیات سے لگاؤ تھا۔ تصنیف وتالیف اور شعر گوئی سے دلچسپی تھی۔

معاصرین، اور عقد واولاد مولانا باقر آگاہ ویلوری، شاہ فی الحال کرنولی، وجدی کرنولی، سراج اورنگ آبادی وغیرہ آپ کے معاصرین میں تھے۔ کرنول کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ حسین بخاری کی ایک صاحب زادی زینب بی بی آپ کی پہلی بیوی تھیں۔ جن کے بطن سے ایک صاحب زادے سید محی الدین بادشاہ اور ایک صاحب زادی مریم بی بی تھیں۔ دوسرا عقد اولی (کڈپہ) میں حضرت شاہ میاں صاحب حسینی کی صاحب زادی وزیر بی بی سے ہوا تھا۔ جن کے بطن سے سید حسینی بادشاہ بخاری، سید موسیٰ صالح بخاری، سید سلطان محمد بخاری اور سید قادر بادشاہ بخاری چار صاحب زادے تھے۔

ناگپور کا سفر روایت ہے کہ آپ اپنے بڑے صاحب زادے سید محی الدین بادشاہ (جن کا عقد ناگپور میں ہوا تھا اور کم عمری میں انتقال ہوگیا) کے فرزند سید ذاکر اللہ کو دیکھنے کے لیے کبھی کبھی ناگپور جایا کرتے تھے۔ ایک سفر میں اپنے ایک مرید کو ساتھ لے لیا۔ سفر کے دوران جہاں کہیں قیام ہوتا مغرب کے بعد مرید کو ذکر وفکر میں لگا دیتے اور خود باہر چلے جاتے اور عشاء کے بعد تشریف لاتے۔ مرید کے دل میں وسوسہ آیا کہ حضرت مجھے ذکر میں لگا کر کہاں جاتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ایک شام جب حضرت روانہ ہوئے، تھوڑی دیر بعد مرید بھی پیچھے چل پڑا۔ حضرت نے نورِ باطن سے معلوم کرکے مرید کو بھی اس روحانی سفر میں شامل کرلیا۔ کچھ دیر بعد مرید نے دیکھا کہ حضرت اپنے وطن رائے چوٹی میں اپنے والد بزرگوار کی مزار مبارک کے قریب مراقبہ فرما رہے ہیں۔ مرید بیچارہ حیران کہ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے، ہم کو رائے چوٹی چھوڑے ہوئے ہفتہ ہوگیا، یہ سینکڑوں میل لمبا راستہ چند لمحوں میں کیسے طے ہوگیا! الغرض جب مراقبہ سے فارغ ہوئے مرید نے قدم چومے۔ اپنی خطا کی معافی چاہی۔ حضرت نے تنبیہہ فرمائی کہ آیندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ (بحوالہ "اثر اعتقاد")

وصال بارہ سو چودہ[۱۲۱۴] ہجری میں وصال فرمایا۔ مزار مبارک نہرِ داؤدخانی کے کنارے کڑپہ میں واقع ہے۔ آپ کے پوتے سید سلطان محی الدین سالکؔ والد سید حسینی بادشاہؒ نے تاریخ وفات کہی ہے۔

پائے دل بشکستہ اے سالکؔ دلم از روئے آہ — گفت نور اللہ در نورِ محمد گم شدہ

شاہ نور اللہ قطبِؒ ویلور کی نظر میں حضرت سید محی الدین عبداللطیف قادری نقوی (ثانی) المعروف بہ قطبِ ویلورؒ نے ۱۲۸۸ھ میں دوسری بار حج کو تشریف لے جاتے ہوئے کڑپہ میں قیام فرمایا اور حضرت نور اللہ کی مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف

لے گئے اور بہت دیر تک مراقب رہے ۔ فراغت کے بعد مریدین اور خلفاء سے فرمایا کہ یہ شیخ وقت تھے ۔ قربِ نوافل سے گزر کر قرب بر فرائض بلکہ مقامِ قرب تک آپ کی رسائی تھی ۔ (اثرِ اعتقاد)

پیشگوئی روایت ہے کہ اسی سفر میں میں جب حضرت قطبِ ویلور گزر رہے تھے اور بہت سے مریدین و معتقدین ساتھ تھے ایک مجذوب بزرگ اپنے حال میں جھومتے چلے آرہے تھے ۔ جب قریب آئے تو حضرت قطب ویلور نے سلام فرمایا ۔ مجذوب بزرگ نے (بجائے جوابِ سلام کے) کہا : جاؤ جاؤ اب واپس نہیں آتے جاؤ " یہ سن کر حضرت قطب ویلور نے تبسم کناں فرمایا کہ میری بھی یہی تمنا ہے ۔ چناں چہ حج کے بعد ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ میں حضرت قطب ویلور کا وصال ہوا ۔ ۱۲ کو جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی ۔ حضرت مکان ویلور کی ایک قلمی بیاض میں یہ دونوں واقعات اور بمبئی تک کے مختلف مقامات پر آپ کے قیام ، احباب سے ملاقات ، مویدین اور معتقدین سے ارشاد و خطاب اور بیعت و عطائے خرقہ وغیرہ کا احوال مرقوم ہے ۔ اور سفرِ مقامات مقدسہ ، بیماری اور وصال کی بھی پوری تفصیل درج ہے ۔ جس کا ذکر کتاب " انوار اقطاب ویلور " میں آچکا ہے ۔

تصانیف آپ کی پندرہ ۱۵ کتابیں بیان کی جاتی ہیں ۔ ہمیں صرف پانچ کتابیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوی ۔ ارشاد نوریہ رسالۂ نوریہ اردو نثر میں ، عقائد نوریہ ، اردو نظم اور تجلی الانوار یا تجلیات نورانی و مجموع التکسیر فارسی نثر میں ہیں ۔ ہر کتاب کا مختصر تعارف درج ذیل ہے :

ارشادِ نوریہ : توحید و تصوف پر مختصر مقالہ ۔

تجلئ الانوار یا تجلیاتِ نورانی : اسرار الٰہیات و رموزِ تصوّف و احسان پر فارسی کی ایک ضخیم کتاب جس میں حوالوں کے لیے قدیم دکنی اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں ، شجرۂ نسب و شجرۂ طریقت بھی شامل ہے ۔

رسالۂ نوریہ : اردو نثر کے چھ مختصر مقالات ، موضوع ' معارفِ توحید و تصوّف ، یہ قدیم اردو کے نثر پارے ہیں مگر زبان صاف اور منجھی ہوی ہے ۔ جس کی وجہ قدیم اردو نثر نگاروں میں آپ ایک ممتاز نثر نگار شمار کئے جائیں گے ۔

عقائدِ نوریہ : اردو نظم میں مسلکِ اہلِ صفا اور عقائدِ صوفیاء کی تشریح تقریباً سو صفحات ۔

مجموع التکسیر : المعروف بہ عملیات نورانی مجرب خاندانی عملیات کا ذخیرہ پونے دوسو صفحات پر پھیلا ہے ۔

دیوانِ شاہ نور اللہ : مخزونہ انجمن ترقی اردو علیگڈھ ۔ علیگڈھ میں ایک ہفتہ قیام اور کوشش کے باوجود دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہوسکی اور دانش گاہ کے قضیہ نے واپسی پر مجبور کردیا ۔

نمونۂ کلام آپ کے کلام سے کچھ متفرق اشعار اور غزلیں یہ ہیں۔ ے

خامۂ عنبر فشاں سوں ثنا سبحان کا
جس کوں لائق ہے اولھا ناخلق پر احسان کا

متصف ہے ذات اوس کی یا صفتہائے کمال
دور اس کی ذات سوں نام و نشاں نقصان کا

حی و قادر اور مرید و عالم و بینا ہے او
قوتِ سمعی کو اوس حاجت نہ ہر گز جان کا

بے زباں بے حرف بے آواز نت ہے وہ کلیم
از کلامِ نفسی خود جوں کہ خطرہ جان کا

اس صفاتِ سبعۂ ذاتی کو کہتے امہات
کشفِ قلبی ہے جسے حاجت نہ اس برہان کا

ذاتِ واحد کی صفت واحد محمدؐ جس ہے نام
عین ہے طرفین کا قاب ہے قوسین کا

ذاتِ واحد متصف ہو کر تمام اوصاف سیں
نام مومن پائیاں ممکن ہوا ایمان کا

یہ سخن کشفی شہودی ہے بری تقلید سوں
دست رس اس میں نہیں ہر جان اور انجان کا

حضرت سیّد محمدؐ مرشدِ روشن ضمیر
تاجِ سر سلطان کا اور قلب حق دوران کا

عِلّت غائی خلقت شاہ میر دو جہاں
دادگر ہر ہر سخن کی کنہ کے دیوان کا

اقتباسِ نور کیتا نور اس خورشید سوں
ہور اجازت تس کرم سوں دوسرے دیوان کا

- ظاہر مظہر مظہر نورُ — احمد اللہ علم ظہور
- سالک شاہد واحد دیک — یک ہو دوسرا تسرا ایک
- اک سوں دوا اور دو سوں تین — تیسرا آپس آپ میتین

ذاتِ رب کو جسم و جسمانی نہیں
نفس بی نیں اور نفسانی نہیں

معرفت رب کی ہر اک پر فرض ہے
ہور عبادت اس کی جس ثانی نہیں

ذاتِ مطلق ہے ہمہ باطن ہے لیک
با ہمہ ظاہر ہے پنہانی نہیں

منشا رہر دو ہے وحدت جمع توں
او حقیقت احمد فانی نہیں

ہے کمالِ انسانِ کامل برظہور
مظہر کامل ہے نقصانی نہیں

کیوں کہ سمجھے یو حقائق کے نکات
جس میں خود بینی خدا دانی نہیں

گوشِ دل سے گوش کر اقوالِ نورؔ!
گیان کے جوہر ہیں یو کانی نہیں

(تجلّیاتِ نورانی)

من ہستم و نیستم ہمیشہ — بابود و نبود ضم ہمیشہ
سرچشمہ و منبعِ حیاتم — وز وجہِ دگر عدم ہمیشہ
عالم ز علوم کائناتم — وز جہلِ منم علم ہمیشہ
مختارم و صاحبِ ارادت — مجبورم و مضطرم ہمیشہ
بر ہر چہ کہ ہست قادرم من — بے طاقتم و قدرتم ہمیشہ
شنوائی و گوش و گوش دارد — ہم بے سمع و کرم ہمیشہ
بینا بخود از راہِ تفکر — استقلالاً نہ ام ہمیشہ
باآنکہ کلیمِ دوز بانم — باخود دارم بکم ہمیشہ
دارم بہ ہمہ دو نوع نسبت — زانچہ نہ کنم کنم ہمیشہ
از ہر چہ کہ فصل و بعد دارم — نزدیکم و اصلم ہمیشہ
نہ شگفتہ دلم اگرچہ غنچہ — از شیفتگیٔ گلم ہمیشہ
مینائے شرابِ فیض گوید — لَاتَسۡکُتُ و قلقلم ہمیشہ
اے ناقص اگرچہ ناقصم من — مستکمل و کاملم ہمیشہ
شہ میر کہ مرشد است و پیرم — او ساختہ مرشدم ہمیشہ

محبوب ندا کند کہ اے نورؔ
آنجا کہ توئی منم ہمیشہ

محمد حسین لطیفی قادری جنیدی: اردو معلم مدرسۂ فوقانیہ مدنپلی (چتور ضلع: آندھرا)

خلاقِ کائنات نے اس دنیا میں ایسے برگزیدہ بندوں کو پیدا کیا جو مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے اُن کا نام روشن ہے۔

ایک روز میں حضرت قبلہ ناظم صاحب کا لکھا ہوا مضمون "علمائے حق اور شاہانِ وقت" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے اچانک جنوبی ہندوستان کی مشہور و معروف درس گاہ "دار العلوم لطیفیہ، حضرت مکان" قطبِ ویلور اور اس وقت کے تینوں بزرگ مرشدی سیدی قبلہ اعلیحضرت علیہ الرحمہ" قبلہ میراں پاشاہؒ"، حضرت قبلہ ناظم صاحبؒ کی شفقت یاد آگئی۔ اُن کے سایۂ عاطفت میں طالب علمی کا جو سنہری دور گزرا تھا، جنھوں نے ہمیں اپنے ماں باپ سے بڑھ کر پیار و محبت، نصیحت سے تعلیم و تربیت فرمائی آج بھی ان کی یاد دلوں کو تڑپاتی ہے، جس کا ذکر مختصر طور کر رہا ہوں:

یہ مادرِ علمی میری ہے۔ میں اس کا ایک بچہ ہوں:

واقعی وہ دور کتنا اچھا تھا، جہاں پر تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ روحانی فیوض و برکات سے ہم مالا مال ہوتے رہے۔ سب سے پہلے مرشدی سیدی اعلیحضرتؒ کا ذکر کروں۔

وہ بچوں پر بہت ہی مہربان، تعلیم و تربیت، خورد و نوش اور نگہبانی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ کسبِ حلال خود کھاتے اور بچوں کو بھی وہی کھلاتے۔ ایک وقت کی بات ہے کہ آپؒ مدرسہ میں تشریف فرما تھے۔ مجھے اور دو ساتھیوں کو کچھ کام سے طلب فرمایا تھا۔ اتنے میں ایک معمر آدمی کہاں کے تھے پتہ نہیں علاج کے لیے C.M.C ہسپتال آئے تھے۔ یہ معلوم کر کے یہاں ایک خانقاہ اور سادات و سنیت کا مدرسہ ہے۔ یہاں کے سجادہ نشین باکمال بزرگ ہیں، ملاقات کے لیے آئے تھے اور صحت یابی کی دعا کی گزارش بھی کئے۔ اس کے بعد بڑی عاجزی و انکساری، بڑے ادب کے ساتھ دلی تمنا کا اظہار فرمایا:

میری خواہش ہے کہ آپ کے مدرسے کے طلباء کو بطورِ صدقہ بکرا ذبح کر کے گوشت کھلایا جائے۔ فوراً قبلہ اعلیحضرت مسکراتے ہوئے صاف صاف یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ہم اپنے بچّوں صدقہ وزکوٰۃ کا مال نہیں کھلاتے۔

فجر نماز بعد زراعت کرانے کھیتی باڑی کے لیے چلے جاتے زمین سے جو غلّہ اگتا وہی بچوں کو کھلاتے۔ کبھی کبھار بچّوں سے کوتاہی یا غلطی ہو جائے تو ہماری اصلاح کے لیے قبلہ ناظم صاحب دو یا تین وقت کا کھانا بند کر دیتے۔ جیسے ہی اعلیحضرت کو یہ بات معلوم ہوتی تو بلا کر آئندہ غلطی نہ کرنے کی نصیحت اور وعدہ لے یا پھر ہلکی سی سزا دے کر کھانا کھانے کو کہتے۔ اس خیال سے کر یہ کہیں بھوکا نہ رہ جائے۔ اُن بزرگوں میں ایک میں اصلاح کے لیے سختی کا جذبہ تو دوسرے میں نرمی کا پہلو۔

حضرت قبلہ میراں باشاہ بہت شفیق ومہربان بزرگ تھے۔ بچّوں کو پیار ومحبت سے علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کی نصیحت کرتے۔ خاص کر رات کے وقت مطبخ میں خود آکر بیٹھتے اور بچوں کو پیٹ بھر کر کھلاتے اور کھانے پینے کے آداب بھی سکھاتے۔ کھانا پکانے میں کمی بیشی ہو تو پکاتی کو ڈانٹتے۔ ایک اور ان کی عادت تھی کہ چاہے سردی ہو گرمی رات کے تین بجے بڑی پابندی سے اٹھ کر صبح صادق تک ذکر الٰہی فرماتے اور جیسے ہی موذن اذاں کہتے تو سارے بچّوں کو مہربان باپ کی طرح لاٹھی لیے ہوئے اور آواز دیتے ہوئے فجر کی نماز کے لیے بچوں کو یہ کہتے ہوئے اٹھاتے۔

"مولوی صاحب اٹھو، نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

مدرسہ ہی کے ایک کمرے میں رات گزارتے۔ کوئی مہمان دُور دراز سے رات کے کسی وقت میں آجائے تو کھانا کھلا کر ہی سُلاتے۔

حضرت ناظم صاحب قبلہ ٹھیک دس بجے اپنے مکان سے دفتر تشریف لاتے۔ بہت سارے لوگ اور طلباء آپ کے منتظر رہتے۔ ہر کیک کی بات کو غور سے سنتے، بڑی مسکراہٹ، حسنِ اخلاق سے ہر معاملہ کو ایسا سلجھاتے تھے کہ ہر ایک مطمئن ہو کر بڑی عقیدت دل میں لیے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔

وہ بچّوں اور استادوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ درس وتدریس میں کسی قسم کی کوتاہی کو برداشت نہیں کرتے استادوں کو دلجوئی سے پڑھانے اور بچّوں کو اچھے نتائج لانے کے لیے قدم قدم پر ہمت افزائی فرماتے اور یہ اکثر کہا کرتے تھے ہمارے مدرسہ کے طلباء دینی ودنیوی تعلیم میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے ہوئے ہر میدان میں چاہے تقریری ہو یا تحریری سب سے آگے رہنا چاہیے۔

انھوں نے مولوی عالم، مولوی کامل کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے امتحانات ادیبِ فاضل، منشی فاضل،

افضل العلماء کے ذریعہ معاش سے بے فکر کردیا۔ یہ انھیں کا فیض و کمال ہے کہ اس مدرسہ کے طلباء ٹمل ناڈو، آندھرا پردیش اور کرناٹکا کے مختلف اضلاع کے سرکاری اسکولوں میں معلمی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صحت و تندرستی کے لیے نماز عصر کے بعد مدرسے کے وسیع میدان میں کھیل کود کا بھی انتظام ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں بچے باہر گھوم پھر کر بگڑ نہ جائیں اور بچوں کے اندر اخلاقی کردار بلند کرنے کے لیے علمائے حق کے انمول واقعات بتاتے اور حوصلہ بڑھانے اور حق پرستی کا جذبہ پیدا فرماتے اور بھی بہت سارے واقعات ان بزرگوں کے سنایا کرتے تھے۔

مضمون کی طوالت کی وجہ سے مختصر طور پر ایک واقعہ پیش فرما کر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ مدرسہ کے سالانہ اختتامی جلسہ میں علماء، عوام الناس و طلباء سے خطاب فرماتے ہوئے کہا: حضرت سید احمد کبیر رفاعی علیہ الرحمہ ایک روز اہل علم کی مجلس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: عزیزو! اللہ تعالیٰ نے تم کو علم کی دولت سے نوازا ہے مسلمانوں کی تعلیم اور لوگوں کی اصلاح تمہارے ذمہ کردی ہے العلماء ورثۃ الانبیاء: علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

یاد رکھو علم اور حق بات چھپانے والے کے منہ میں آگ کی لگام دی جائیگی۔ تعلیم دینے میں جس قدر محنت و مشقت کروگے اسی قدر عظیم اجر پاؤگے۔ ورنہ عذاب میں مبتلا کئے جاؤگے۔ اے علماءِ دین متین! تم درس دیتے ہو، احکام شرعیہ بیان کرتے ہو، خبردار! تم چھلنی کی طرح نہ ہوجانا کہ چھلنی تو اچھا اور عمدہ آٹا تو چھان دیتی ہے لیکن بھوسہ اسی میں رہ جاتا ہے۔ کہیں تمہارا حال بھی ایسا نہ ہوجاے۔ تم اپنے منہ سے حکمت و نصیحت کی باتیں تو کرتے ہو، لیکن دلوں کے اندر کھوٹ رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سے اس کی باز پرس کرے گا اور تم کو اپنے کہے ہوئے پر عمل نہ کرنے کی بناء پر سخت عذاب میں مبتلا کردے گا۔ غفلت دل کی سیاہی ہے اور سیاہ دل پر کسی اچھی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اپنے دلوں کی حفاظت کرو۔ ؎

علم چنداں کہ بیشتر خوانی ۔۔۔ در تو عمل نیست نادانی

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ۔۔۔ پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
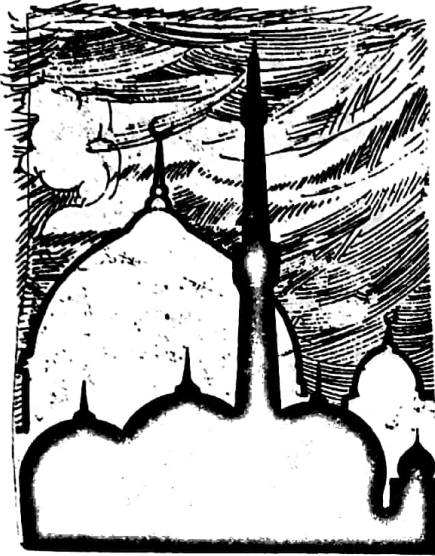
حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی علیہ الرحمۃ اللہ

محمد شفاعت احمد سلیم۔ اردو منشی۔ وی۔ آر۔ ہائی اسکول۔ نیلور۔ آندھرا پردیش

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی پیدائش ۱۴۲ئ ۶۳۶ھ میں بدایوں میں ہوی۔ آپ کے والد صاحب کا نام خواجہ احمد اور دادا کا نام خواجہ علی تھا۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا نام بی بی زلیخا اور نانا کا نام خواجہ عربؒ تھا۔ آپ کے دادا اور نانا بخارا سے ہندوستان آئے۔ کچھ دن لاہور میں قیام فرمانے کے بعد بدایوں تشریف لائے۔

آپ کا اسم گرامی محمد تھا اور لقب نظام الدین۔ (بابا فریدالدینؒ نے اپنے خلافت نامہ میں یہی نام لکھا ہے مولانا کمال الدین زاہد نے بھی اپنے اجازت نامہ میں یہی نام لکھا ہے اور آپ کی والدہ صاحبہ اور گھر کے تمام افراد آپ کو اسی نام سے پکارتے تھے۔) لفظ 'اولیاءؒ' بعد میں شامل کر لیا گیا۔ 'محبوب الٰہی' کا لقب حضرت شیخ نظام الدین کی دردمندیِ خلق کے اعتراف میں اور اس حدیث نبویؐ کی روشنی میں دیا گیا۔

الخلق عیال اللہ واحب الی اللہ من احسن الی عیالہ (خدا کی مخلوق اس کا کنبہ اور خدا سب کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ بھلائی کرتا ہے۔

حضرت امیر خسرو نے ایک جگہ اس طرح لکھا ہے: ؎

بجنّ وانس راند پادشاہی　　نظام الدین محبوب الٰہیؒ

(جن اور انسان دونوں پر نظام الدین محبوب الٰہی حکومت کرتے تھے۔): ؎

نظامی نسبت کا استعمال بھی سب سے پہلے حضرت خواجہ امیر خسرو نے کیا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ؎

مفتخر از وے بغلامی منم خواجہ نظام است و نظامی منم

(مجھے ان کا غلام ہونے کا فخر ہے۔ میرا خواجہ نظام ہے اور میں نظامی ہوں۔)

حضرت نظام الدینؒ ابھی بچے ہی تھے کہ آپؒ کے والد بزرگوار حضرت خواجہ احمدؒ نے اس دُنیا سے پردہ فرمالیا۔ آپؒ کے والد صاحب کا مزار بدایون میں ہے۔ آپؒ کے والد کے اس دُنیا سے کوچ کرنے کے بعد آپؒ کی ساری ذمہ داری آپؒ کی والدہ صاحبہ پر آپڑی۔ آپؒ کی والدہ نے باوجود ان نامساعد حالات کے آپؒ کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بقول خلیق نظامی: "جس عمارت کی خشتِ اول بی بی زلیخا کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی اس کو بابا فریدؒ کی روحانی بصیرت نے سچائی اور انسان دوستی کا قصرِ عالی شان بنا دیا۔" بدایون میں آپؒ کے دو استادوں کے نام مشہور ہیں۔ ۱۔ شادی مقری، ۲۔ مولانا علاء الدین اصولی۔ مولانا علاء الدین اصولی اپنے وقت کے جید عالم تھے مولانا اصولی ہی نے شیخ نظام الدین کو دستارِ فضیلت باندھا۔ اس تقریب میں مولانا اصولی نے بدایون کے مشہور بزرگ حضرت علی مولا کو شرکت کی دعوت دی۔ دستار کا ایک سرا مولانا اصولی نے اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا سرا حضرت علی مولا کو دیا۔ دونوں بزرگوں نے مل کر حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کو سر پہ دستار باندھی۔

حضرت شیخ نظام الدینؒ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ سلطان ناصر الدین محمود کے دورِ حکومت میں دہلی پہنچے۔ دہلی میں آپؒ نے خواجہ شمس الدینؒ (شمس الملک) مولانا امین الدین محدثؒ اور مولانا کمال الدین زاہدؒ سے علمی استفادہ کیا۔ دہلی میں حضرت محبوبِ الٰہی کے سب سے زیادہ محبوب و ممتاز استاد مولانا کمال الدین زاہدؒ ہی تھے۔ ابتدا میں آپؒ کو رہائش سے متعلق بڑی تکلیفیں پیش آئیں۔ بالآخر آپؒ کو منجانب حق غیاث پور جانے کا غیبی اشارہ ہوا۔ آپؒ فوراً غیاث پور آگئے۔ یہاں بھی پریشانیوں کا سامنا ہوا لیکن حضرت نظام الدین غیاث پور ہی میں رہ کر خدا پرستی کی تلقین کرتے رہے۔ دہلی میں ابتدائی زمانہ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے لیے بڑا ہی صبر آزما رہا۔ طالب علمی کا دور، ماں اور بہن کی ذمہ داری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اکثر جب آپؒ مدرسہ سے گھر واپس آتے تو آپؒ کی والدہ صاحبہ فرماتیں: "نظام الدین آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔" آپؒ کی والدہ ماجدہ ایک ذی بصیرت خاتون تھیں، وہ اکثر آپؒ کے پاؤں کو دیکھ کر آپؒ کے شان دار مستقبل کے بارے میں فرمایا کرتی تھیں: "نظام میں تجھ میں سعادت اور نیک بختی کی علامت دیکھتی ہوں، تو کسی زمانہ میں بڑا صاحب اقبال اور بخت والا ہوگا۔" جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپؒ کی والدہ خود کو فوراً اللہ کی طرف رجوع کرتیں۔ ایک بار کنیز گھر چھوڑ کر چلی گئی تو اس کی واپسی کے لیے خدا سے دعا کی اور کہا کہ جب تک کنیز گھر واپس نہ آئے گی، میں سر پر ڈوپٹہ نہ رکھوں گی۔ تھوڑی ہی

دیر بعد کنیز واپس آگئی۔ حضرت نظام الدینؒ بھی اپنی والدہ کی دعاؤں کی تاثیر سے بہت متاثر تھے۔ کہا کرتے: جب بھی اُن سے دعا کرائی، ہفتہ کے اندر اندر وہ دعا قبولِ بارگاہِ الٰہی ہو جاتی تھی۔ ایک بار جمادی الآخر کی چاند رات کو شیخ نظام الدینؒ چاند دیکھ کر اپنی والدہ صاحبہ کو ماہِ نو کی مبارک بادی دی تو انھوں نے فرمایا: ''اے نظام آیندہ ماہ چاند رات کو کس کے پاؤں پر سر رکھو گے اور کس کو مبارک باد دو گے''۔ یہ جملہ سن کر آپؒ نے اپنی والدہ کا اشارہ پہچان لیا اور زار و قطار رونے لگے۔ اسی طرح دوسرے دن صبح آپؒ کی والدہ صاحبہ اس سرائے فانی سے کوچ کر گئیں۔ آپؒ کی والدہ صاحبہ کا مزارِ مبارک ادھ چینی گاؤں میں ہے۔ جو قطب مینار سے ایک میل کے فاصلہ پر لب سڑک واقع ہے۔ دلی میں اس درگاہ کو بی بی نُور کی درگاہ کہتے ہیں۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۵-۱۲۶۵ء) اس عہد کے مشہور و معروف بزرگ اور عالمِ دین، عظیم المرتبت شیخ طریقت تھے۔ اجودھن میں آپؒ کی خانقاہ رشد و ہدایت کا گہوارہ اور ارشاد و تلقین کا مرکز تھی۔ چاروں طرف سے لوگ روحانی سکون کی خاطر یہاں آکر جمع ہوتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر بارہ۱۲ سال کی تھی، بدایون کے ایک مکتب میں آپؒ نے ابوبکر خراط نامی شخص سے بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا نام مبارک سُنا ان کا ذکر سُنا۔ اسی وقت سے آپؒ کا دِل بے اختیارانہ ادھر راغب ہوا اور خاموشی سے دل میں ایک چنگاری جل اُٹھی جس نے آگے چل کر ایک شعلۂ عشق کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۵-۱۲ کی عمر میں جب آپؒ دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو عزیز عوض نامی ایک ضعیف آدمی جو کہ ہم سفر تھے اور بابا فریدالدینؒ کے مرید تھے، آپؒ نے اُن سے بھی بابا فریدالدینؒ کا ذکر سُنا۔ آپؒ کے دل میں شیخ فریدالدین سے نادیدہ عشق بڑھتا ہی گیا۔ حضرت نظام الدینؒ دہلی پہنچ کر جس محلہ میں رہنے لگے، وہاں پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکلؒ رہتے تھے۔ (یہ بابا فریدالدینؒ کے بھائی تھے)۔ حضرت نظام الدینؒ اولیاء اور حضرت شیخ نجیب الدینؒ کے تعلقات بہت گہرے ہونے لگے۔ حضرت شیخ نجیب الدینؒ متوکل حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ، دوست، رہبر، مشیر سب تھے۔ دہلی میں حضرت نظام الدینؒ آپؒ سے بہت متاثر تھے۔ آپؒ کی صحبت میں رہ کر بابا فریدالدین کے متعلق معلومات اور عقیدت میں اضافہ کرتے رہے۔ حضرت شیخ نظام الدینؒ نے جب اجودھن کی راہ لی تب آپؒ کی عمر بیس۲۰ سال کی ہوگی۔ آستانۂ بابا فریدؒ پر آپؒ نے بدھ کے دن حاضری کی سعادت حاصل فرمائی۔ اس وقت حضرت بابا فریدالدینؒ کی عمر نوّے۹۰ سال کی تھی۔ آپؒ نے ۷۵ سال تک تقریباً اللہ کے بندوں کی رہبری فرمائی تھی۔ اب آپؒ کو ایک ایسے گوہر کی تلاش تھی، جو نیابت اور سجادگی کے قابل ہو۔ جب بابا فریدالدین نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھا تو فرمایا: ۵

اے آتش فراقت دل ہا کباب کردہ   سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

(تیری جدائی کی آگ نے دل کو کباب کر دیا اور تیری ملاقات کے اشتیاق نے جان کو تباہ کر ڈالا۔)

اس وقت حضرت نظام الدین اولیاء پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ آپ کانپنے لگے۔ پھر کچھ سنبھل کر اتنا کہہ پائے کہ: "کمترین کو حضور کی پا بوسی کی بڑی آرزو تھی۔"

اسی دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بیعت سے سرفراز کیا گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے لیے بابا فریدالدینؒ نہ معلوم سے انتظار کر رہے تھے۔ جب حضرت نظام الدینؒ نے بابا فریدالدین سے ملاقات کی تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کی روحانی میراث کا صحیح وارث آگیا ہے۔ یہاں سے حضرت نظام کی تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دن شیخ نظام الدینؒ نے اپنے پیر سے کہا: "حکم ہو تو تحصیل علوم کو چھوڑ کر اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں۔" فرمایا: "میں کسی تحصیلِ علم سے منع نہیں کرتا۔ تم تحصیلِ علم بھی کرو اور اوراد و وظائف میں مصروف رہو۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں سے ایک خود بخود غالب ہو جائے۔ علم بھی درویش کے لیے ضروری ہے۔ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی۔" یہ پہلا اصول تھا جو ذہن نشین کیا گیا۔ بغیر علم راہِ معرفت میں چلنا دشوار ہے۔"

بابا فریدالدینؒ کے جماعت خانہ میں ایک جوگی سے حضرت نظام الدینؒ گفتگو کر رہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ بعض بچے بے ذوق پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو مباشرت کا وقت معلوم نہیں۔ جوگی نے بتایا کہ ہر دن کی خاصیت علیحدہ ہے۔ حضرت شیخ نظام الدینؒ نے علیحدہ علیحدہ دنوں کی خاصیت جوگی سے سن کر یاد کر لی۔ بابا فریدالدینؒ نے سنا تو فرمایا: "جو کچھ تم یاد کر رہے ہو یہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے پیر و مرشد کا منشاء سمجھ لیا اور عمر بھر مجرّد (غیر شادی شدہ) رہے۔

ایک دن نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ نے دیکھا کہ بابا فریدالدینؒ اپنے حجرہ میں سر برہنہ چاروں طرف پھر رہے تھے اور یہ قطعہ بار بار پڑھتے ہیں اور سجدہ میں سر رکھ دیتے ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم	خاکے شوم و زیر پائے تو زیم
مقصودِ من خستہ ز کونین توئی	از بہر تو میرم ز برائے تو زیم

(میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ تیری (ہی) محبت میں زندہ رہوں، خاک ہو جاؤں اور تیرے پاؤں کے نیچے زندہ رہوں۔ کونین میں خستہ کا مطلوب تو ہی ہے۔ میں تیرے ہی لیے مرتا ہوں اور تیرے ہی لیے جیتا ہوں۔)

حضرت محبوب الٰہی نے مرشد کی اس کیفیت کو غیر معمولی روحانی سرشاری کا نتیجہ سمجھا اور بے اختیار حجرہ میں داخل ہو کر مخدوم کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمایا: "نظام جو کچھ مانگنا چاہتے ہو مانگو۔" عرض کیا: "استقامت چاہتا ہوں۔" بابا فرید نے

اس کے لیے دعا فرمائی۔ بعد حضرت محبوبِ الٰہی کو پشیمانی ہوی کہ سماع کی حالت میں دنیا سے اٹھنے کی استدعا کیوں نہ کی۔
حضرت نظام الدین کو سلسلہ میں داخل فرمانے کے بعد بابا فرید الدینؒ تین ۳ سال زندہ رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہر سال آپؒ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور ان تین ملاقاتوں میں حضرت بابا فریدؒ نے اپنے اس چہیتے مرید کی پوری تکمیل فرمادی۔ رمضان ۶۶۹ھ میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے شیخ بابا فرید الدینؒ کی خدمت مبارکہ میں آخری حاضری دی۔ اور اس موقعہ پر مرشدؒ نے اپنی روحانی ذمہ داریوں کو ان کی طرف منتقل کر کے شان دار مستقبل کی بشارت دی۔ مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے لکھوا کر خلافت نامہ عنایت فرمایا اور ہانسی میں شیخ جمال الدینؒ ہانسوی کو دہلی میں قاضی منتخب کو دکھانے کی ہدایت فرمائی۔ اس خلافت نامہ میں شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو نہایت محبت کے ساتھ " فرزند رشید، امام پاک دین پاک رائے، دانش مند برگزیدہ" کہا گیا ہے۔ اور اس حدیث پر ختم کیا ہے۔ " تو دنیا میں مسافر یا رستہ چلنے والے کی طرح رہ اور اپنے نفس کو اصحابِ قبور سے شمار کر۔"

یہ خلافت نامہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۶۹ھ کو عنایت فرمایا۔ نمازِ جمعہ سے فراغت کے بعد شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر نے اپنا لعاب دہن ان کے منھ میں لگایا اور کلام پاک حفظ کرنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد ان کے وہ روحانی جذبات متحرک ہوئے جن کے ماتحت انھوں نے اپنے سب سے کم عمر مرید اور خلیفہ کی تربیت کی تھی آواز دی: " نظام!" عرض کیا،" حاضر ہوں"۔ فرمایا: " قضا و قدر نے تجھے دین و دنیا کا مالک کر دیا ہے۔ جا ملک ہند پر قبضہ کر!" چند دن قبل ان کے لیے دعا کر چکے تھے۔" اللہ تعالیٰ تجھے دونوں جہاں میں نیک بخت کردے ...... تو ایک ایسا درخت ہو، جس کے سایہ میں ایک خلق کثیر آسائش اور راحت سے رہے"، حضرت شیخ نظام الدینؒ جب اجودھن سے دہلی روانہ ہوئے تو ہانسی میں شیخ جمالؒ کو خلافت نامہ دکھایا انھوں نے فرمایا: ؎

خدائے جہاں راہزاراں سپاس — کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

(اللہ تعالیٰ کا ہزار بار شکر کہ اس نے موتی اس کو دیا جو اس کی قدر جانتا ہے۔)

حضرت نظام الدینؒ جب اجودھن سے دہلی واپس آئے تب سے حضرت بابا شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ خلہ کی بیماری نے آپ کو نڈھال کر دیا اور تھوڑے بہت ہی عرصہ میں بابا فرید الدین کا وصال ہو گیا۔ وہ آفتابِ رشاد جو برسہا برس تاریک دلوں میں روشنی پہنچاتا رہا، ہماری ظاہری نگاہوں سے غروب ہو گیا۔
حضرت نظام الدینؒ اولیا جب آخری مرتبہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت سے واپس آئے تو چشتیہ سلسلہ کے سربراہ

کی حیثیت سے آپؒ کو بہت سی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اٹھانا پڑا۔ ایک طرف چشتیہ سلسلہ کی توسیع واشاعت تو دوسری طرف اپنے پیرو مرشد بابا فرید الدینؒ کے مریدین ومنسلکین اور خلفاء کو ایک حلقۂ محبت میں جمع کرنا تھا۔ ان ذمہ داریوں کو محبوبِ الٰہیؒ نے نہایت ہی بہتر طریقہ سے نبھایا۔ بہت ہی کم عرصہ میں حضرت بابا فرید الدینؒ کے مریدین کی خانقاہیں بنگال سے لے کر گجرات اور دہلی سے لے کر دیوگیر تک ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں۔ حضرت بابا فرید الدینؒ کے مریدین کو آپؒ نے کس انداز سے محبت اور اتحاد کے رشتہ میں باندھا یہ حضرت امیر خسرو کی زبانی سنیں: ؎

شد سلک فریداز تو منظوم! زانست کہ شد لقب نظامت

(بابا فریدؒ کی لڑی کو تم نے ایک رشتۂ الفت میں پرو دیا اسی وجہ سے تمہارا لقب نظام ہوا)

اسی بات کو علامہ اقبالؔ نے اس طرح کہا ہے: ؎

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہے قائم نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

”ہندوستان کی تمدنی اور روحانی تاریخ میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے مذہب کا وہ انقلابی تصور پیش کیا تھا جس میں خدمت خلق کو دینی عبادت کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ سلطان اور سیاست دونوں سے علیحدہ رہ کر انھوں نے آدم گری کا کام انجام دیا اور روحانی جذبہ سے سرشار انسانوں کی ایک نسل پیدا کردی۔ جس نے اپنی زندگی کو اخلاقی اور روحانی اقدار کی چاکری میں لگا دیا۔ ان کی خانقاہ سے روحانیت اور انسان دوستی کے سوتے پھوٹ کر سارے ملک میں پھیل گئے۔“ (خلیق احمد نظامی)

ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے تصوف کی تحریک کو عوامی تحریک بنا دیا اور بیعت عام کے دروازے کھول دیے۔ جو شخص بیعت کی درخواست کرتا، اس کو بخوشی مرید کر لیتے تھے۔ آخری زمانہ میں خلافت کے لیے بعض نام پیش ہوئے تو اخی سراج کا نام دیکھ کر آپؒ نے فرمایا: ”اس کام میں اوّل درجہ علم کا ہے۔“ حضرت نظام الدینؒ نے خلافت کے معاملہ میں یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھا اور کسی بے علم کو کبھی خلافت سے نہیں نوازا۔ خلافت کے معاملہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے چند اصول یہ تھے۔ ۱۔ خلافت کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔ (۲) خلیفہ کا کام اللہ کی طرف بلانا اور برائی سے بچانا ہے۔ (۳) سنت پر استقامت لازمی ہے۔ (۴) خلیفہ کو خلق میں رہ کر کام کرنا چاہیے۔ (۵) عجز و انکسار کے بغیر عوام میں کام نہیں ہو سکتا۔ (۶) دنیا اور مادی علائق اور آلائشوں سے دور رہنا ضروری ہے۔ (۷) شاہی ملازمت یا جاگیر قبول کرنے کے بعد خلافت باقی نہیں رہ سکتی۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدوں کو اس وقت خلافت عطا کی جب یہ اطمینان کر لیتے کہ یہ اصول ان کی شخصیت کا جزو بن چکے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ کچھ لوگ دہلی اور اطراف کے ہوتے اور کچھ ایسے ہوتے کہ جو بڑی مسافت طے کر کے دُور دراز علاقوں سے آتے۔ اگر کبھی منگولوں کے حملہ کا ڈر ہوتا تو قرب وجوار کے بے شمار لوگ پناہ لینے کے لیے خانقاہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ حضرت نظام الدینؒ کا لنگر دن بھر چلتا رہتا تھا اور آپ خود روزہ سے ہوتے تھے لیکن آنے والوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتے رہتے تھے۔ آپ لوگوں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ کھلانے کے سلسلہ میں مذہب، عقیدت، مسلک کسی چیز کو لنگرِ عام پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ خانقاہ میں جو بھی آتا خالی ہاتھ ہو یا تحائف کے ساتھ کوئی مقصد ضرور دل میں لاتا، کچھ لوگ روحانی اصلاح وتربیت کی نظر سے آتے۔ ایسے لوگ بقول شیخ نصیر الدین چراغ دہلی ہمیشہ باعثِ مسرت ہوتے اور ان کے ساتھ وقت صرف کرنے میں روحانی کیف محسوس ہوتا۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوتے تھے۔ اکثر تو کسی دنیاوی مقصد کے لیے آتے تھے اور یہ عقیدہ ساتھ لے کر آتے تھے کہ آپؒ کی دُعا سے اُن کے مسائل حل اور مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ ہر شخص کی پریشانی کو اور ذہنی کیفیت کو معلوم کر کے اور اس کی پریشانی کو اپنے اوپر طاری کر کے اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے۔ کسی کو وظیفہ بتا دیتے۔ کسی کو کچھ روپیہ اور کپڑا اعطا فرماتے۔ کسی کے لیے سفارش کا خط لکھ دیتے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ سماع کو بہت ہی پسند فرماتے تھے۔ آپؒ کی خانقاہ میں قوالوں کا باقاعدہ انتظام رہتا تھا۔ بعض اوقات کسی خوش لحن مرید یا شاعر سے بھی اشعار ترنم سے سُن لیتے تھے۔ لیکن اکثر یہ خدمت قوال ہی انجام دیتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سماع کی چار قسمیں قرار دی تھیں۔ حلال، حرام، مکروہ، مباح۔ جس کا رجحان بالکل حق کی طرف ہو اس کے لیے حلال ہے۔ جس کا بیشتر حق کی طرف ہو اس کے لیے مباح۔ جس کا میلان مجاز کی طرف زیادہ ہو اس کے لیے حرام۔ پھر جن کے لیے سماع حلال تھا ان کے لیے بھی بعض شرطیں تھیں۔ جن پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ گانے والا مرد ہو، لڑکا ہو، عورت نہ ہو، سننے والا حق سے خالی نہ ہوں۔ جو چیز سنائی جائے وہ فحش یا مسخرہ پن کی نہ ہو۔ مزامیر (چنگ، رباب، باجے) استعمال نہ کئے جائیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا معمول تھا کہ جب سماع میں شرکت کا دعوت نامہ قبول فرماتے تھے تو دو روز پہلے افطار میں کمی کر دیتے تھے۔ دہلی میں جہاں بھی محفل ہوتی اور کیسے ہی مشائخ اور صاحبانِ سجادہ وہاں موجود ہوتے لیکن صدر نشین محبوب الٰہیؒ ہی ہوتے۔ گو آپ صاحبِ سماع نہیں بنتے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک قوال حسن میمندی تھا۔ جس کے گانے کی تاثیر غیر معمولی تھی۔ دوسرا امامت تھا جو علمِ موسیقی میں لاجواب تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا دستور کہ دورانِ سماع جو کپڑا یا دستار جیبِ آنسوؤں سے تر ہو جاتا اسے قوال کو مرحمت فرما دیتے تھے۔ جب

آپ کسی باغ یا خطیرہ تشریف لے جاتے تو ڈولے کے ایک طرف اقبال اور دوسری طرف عبداللہ چلتے اور نرم اور رقّت آمیز الفاظ میں اشعار پڑھتے جاتے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور آنسو اُن کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ ہندی دوہوں کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کہنا تھا کہ اللہ کی محبت کے بغیر انسانی زندگی نامکمل اور ناقص رہتی ہے۔ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ محبتِ الٰہی کا سب سے موثر ذریعہ بتاتے تھے۔ ان کے خلافت ناموں میں اس کی ہدایت ہوتی تھی۔ خود شیخ نظام الدین کی زندگی میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سما گیا تھا کہ ہر موقعہ پر کوئی حدیث بیان کرتے یا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت اور فضیلت ذہن نشین کراتے۔ ان کی غیرتِ عشق اس کو قبول نہ کرتی تھی کہ حج کے طفیل میں زیارتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے۔ مولانا حسام الدین جو "قوت القلوب" اور "احیاء العلوم" کے حافظ تھے۔ جب حج سے واپس آئے اور مدینہ منوّرہ کی حاضری کے متعلق اطلاع دی تو شیخ نظام الدینؒ نے فرمایا: "جو شخص خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہونا چاہے اُسے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی علیحدہ نیت کرنا اور ایسی نیت سے جانا چاہیے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا خاص مستحق ہو۔ کسی طفیل میں زیارت نہ کرے۔ مولانا حسام الدین مرشد کا منشاء سمجھ گئے اور دوبارہ مدینہ منوّرہ کی نیت سے روانہ ہوئے۔"

حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد تھا کہ جب انسان اپنی باطنی صفائی نہیں کرتا اس کی روحانی ترقی ممکن نہیں۔ جس دل میں کینہ، بغض، حسد اور انتقام کا جذبہ ہو، وہ انوارِ ربانی کا محل نہیں بن سکتا۔" حضرت محبوب الٰہیؒ قلوبِ انسانی کو راحت پہنچانا تصوف کی تعلیم کا نچوڑ سمجھتے ہیں۔ حضرت شیخ المشائخؒ اپنے منسلکین و مریدین کو ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتے تھے۔ اس ترکِ دُنیا سے دُنیا کی جدوجہد کو چھوڑ کر گوشہ گیری اختیار کر لینا مقصود نہیں تھا۔ اس کا مطلب مادّی اور دُنیاوی فوائد کی جستجو میں اعلیٰ روحانی و اخلاقی ذمہ داریوں کو فراموش کر دینا تھا۔ ان کے خیال میں دُنیا نہیں بلکہ دُنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف تھا۔ فرمایا کرتے تھے" ترکِ دُنیا یہ نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو برہنہ کرلے اور لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترکِ دُنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی کھائے، جو کچھ اُسے پہنچے اسے جائز سمجھے۔ لیکن ذخیرہ اندوزی نہ کرے اور اپنی طبیعت کو کسی چیز سے نہ باندھے۔"

شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدین کو کسبِ حلال کی ہدایت کرتے تھے اور حرام لقمے سے معدے کو پاک رکھنے پر زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ روزی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا انسان کا فریضہ ہے۔ جو اپنے اہل و عیال کے لیے روزی کا سامان مہیا کرتا ہے وہ حقیقتاً عبادتِ الٰہی کرتا ہے۔ فتوح پر گزراوقات کی اجازت صرف خلفاء پر تھی۔ جن پر دوسروں کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری تھی اور جن کو اپنا سارا وقت اسی میں صرف کرنا تھا۔ عام مریدوں کو حکم تھا کہ وہ محنت کر کے روزی حاصل کریں۔

حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے مریدوں کو جو عقیدت اور محبت ان کی ذاتِ بابرکت سے تھی، آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ حضرت امیر خسرو کی ان کے سامنے وہ کیفیت ہوجاتی تھی جو سورج کی طرف آئینہ کرنے سے ہوتی ہے۔ مولانا برہان الدین غریبؒ نے ساری عمر کبھی غیاث پور کی طرف پشت نہیں کی۔ مولانا تاج داؤدی جب آپؒ کا نام سنتے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے۔ خواجہ شمس الدین نمازِ باجماعت میں کھڑے ہوتے تو نیّت باندھنے سے پہلے سر جھکا کر حضرت کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔ مولانا علاء الدین نیلی "فوائد الفواد" کے مطالعہ کے ذریعہ تصوّرِ شیخ میں مصروف رہتے۔"

شیخ کے کپڑوں اور خطوط کو سب مریدوں نے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اخی سراج نے شیخ کے عطا کردہ کپڑوں کو اپنی قبر کے پاس دفن کرایا اور حضرت امیر خسرو نے ان کے خطوط کو اپنی قبر میں رکھنے کی وصیت کی۔

متواتر روزوں اور رات دن کی مسلسل مشغولیات نے حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ آپؒ تقریباً ایک ماہ شدید بیمار رہے۔ آخری زمانہ میں آپؒ نے گفتگو بہت کم کردی تھی اور غذا تو بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔ جمعہ کے دن حالت تیزی کے ساتھ متغیّر ہونے لگی۔ اثنائے نماز میں بار بار سجدے کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ "آج جمعہ کا دن ہے۔ دوست کو دوست کا وعدہ ضرور یاد رکھنا چاہیے۔" بار بار نماز کے متعلق دریافت فرماتے کہ کیا نماز کا وقت ہوگیا اور کیا میں نماز پڑھ چکا ہوں۔ حاضرین عرض کرتے کہ آپ نماز پڑھ چکے ہیں۔ فرماتے ایک دفعہ اور پڑھ لوں اور یہ مصرعہ دہراتے تھے۔ ع میرویم و میرویم و میرویم (ہم جارہے ہیں، ہم جارہے ہیں، ہم جارہے ہیں)

اپنے عزیز و اقارب، خدمت گاروں اور مریدین کو جو شہر میں موجود تھے بلایا اور فرمایا: "تم گواہ رہنا (اور اپنے خادم اقبال کی طرف اشارہ کرکے) کہ اگر یہ شخص گھر میں کوئی بھی چیز بچا رکھے گا تو کل قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے دربار میں خود ہی جواب دہی کا ذمہ دار ہوگا۔ میں حکم کرتا ہوں کہ جو کچھ گھر میں ہے سب راہ اللہ میں صرف کر ڈالے۔" غرض غلّہ، توشک خانہ کی جملہ اشیاء مساکین اور محتاجوں میں بانٹ دیں گئیں۔ اقبال نے کچھ غلّہ چند دن کے حساب سے بچا رکھا تھا۔ اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور کہا: "اس مردہ ریگ کو کیوں چھوڑا ہے۔" پھر مساکین اور محتاجوں کو بلا کر حکم دیا کہ انبار خانوں کے دروازے توڑ ڈالو اور سارا غلّہ بے خوف ہوکر لوٹ لو اور تمام کوٹھیوں میں جھاڑو دے دو۔ آن کی آن میں سارا غلّہ لوٹ کر لے گئے۔ درگاہ کے لوگوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا، تو فرمایا: "تم گھبراؤ نہیں، تمہاری گزر بسر ہوجائے گی۔" کسی نے عرض کیا تقسیم کا کام کون کرے گا؟ فرمایا: "وہ جو اپنا حصّہ چھوڑ دے گا۔" (سیر الاولیاء)

وفات سے کچھ دن پہلے شیخ رکن الدین ملتانیؒ عیادت کے لیے تشریف لائے اور فرمایا کہ اپنے خاص بندوں

کو اللہ تعالیٰ یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو دُنیا میں کچھ دن اور رہ لیں ۔ اگر شیخ بھی کچھ دن کی اور مہلت لے لیں تو دوسروں کے لیے استفادہ اور فیض کا سلسلہ جاری رہے "۔ شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا: "میں نے خواب میں دیکھا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا فرماتے ہیں کہ نظام تیرا اشتیاق ہمیں انتہا سے زیادہ ہے "۔

۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو اُدھر آسمان پر آفتاب طلوع ہوا اِدھر آفتاب علم وارشاد غروب ہو گیا۔ شیخ رکن الدین ملتانی نے نماز جنازہ پڑھائی اور کہا: "میرا دہلی میں قیام چار سال کا مقصد یہ تھا کہ یہ سعادت میرے مقدر میں لکھی تھی "۔

بعض ملفوظات اور تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے وصیت کی تھی کہ تین دن تک اُن کے جنازے پر سماع ہو، بعد ان کو دفن کیا جائے ۔ مولانا شہاب الدین سے اس بات کا وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کام کو انجام دیں گے۔ کہتے ہیں کہ نماز جنازہ کے بعد مطرب آئے لیکن شیخ رکن الدین ملتانی نے ان کو اجازت نہ دی اور فرمایا "برائے خدا ایسا مت کرو۔ میں قیامت کے دن اس وصیت کا ضامن رہوں گا۔" لکھا ہے کہ بعد کو جب محمد بن تغلق کو اس کا علم ہوا تو اس نے افسوس کیا۔ کہ اس کی اطلاع اس کو کیوں نہ دی گئی ۔ وہ اس وصیت کو پورا کئے بغیر اُن کو دفن نہ کرنے دیتا۔

آپؒ کی آخری آرام گاہ کے لیے عقیدت مندوں نے بہت سی عمارتیں تعمیر کرلی تھیں اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ آپؒ اس تعمیر کردہ عمارت میں دفن ہوں ۔ میر خورد کے نانا شمس الدین وامغانی نے خود حضرت محبوب الٰہیؒ سے اس بارے میں پوچھ لیا۔ فرمایا "مولانا میں کسی عمارت کے نیچے سونے کے قابل نہیں ہوں۔ میں صحرا میں آرام کروں گا" چناں چہ ایسا ہی کیا گیا اور آپؒ کو صحرا میں سپرد خاک فرمایا گیا۔ بعد میں محمد بن تغلق نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے مزار پُر نور پر عالی شان گنبد بنوا دیا۔ ؎

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
(علامہ اقبالؔ)

(بحوالہ: شیخ نظام الدین اولیاء : خلیق احمد نظامی)

ٹمل ناڈو کی ممتاز
نعت گو شاعرہ عاجزہ ترچناپلوی

علیم صبا نویدی — مدیر اعلیٰ "نور جنوب"، چنئی

ٹمل ناڈو کی سرزمین ہر دور میں علم و ادب اور کمال و فن کی آماجگاہ رہی ہے۔ نوابانِ آرکاٹ نے مقامی اور بیرونی اہلِ علم اور اہلِ قلم کی نہ صرف قدر و منزلت کی بلکہ بھرپور سرپرستی بھی فرمائی ہے۔ اسلامی دنیا کے مشہور و معروف عالم قاضی تلہسانی (جن کا مزار آرکاٹ میں واقع ہے) اور شمالی ہند کے جیّد عالم اور باکمال بزرگ حضرت العلام مولانا مولوی عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی اور قادر الکلام شاعر نواب مولانا تجمل حسین خان ایمان گوپاموی نے اس سرزمین کو اپنے مبارک قدموں سے سرفراز فرما کر یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ یہاں ایک اہم بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ ٹمل ناڈو کے صاحبِ خیر اور اہلِ ثروت حضرات نے ہر دور میں شمالی ہند کے اداروں مثلاً مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی، دار العلوم ندوہ، لکھنؤ اور دار العلوم دیوبند کو بالالتزام مالی امداد پہنچائی ہے۔ اس تاریخی کارنامہ پر پردہ ڈالنا یا سرے سے اغماض برتنا قطعی نامناسب بات ہے۔

ٹمل ناڈو کی سرزمین نے سیاست کے میدان میں بھی بڑے نامور پیدا کئے جن پر آج بھی ہمیں ناز ہے۔ اردو ادب کی بارگاہ میں بھی ٹمل ناڈو کے شعراء و ادبا نے بڑے روشن نقوش چھوڑے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہاں کے جینیس شعراء و ادبا نے اپنے نام اور کام کا کبھی بھی ڈھنڈورا نہیں پیٹا بلکہ گوشہ نشینی کو اپنا مقدر بنایا۔ اس ضمن میں مولانا قربی ویلوری، مولانا باقر آگاہ ویلوری، لطیف آرکاٹی، غوثی آرکاٹی، شریف مدراسی اور عاجزہ ترچناپلوی کے علاوہ کئی ارباب سخن ایسے گزرے ہیں جن پر ٹمل ناڈو بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں نے انگریزی زبان کی طرف بہت زیادہ شدت سے توجہ دی اور اپنے قدیم علم و ادب کے سرمایہ سے اس قدر غفلت سے کام لیا کہ اپنے باپ دادا کے علوم و فنون کا انمول ذخیرہ ردّی کاغذ خریدنے والوں کی نذر ہو گیا۔ کئی بیش بہا اور مشہور کتب خانے بھی اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیئے گئے۔ لے دے کے چند اہم کتب خانے ان دنوں رہ گئے ہیں۔ جن میں کتب خانہ

مدرسۂ محمدی، چنئی، کتب خانۂ مدرسۂ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور، کتب خانۂ مدرسۂ باقیات صالحات ویلور اور کتب خانۂ جامعہ دارالسلام عمر آباد، تشنگانِ علم وادب کی علمی، دینی اور ادبی پیاس کا سمندر موجزن ہے۔

مولانا ڈاکٹر آسی فدائی اور راقم الحروف نے متذکرہ کتب خانوں سے وقتاً فوقتاً بھرپور استفادہ کیا ہے اور ان کتب خانوں سے بہت سارے انمول جواہر پارے بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ایک صبح ایک اہم لغت "منتخب اللغات" کی چھان بین میں مدرسۂ لطیفیہ حضرت مکان ویلور کے کتب خانہ سے ٹمل ناڈو کی اہم ترین شاعرہ عاجزہ ترچنا پلوی کا نعتیہ دیوان "تحفۂ قبول" مطبوعہ ۱۳۰۵ھ مطبع فردوسی: ترمل کھڑی (مدراس) ہاتھ لگا، جس نے راقم کو اس شاعرہ پر کچھ لکھنے کی طرف مائل کیا ہے۔ انیسویں صدی میں ٹمل ناڈو کی سرزمین سے نوابانِ آرکاٹ کے دور میں خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کی خواتین نے نہ صرف قوم و ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیں بلکہ اپنی دینی، علمی وادبی خدمات سے ایک دور کو متاثر کیا اور جن کا اعتراف یقیناً نہایت ضروری ہے۔ خاندانِ نواب والاجاہی میں نواب آمنہ آرکاٹی، نواب الفت النساء الفت، نواب قادر النساء شوکت اور نواب مبشر النساء بیگم حیا کی شعری خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

والاجاہی دور میں مختلف علاقوں کے علمی گھرانوں سے شعر وادب کے ایسے چراغ روشن ہوئے، جن کی روشنی آج بھی اوراقِ علم وادب میں محفوظ ہے۔

خاتون بی بی عاجزہ ایسے ہی ایک علمی گھرانے میں ترچنا پلی میں پیدا ہوئیں۔ آپ خاندان سادات سے تھیں۔ آپ کے والد سید محی الدین تھے۔ جن کے پانچ لڑکے تھے اور ایک ہی لڑکی عاجزہ تھیں۔ خود عاجزہ نے لکھا ہے کہ انھوں نے دس سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا عاجزہ اپنی ابتدائی تعلیم اپنے ابا حضور سے حاصل کی جو اپنے دور کے جید عالم و فاضل تھے۔ مولانا محمد علی صاحب سے اردو، عربی اور فارسی کتابیں پڑھیں۔ حضرت عاصی سے فنِ شعر و سخن پر دسترس حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں حضرت شیخ سعدیؒ کی "گلستان" حفظ کی اور اسی عمر میں فارسی شاعری شروع کی۔

عاجزہ کی زندگی کی شروعات دینی تعلیم اور دینی ماحول میں ہوئی تھی آپکے والد، اُستاد اور شوہر (مولوی عبداللہ) سب دین دار بزرگ تھے اس لیے آپکا زیادہ تر رجحان اللہ اور رسولؐ کی خاص محبتوں اور عقیدتوں سے معمور تھا۔ ایک جگہ عاجزہ نے لکھا ہے کہ انھیں حضور اکرمؐ سے اس وقت محبت اور عقیدت ہوئی جب کہ انھوں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا جس کا اظہار ایک شعر میں یوں کیا ہے: ۵

عشق ہے طفلی سے مجھ کو سرورِ عالم ترا غم نہ تھا دنیا کا جب تب سے لگا ہے غم ترا

عاجزہ اپنے بچپن سے عشقِ نبویؐ میں گرفتار تھیں۔ بچپن سے آپ کے دل میں دربار رسول اکرمؐ میں حاضری دینے کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی مگر آپ کی مفلسی نے زندگی بھر اس دیرینہ تمنا کو پورا ہونے نہیں دیا۔ آپ نے اس ناکامی، غم و ہراس کا نقشہ اپنے اشعار میں یوں کھینچا ہے

وصفِ دلبر سے دل کو تھی راحت　　مدحِ سرور سے جاں کو تھی فرحت
ایک ساعت نہ تھا قرار مجھے　　ذکرِ اقدس و فکرِ مدحت سے
یادِ محبوبؐ جب کہ ہوتی تھی!　　مل زمیں پہ جبیں کو روتی تھی!
اور کہتی تھی اے مرے حضرتؐ　　تم کہاں اور کہاں یہ بدقسمت
ہائے! وہ دن کہاں کہ آؤں میں　　سنگِ زینہ پہ سر جھکاؤں میں
رنجِ ہجراں ہیں یا دوصلِ نبیؐ　　باعثِ زندگی رہی میری!
ہوتا تھا دردِ ہجر جب بسیار　　لکھتی تھی شوقِ وصل کے اشعار

مذکورہ بالا اشعار میں جو روانی اور سلاست ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ یقیناً ہم عاجزہ کا نعتیہ کلام کسی شمالی ہند کے سامنے رکھ کر فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ ٹمل ناڈو میں بھی کیسی کیسی گہر بار شعراء موجود تھیں۔

عاجزہ کی نعتیہ شاعری کا مقصد دردِ ہجرِ رسولِ کریمؐ کو کم کرنا اور شوقِ وصل کو تصوری تصوّر میں پورا کرنا تھا۔ آپ کا آخری شعر ملاحظہ فرمائیں کہ وہ جب کبھی ہجرِ رسولؐ میں تڑپتیں تو نعت گوئی کا سہارا لیتیں۔ ؎

فراقِ محمدؐ کی کیا بے کلی ہے　　ہو کیوں مجھ کو راحت یہ دردِ دلی ہے

عاجزہ زبان و فن کی خوبیوں سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ آپ کے ہاں رعایتِ لفظی بہت اہم تھی۔ وہ بے جا الفاظ کی بھرمار سے اپنے کلام کو پاک رکھنا چاہتی تھیں۔ خصوصاً نعت گوئی میں الفاظ کا استعمال میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اس ضمن میں حضرت شریف مدراسی نے عاجزہ کو خراجِ عقیدت یوں پیش کیا ہے: ؎

کیا خوب عاجزہ کا ہے دیوان نعتیہ　　ہر ایک لفظ شاملِ حالِ رسولؐ ہے
حسبُ الطلب شریف نے بے ساختہ کہا　　سالِ خوشی اس کا ذکرِ جمالِ رسولؐ ہے
۱۳۰۵ھ

عاجزہ کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں سادگی اور پرکاری دونوں بیک وقت موجود ہیں مگر انکساری اتنی کہ خود کو آپ نے ایک ناچیز شاعرہ ہی قرار دیا ہے۔ کہتی ہیں: ؎

گر نظر آئیں اس میں سہو و خطا　　از عنایاتِ لطف و جود و عطا
قابلو! اس کی کیجیے صحت　　نظرِ عیب جوئی کیجیے مت

اس اعتراف کے بعد ہمیں عاجزہ کہیں بھی کمتر دکھائی نہیں دیتیں۔ مسرت اس بات کی ہے کہ عاجزہ نے حد درجہ سادگی

سے کام لیتے ہوئے نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا ہے: ؎

یادِ نبیؐ ہے ایمان میرا روئے نبیؐ ہے قرآن میرا
مداح جب سے ہوں شاہِ دیںؐ کی ہے مداح گو ہر انسان میرا
دکھا دیدار اے رشکِ مسیحا تڑپتا ہے دلِ بیمار میرا
منور کیوں نہ ہو دل جب کہ رہبر ہے عشق روئے پُر انوار میرا

عاجزہ کے ایک شعر سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ کسی ہادی و مرشد کے دستِ مبارک پر بیعت کا فیض بھی حاصل کر چکی تھیں۔

الفتِ دو جہاں سے دل چھوٹا جب سے ہمرازِ سرِ مرشد ہوں

ترچناپلی کا آستانہ یوں تو ایک دور تک بزرگانِ دین کا ماخذ و منبع رہا ہے۔ پتہ نہیں اس وقت کے کوئی بزرگ رہے ہوں گے جنھوں نے عاجزہ کو راہِ ہدایت سے مستفیض کیا تھا۔

"دیوان تحفۂ قبول" میں نعتوں کے ساتھ ساتھ لوری نامہ، منقبت در شانِ غوث اعظم، سورۂ الحمد کا ترجمہ اور چند رباعیات بھی جگہ پائی ہیں۔ موصوفہ کی ایک رباعی پیشِ خدمت ہے۔ ؎

ہر طرح خدا سا دل لگانا اچھا الفت سے سبھوں کے باز آنا اچھا
من عرف کے رمز کو سمجھ کر دل میں معبود کو اپنے آپ پانا اچھا

آج عاجزہ کا دیوان نایاب ہے۔ کہیں کہیں قدیم کتابوں میں آپ کے کچھ بکھرے ہوئے اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے موصوفہ کا ایک نعتیہ قطعہ ہاتھ لگا۔ جس کو پیش کرنے کے بعد آپ سے اجازت چاہوں گا۔ ؎

جب پیمبر شافعِ محشر ہمارا ہو گیا حشر کا کیا غم، شفاعت کا سہارا ہو گیا
تشنگیِ محشر کا کیا خوف ہم کو عاجزہ جب کہ حامی ساقیِ کوثر ہمارا ہو گیا

بروفات جناب حافظ قاری عبد المنعم صاحب قادری علیہ الرحمہ

سید فصیح الدین صاحب

جناب حافظ قاری عبدالمنعم صاحب قادری شیخ المشائخ حضرت مولانا مولوی ابوالنصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔

حافظ صاحب کے آبا و اجداد کا تعلق بیجاپور سے تھا۔ وہاں سے آپکے آبا و اجداد آرنی میں آکر مقیم ہوگئے اور یہاں کی قضاوت و امامت حضرت کے خاندان میں رہی اور آج تک بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ جناب حافظ صاحب کے والد بزرگوار قاری عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ صوفی طبیعت کے تھے۔ **حافظ صاحب کا بچپن:** جب آپ کی عمر بارہ (۱۲) سال تھی آپکے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت حافظ صاحب کی دو بہنیں چھوٹی تھیں۔ یہ بچے ان کی والدہ صاحبہ کی زیر تربیت میں تھے۔

تعلیم: جناب حافظ صاحب کی عمر پندرہ (۱۵) سال ہوئی تو حفظ کرنے کا شوق پیدا۔ آپ تنہا ممبئی نکل گئے۔ وہاں حاجی علی کی درگاہ شریف میں مقیم رہے۔ ایک رات آپ کو خواب کے ذریعہ اشارہ ہوا کہ یہاں آپکا مقام نہیں آپ علم حاصل کرنے کے لیے بھوپال جائیے۔ اشارۂ غیبی پاکر حافظ صاحب بھوپال چلے گئے۔ حافظ صاحب نے خود بتایا کہ آپ بھوپال جانے سے پہلے آپکے والد بزرگوار کے استاذ محترم کے خواب میں یعنی قاری عبدالعزیز صاحب کے جو استاذ وہاں تھے، ان کے خواب میں آپکے والد نے آکر کہا کہ میرے فرزند آئیں گے اُن کو قرآن کی تعلیم دیں۔ جب آپکا حفظ مکمل ہوا تو آپ کو قرأت کا شوق ہوا تو لکھنو چلے گئے وہاں سے قاری کی سند حاصل کی پھر اپنے وطن آرنی واپس ہونے سے پہلے بھوپال کی مشہور و معروف شخصیت حضرت مولانا یعقوب صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی وہاں سے آرنی روانہ ہوے۔

اپنے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہونے کے بعد حضرت مکان ویلور کا رخ کیا۔ مدراس اور ممبئی کی بعض مساجد میں آپنے امامت کی جب آپ کی عمر پچیس ۲۵ سال کی ہوئی تو آپکے محلے والوں نے آپ کو طلب کیا اور قاضی پورہ مسجد میں ان کے والد کے مقام پر آپ کو امامت کی ذمہ داری سونپ دی۔ ان کے داخلہ سے پہلے ان کے آبا و اجداد اسی مسجد میں امامت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس مسجد میں آپ کی امامت میں ساتویں پشت تھی۔ آپ سے پہلے ۱: جناب قاضی محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۲: جناب قاضی فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۳: جناب قاضی محمد ابراھیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۴: جناب قاضی محمد حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۵: جناب قاضی محمد صبغۃ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۶: جناب قاضی قاری عبدالعزیز صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین

ستائیس (۲۷) سال کی عمر میں آپ کی شادی ترنامل کے سادات گھرانے اردو منشی جناب سید شاہ رفیع الدین صاحب کے گھر ہوئی آپ کو چار لڑکے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جب آپ قاضی پورہ مسجد میں امامت کے لیے داخل ہوئے تو وہ ایک کھپریل کی چھوٹی سی پرانی مسجد تھی حافظ صاحب نے مسجد کی جدید تعمیر میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ ہر ایک مسلمان کے دوکان میں مسجد کے نام پر ہنڈی رکھ کر وصول کیا ایک نیا طریقہ شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ باہر کی بستیوں میں مثلاً میل وشارم، ویلور، مدراس، بنگلور، بیسور، ممبئی وغیرہ میں جاکر رقم وصول کی۔ مسجد کی تعمیر کے ساتھ دوکانوں کی بھی تعمیر کی ہے۔

خلافت: شیخ کے انتقال کے بعد آپ نے ویلور حضرت مکان سے تعلقات استوار کیا اور اعلحضرت کے دستِ حق پرست پہ بیعت کی اور خرقۂ خلافت پہنا جس کے بعد آپ کی طبیعت بدل گئی آپ میں صوفیانہ مزاج پیدا ہوگیا۔ کسی پر غصہ نہیں کرتے تھے آپ میں حسد نہیں تھا اور دنیاوی خواہشات سے ہمیشہ دُور رہتے تھے۔ جب آپ کی عمر ساٹھ (۶۰) سال ہوئی آپ کو ہارٹ اٹیک پہلی دفعہ ہوا۔ اس وقت آپ کو سی۔ایم۔سی میں داخل کیا گیا۔ آپ صحت یاب ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے امامت کی ذمہ داری چھوڑدی۔ آپ کی جگہ آپکے دوسرے فرزند مولوی محمد صبغۃ اللہ معدنی کو امامت کی ذمہ داری دے دی مگر مسجد سے تعلق تاحیات رہا۔

اخلاق وعادات: آپ کی طبیعت میں عاجزی تھی۔ حاکمانہ انداز نہیں تھا۔ سب آپ کی خدمت کرتے تھے۔ آپ کی طبعت ایسی تھی کہ مخلوق بھی راضی خالق بھی راضی۔ ہمیشہ مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ تاریخ دانی کا بہت شوق تھا۔ آپ میں خودنمائی اور شہرت کا نام نہ تھا۔ آپ میں تحریر اور تقریر کی صلاحیت تھی۔ آپ نے بہت سی اردو کتابوں کا ترجمہ ٹمل زبان میں کیا۔ (۱) اگر اب بھی نہ جاگے۔ (2) ایصالِ ثواب و فاتحہ۔ (3) الروح فی الاسلام۔ (4) اسلامی قانون سازی۔ (5) شریعت طریقت معرفت کے بارے میں ٹمل میں ایک کتاب لکھی ہے۔

وفات: جب آپ کی عمر ستتر (۷۷) سال کی ہوئی تو پھر تیسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ تو ہم سب سے جدا ہو گئے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ٭٭٭
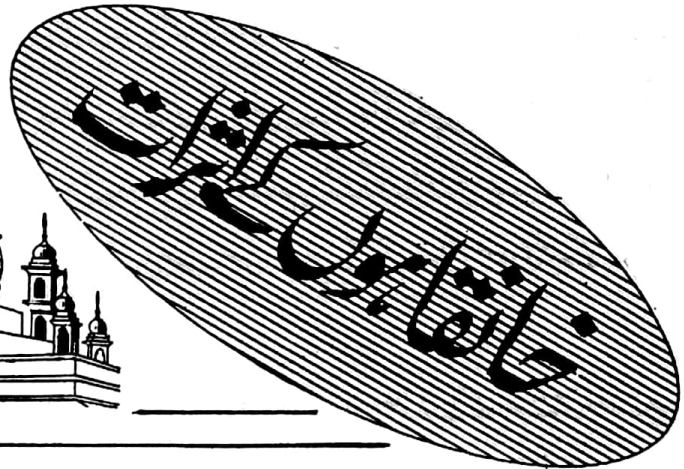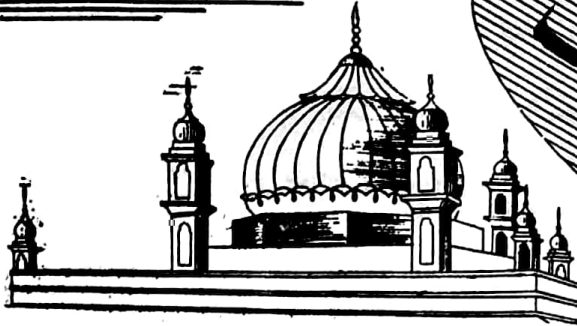
کسی مفکر نے کہا تھا کہ: "ہمیشہ ماضی کا فخر، مستقبل کی تزئین میں رہ نمائی کرتا ہے اور وہی قومیں منزلِ ارتقاء یا جادۂ انقلاب کی کی طرف قدم اٹھاتی ہیں جن کے سامنے ان کا شان دار ماضی ہوتا ہے۔"

اس اقتباس سے جزوی اتفاق تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کُلّی نہیں۔ کیوں کہ صرف اپنے تابناک ماضی کے احساسِ فخر و مباہات سے آج تک کسی قوم کی تقدیر نہیں بدلی بلکہ جس قوم نے بھی دل میں اپنے شان دار ماضی کا طنطنہ لیے تاریخ کی رفتار سے اپنے قدموں کی چاپ ملائی، نصرتیں اس کی ہم رکاب ہوگئیں۔ معاشرہ میں علمی، فکری، سیاسی اور مذہبی انقلاب برپا کرنے کے لیے دو چیزیں نہایت اہم اور کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

پہلے زمانہ کے تقاضے پر حرکت و عمل کا تعیّن اور پھر اس حرکت و عمل کے لیے صحیح سمت میں پیش قدمی۔ اسلام کی زرین تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب اسلامی معاشرے میں ان دو بنیادی اصول پر عمل کیا گیا، تاریخ کے صفحات میں لمحہ اس قوم کی ارتقاء کا نقطۂ تحول (TURNING POINT) بن گیا۔

ہماری عظمتِ رفتہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ قرنِ اول کے بعد جب بھی معاشرہ میں علمی، فکری، سیاسی اور تہذیبی انقلاب آیا۔ اس انقلاب کا محرک صوفیاء کی جماعت بنی۔ یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنھوں نے کبھی تاتاری طوفانوں کا رُخ موڑ دیا، چیچنیا، داغستان اور انگوش میں تین صدیوں پر محیط اسلامی جہاد کی تاریخ رقم کی۔ جزائر میں فرانسیسی اور لیبیا میں اطالوی استعمار کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ جزائرِ شرق الہند کے جنگلوں کو "ھو" کے نغموں سے آباد کیا۔ افریقہ کے ہر تاریک گام پر توحید کے چراغ روشن کیے اور ہندوستان میں کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے آسام تک بتوں کو پیوند خاک کر کے خلقِ خدا کی جبینوں کو وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں جھکا دیا۔ ان کی کامرانی کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے حالات کا رُخ دیکھ کر عمل کا تعین کیا اور پھر پیش قدمی کی۔ ان کی اس روایت نے ہر دور میں انھیں مقبول بنایا اور

سماج میں ان کے بے پناہ اثرات کل بھی رہے اور آج بھی ہیں۔

معاشرے کی تعمیر میں خانقاہوں کے دو بنیادی اصول

خدائے وحدہٗ لاشریک نے اپنی کتاب مقدس میں ہمیں بتایا کہ اس نے ہم میں اپنا رسول بھیجا جو رسول ہمیں احکام الٰہیہ سے روشناس کرتا ہے۔ ہمارے نفس کا تزکیہ کرتا اور ہمیں علم وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ فرائض خداوندی کی ترسیل تو نبوت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، مگر انسانوں کے پراگندہ قلوب کے تصفیہ اور علم وحکمت کی تعلیم کے لیے علما نے نبوت کی اس وراثت کو سنبھالا اور ان کے اظہار وتعلیم کے لیے مختلف علوم وفنون کی تدوین کی ترتیب دی۔ نفسانی اختلال کے تزکیہ کے دوسری صدی ہجری کے وسط میں علم تصوف کی تدوین کا آغاز ہوا اور تصوف کے مراکز یعنی خانقاہیں وجود میں آئیں۔

قرن اول سے پہلے دوسرے علوم وفنون کی طرح تصوف اور خانقاہوں کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ مرشد اعظم کی بارگاہ کے ہم نشینوں کے باطن صاف وشفاف تھے ان کا تزکیہ اور تصفیہ خود ہادیٔ برحق نے کیا تھا۔ مگر اس عہد میمون کے گزر جانے کے بعد جب نفوس بگڑنے لگے تو اس کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس ضرورت کی تکمیل کے لیے جو اٹھے وہ صوفی کہلائے۔ انھوں نے صالح معاشرے کی تعمیر وتشکیل کے لیے دو اقدام کیے:

۱۔ معاشرے میں پھیلی بے عملی، مجبوری، انفعالیت، جہل، رجعت، غفلت اور پستی کا خاتمہ کیا۔

۲۔ اور پھر ضرورت ہوئی تو مجاہدہ ومراقبہ کے ذریعہ انسانوں کے ذہنی وفکری اختلال کو دور کر کے ان کے باطن کی صفائی کی اور اعلیٰ اسلامی قدروں اور اخلاق حسنہ کی تعلیم دی۔

اسلامی معاشرہ میں برپا معاشرتی انقلاب کی داستان کا مطالعہ کریں یا پھر کسی بھی بڑے صوفی اور ولی کامل کی حیات کے ابتدائی ادوار کا مشاہدہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ انھیں پہلے ظاہر علوم دیے گئے ان میں پہلے جہل، بے عملی، غفلت اور پستی کا خاتمہ کیا گیا اور اصل انسانی کمال کے حصول کے لیے تزکیہ، مراقبہ، مجاہدہ، اذکار واوراد اور روحانی تربیت کے ذریعہ انھیں اسلام کے سانچے میں ڈھلنے کی تربیت دی گئی اور پھر کچھ ہی دنوں میں اس تربیت نے ان کی دنیا بدل دی اور احکام الٰہیہ اُن کے لیے فطرت ثانی بن گئی اور ان میں جب دینی پختگی اور مذہبی تصلب کے آثار نمایاں ہوئے تب انھیں خلق خدا کی رشد وہدایت کے لیے کسی جگہ معین کر دیا گیا۔

صالح معاشرے کی تعمیر میں خانقاہوں کے اثرات

قرن اول کے بعد اہل تصوف کی ہی وہ جماعت رہی ہے جس نے صالح معاشرے کی تعمیر میں ہر محاذ پر کام کیا اور جب جس وقت جیسی ضرورت ہوئی۔

حالات کے تقاضے کو سامنے رکھ کر مؤثر اقدام کیا۔ انھیں رہبانیت کا طعنہ دینے والے اپنی آنکھیں مَل مَل کر اسلام کی عملی فکری اور سیاسی داستانوں کا مطالعہ کریں، جہاں وہ مادیت کے حرص سے اپنے نفس کو محفوظ کر کے عزلت گزیں ہوئے وہیں جب ضرورت پڑی تو تاریک بام و در کو علم و معرفت سے روشن کر دیا۔ کبھی ایمان و یقین کی تلوار سے کفر کے صنم کدوں کو تہ و بالا کیا تو کبھی مغربی طاقتوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف آوازیں بلند کر کے دار و رسن کو چوما، کبھی اسلامی نظریات کی تبلیغ کے لیے دشت و کہسار میں گھوڑے دوڑا دیے صرف ہندوستان میں ہی اگر ہم نو صدیوں پر پھیلی اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ جن سلاطین کی شجاعت کے ہم گن گاتے ہیں ان میں سے اکثر کسی نہ کسی خانقاہ کی صحبت یافتہ تھے۔ غزنوی سے غوری تک اور ایبک سے التمش اور اورنگ زیب عالمگیر تک صوفیا اور اولیاء کرام کے فیض یافتہ تھے۔ اور ان کی کامرانی اور شجاعت کا محرک کوئی اور نہیں یہی صوفیا کی جماعت تھی۔

قسطنطنیہ کی فتح اسلامی فتوحات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس عظیم الشان جہاد کے لیے سلطان محمد فاتح کو آمادہ کرنے کے لیے ان کے شیخ حضرت شمس الدین کی جد و جہد اور ترغیب ہی بنیادی محرک تھی۔ ہلاکو کا بیٹا تگودار خان نے اگر اسلام کے دامن میں پناہ لی تو یہ خراسان کے ایک صوفیٔ کامل کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ہلاکو کا عم زاد برکہ خان اگر اپنی پیشانی کو رب تعالےٰ کی بارگاہ میں جھکا دیا تو یہ صوفی شمس الدین باخوری کی جد و جہد کا ثمرہ تھا۔

حضرت داتا گنج بخش ہجویری اپنے مرشد شیخ ابو الفضل بن حسن کے حکم سے ہی غزنوی کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور یہاں پھیلی ہوئی بت پرستی، بد عقیدگی، حیلہ سازی اور شعبدہ بازی کا جڑ سے خاتمہ کر کے پورے خطہ کو علم و معرفت کے نور سے آباد کر دیا حضرت فرید الدین گنج شکر نے اپنے شیخ کے اشارہ پہ ہی پاک پٹن میں اقامت گزیں ہوے اور وہاں جہالت و بربریت میں ڈوبے لوگوں کو علم و معرفت کی روشنی عطا کی اور جنگلی قبائل کو اسلام کے سانچے میں ڈھال دیا۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر اس عظیم خطے کو شیخ نے نورِ اسلام سے منور نہ کیا ہوتا تو مملکتِ خداداد کے قیام کا تصور بھی ذہنوں میں نہ آتا۔

حضرت خواجہ خواجگان غریب نواز نے ابتداء میں اپنے مرشد کی خانقاہ میں خلوت و عزلت کی زندگی گزاری مگر جب سلوک کی منزلیں طے کر لیں تو راجپوتانہ کی مرکزی ریاست اجمیر کو اپنی رشد و ہدایت کا مرکز بنایا اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوے کفر و الحاد کے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ ہندوستان میں اسلام کا استحکام ان کے قدمِ نازکی برکتوں اور سعیٔ پیہم کا رہین منت ہے۔

اکبر کے عہدِ حکومت میں الحادی قوتوں سے جو شخص نبرد آزما ہوا وہ کوئی اور نہیں بلکہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی خانقاہ کا تربیت یافتہ تھا۔ جسے دنیا نے شیخ احمد سرہندی اور مجددّ الف ثانی کے نام سے یاد کیا۔ جن کی جد و جہد کو نظر انداز کر کے اسلامیانِ ہند کی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ ہماری تاریخ تو یہ کہتی ہے کہ اگر ہندوستان میں مرکز و ریاست میں ملوکانہ نظام نے ان کے قدموں میں

زنجیریں نہ ڈالی ہوتیں تو آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔

ایک ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں صفحات پر مشتمل بلادِ اسلامیہ کی تاریخ کے نشیب و فراز کو نگاہوں میں رکھا جائے تو عقل یہ قبول کرنے میں قطعی تامل نہیں کرے گی کہ مختلف عہد میں اسلامی معاشرے میں جتنے بھی انقلابات آئے وہ صوفیاء کے جدوجہدِ مسلسل کا نتیجہ تھا۔ اسلام و مغرب کی کشمکش کے آخری ادوار کو اگر ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی استعمار و نو آبادیوں کے خلاف جہاد کی بیشتر مہمات کی قیادت بھی صوفیاء ہی نے کی۔ امیر عبدالقادر جزائری جو اپنے وقت کے ایک عظیم صوفی بھی تھے سترہ سال تک فرانسیسی حملہ آوروں سے نبرد آزما رہے اور دمشق میں جلاوطنی کی زندگی گزار کر وہیں انتقال فرما گئے۔ اور پھر چیچنیا اور اس کے متصل خطوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر سے روسی آمر اسٹالین کے عہد تک مسلمانوں نے جہاد و ایثار کی جو تحریک چلائی اس کی قیادت بھی سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ شیخ غازی محمد، شیخ حمزہ اور شیخ شامل نے کی۔

تاریخِ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا۔ بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوّف یا صوفیاء کا اندازِ فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا اور اسے اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور علمی نظام پہ بار بار زوال آئے اور ان کی فکری قوتیں بکھر کر رہ گئیں مگر ان صوفیاء کا یہی اندازِ فکر تھا جس کی بدولت وہ قرنِ اول سے آج تک دلوں پر حکومت کرتے رہے اور ان کے روحانی نظام پر کبھی زوال کا سایہ نہ پڑ سکا۔

معاشرے میں تصوّف اور ان کے روحانی مراکز کی اسی دائمی اثر پذیری کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر خلیق نظامی نے لکھا ہے:

''یورپ کے مستشرقین جب اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کر سکا بلکہ بقول پروفیسر ہٹی اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبِ اسلام نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔'' ہالینڈ کے ایک فاضل لوکے کارونے دبے انداز میں اس بات پر استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ، گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

آج بیشتر خانقاہیں اپنے اصول اور بنیادی مقاصد سے منحرف ہو گئی ہیں۔ لیکن آج بھی بنام روحانیت معاشرے میں انہی کا سکۂ رائج الوقت ہے۔ آج بھی خلقِ خدا ان کی یک جنبشِ نگاہ کی پابند ہے۔ اس لیے خانقاہی نظام زوال کے اس عہد میں بھی وہ ہر طبقے سے زیادہ قوم پر اپنا اثر رکھتی ہیں جس کو ہر حساس ذہن محسوس کرتا ہے۔ اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ملّتِ اسلامیہ کا نقشہ آنِ واحد میں بدل سکتا ہے۔ ان کا یہ یقین غلط بھی نہیں۔ کیوں کہ تاریخ گواہ ہے کہ خلقِ خدا سے تعذیریہ کا خوف جو کام نہ کرا سکا وہ ان کی نگاہ

لطف وکرم نے انجام دیے دیا اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے ماضی قریب کے جید عالم دین اور صاحب فکر وقلم حضرت علامہ ارشد القادری نے اپنے ایک مکتوب میں کہا تھا:

"اہل سنت کے مذہبی مستقبل کی کوئی فکر اگر آپ کو بے چین کرتی ہو تو میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کی بجائے اپنے مراکز کے آسودہ حال مسند نشینوں کی رگوں پر نشتر چلائیے۔ وہ جاگ اٹھے تو قبرستان کے مردے بھی جاگ اٹھیں گے۔ لوگ انھیں کی زبان سمجھتے ہیں۔ عقیدت مندوں کی دنیا میں میری اجنبی زبان کو کون سمجھے گا۔" (ماہنامہ امیر اہل سنت")

اہل تصوف اور خانقاہوں کے دو بنیادی اصول تھے جن کی پاسداری کرتے ہوئے انھوں نے ایک جہان کی بگڑی ہوئی تقدیروں کو سنوارا تھا۔ پہلے معاشرہ میں علم ومعرفت کی روشنی پھیلائی، جہالت کا خاتمہ کیا، کردار سازی کی، انھیں غفلتوں کی نیند سے بیدار کیا اور پھر اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل بنانے کے لیے مراقبہ ومجاہدہ اور اذکار وظائف کے ذریعہ ان کے باطن کی صفائی کی۔

برسوں جمود اور تعطل کے دور سے گزرنے کے بعد پچھلے تین سو سال سے اہل سنت میں جو علمی وفکری انقلاب کی آہٹ محسوس کی جارہی ہے وہ ہندوستان کی چند مرکزی خانقاہوں کی یکے بعد دیگرے بیداری اور پشت پناہی کا ہی نتیجہ ہے۔ ان میں خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ، خانقاہ عالیہ رضویہ بریلی شریف، خانقاہ اقطاب ویلور، خانقاہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ، خانقاہ عالیہ قادریہ بدایوں شریف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کسی بھی خاص معاشرہ میں علمی وفکری انقلاب برپا کرنے کے لیے تین چیزیں نہایت اہم اور بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ پہلی صلاحیت، دوسری وسائل اور تیسری قوت ارادی۔ جو لوگ جماعت کی تقدیریں فلک پر لکھنا چاہتے ہیں ان کے پاس صلاحیت اور قوت ارادی تو ہوتی ہے مگر وسائل نہیں اور خانقاہوں کے پاس صلاحیت، وسائل ہے لیکن قوت ارادی اور ذوق یقین وعمل نہیں۔

ذوق عمل ہو تو فرسودہ زنجیریں خود کٹ جاتی ہیں اور یقین کی ایڑیوں سے زم زم کا چشمہ ابل جاتا ہے۔ چند خانقاہوں کی بیداری سے جب معاشرے کے رویے میں یوں تبدیلی آسکتی ہے تو برصغیر کی اکثر خانقاہیں اگر اپنی پارینہ روایات کو دہرانے کا عزم کرلیں تو ملت کو عروج وارتقاء کے آفاق کا سفر طے کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ ●●

وما علینا الا البلاغ

شخصیات واعمال سے استعانت واستمداد

مولوی سید احمد لطیفی تنجاوری

قرآنِ کریم میں ہے : وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ۝ (المائدة:۲) اور نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ کی زیادتی پر باہم مدد نہ کرو۔

قرآن کریم میں ہے: استعینوا بالصبر والصلوة ۝ (البقرة:۴۵) اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔

قرآنِ کریم میں ہے: فاعینونی بقوة ۝ (الکهف:۹۵) تو میری مدد طاقت سے کرو۔

احادیث مبارکہ ملاحظہ ہوں: اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه ۔ (صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مسندِ احمد) اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد میں ہے جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا لا نستعین بمشرك (ابن ماجہ) ہم مشرکین سے استعانت نہیں کرتے۔

استعینوا بالغدوة والروحة وشئ من الدلجة (بخاری، بیہقی) صبح اور شام اور رات کے پچھلے پہر کے کچھ حصے میں عبادت وخیرات سے مدد حاصل کرو۔

استعینوا بطعام لسحر علی صیام النهار وبالقیلولة علی قیام اللیل (ابن ماجہ) سحری کے کھانے سے دن کے روزے پر اور قیلولہ سے رات جاگ کر قیام (عبادت) پر مدد چاہو۔

استعن بیمینك علی حفظك (ترمذی) اپنے دائیں ہاتھ کے ذریعہ اپنی حفاظت پر مدد چاہو۔

استعینوا علی الرزق بالصدقۃ۔ (کنز العمال) مدد چاہو رزق پر صدقے سے۔

استعینوا علی النساء بالعری فان احداھن اذا کثرت ثیابھا واحسنت زینتھا اعجبھا الخروج۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: کنز العمال) مدد چاہو عورتوں پر بقدر ضرورت لباس کے ذریعہ ورنہ جب ان کے کپڑے زیادہ ہوں گے تو وہ ان کپڑوں سے خود آراستہ کر کے گھر سے باہر نکلنا چاہیں گی (تاکہ اپنی زینت دوسروں کو دکھائیں۔)

استعینوا علی انجاح الحوائج بالکتمان۔ (طبرانی معجم کبیر: کنز العمال) حاجتوں کو پوشیدہ رکھ کر ان کی کامیابی پر مدد چاہو۔

اطلبوا الحوائج الی ذوی الرحمۃ من امتی ترزقوا وتنجحوا، الخ (کنز العمال) حاجت براری چاہو میرے رحم والے امتیوں سے، رزق پاؤ گے اور کامیاب ہو گے۔

اطلبوا الفضل عند رحماء من امتی تعیشوا فی اکنافھم فان فیھم رحمتی۔ (کنز العمال) فضل مانگو میری امت کے رحماء (مہربانوں) سے، ان کے دامنِ قرب میں مزے سے رہو گے کیوں کہ میری رحمت اُن کے پاس ہے۔

اطلبوا المعروف من رحماء امتی تعیشوا فی اکنافھم (مستدرک) بھلائی مانگو میری امت کے رحماء سے ان کی حفاظت میں مزے کرو گے۔

اطلبوا الخیر عند حسان الوجوہ۔ (طبرانی معجم کبیر) بھلائی مانگو اچھے چہرے والوں سے۔

اطلبوا الحاجات عند حسان الوجوہ۔ (میزان الاعتدال) اچھے چہرے والوں سے حاجات طلب کرو۔

اذا طلبتم الحاجات فاطلبوا ھا الی الحسان۔ (اتحاف السادۃ للزبیدی) جب تم حاجتیں طلب کرو تو خوش چہرے والوں سے کرو۔

التمسوا الخیر عند احسان الوجوہ۔ (کنز الاعمال، ابن عساکر) التماس خیر خوب صورت لوگوں سے کرو۔

ابتغوا الخیر عند حسان الوجوہ۔ (کنز الاعمال) بھلائی خوش چہروں کے پاس چاہو۔

اذا اضل احدکم شیئا واراد عونا وھو بارض لیس بھا انیس فلیقل: یا عباد اللہ اعینونی، یا عباد اللہ اعینونی فان للہ عباد الایراھم۔ (طبرانی، معجم کبیر، کنز الاعمال) جب تم میں سے کسی کی

کوئی چیز گم ہو جائے (یا راہ بھولے) اور مدد چاہے اور وہ ایسی جگہ ہو جہاں کوئی ہمدم نہیں تو یوں پکارے: اے اللہ کے بندو میری مدد کرو، اے اللہ کے بندو میری مدد کرو،

اے اللہ کے بندو میری مدد کرو، کیوں کہ اللہ کے کچھ بندے ہیں جنھیں یہ نہیں دیکھتا۔

ان اللہ تعالیٰ یقول: اطلبوا الفضول من الرحماء من عبادی تعیشون فی اکنافھم (مسند عقیلی)

بے شک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، میرے رحم دل بندوں سے فضل مانگو ان کی پناہ میں چین سے رہو گے۔

اطلبو الخیر والحوائج من حسان الوجوہ۔ (طبرانی، معجم کبیر) نیکی اور حاجتیں خوب صورتوں سے مانگو۔

حضرت شیخ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے نماز مغرب یا عشاء کی نماز میں امامت فرمائی (جب سورہ فاتحہ کی قرأت و تلاوت فرماتے ہوئے اس آیت) ایاك نعبد و ایاك نستعین کو پڑھا، بے ہوش ہو کر گر پڑے جب ہوش میں آئے تو لوگوں نے کہا: اے شیخ آپ کو کیا ہو گیا؟ (حضرت شیخ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب میں نے ایاك نستعین کہا تو مجھے خوف ہوا کہ (کہیں) مجھ سے یہ نہ کہا جائے کہ اے جھوٹے! پھر طبیب سے دوا کیوں لیتا ہے؟ اور امیر سے روزی اور بادشاہ سے مدد کیوں مانگتا ہے؟ اسی لیے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کو اپنے پروردگار سے شرم کرنی چاہیے کہ روزانہ پانچ وقت اس (پروردگار) کے سامنے کھڑا ہو کر جھوٹ بولتا ہے، مگر یہاں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ غیر اللہ سے اس طرح مدد مانگنا کہ اسی غیر ہی پر بھروسہ ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر نہ جانا جائے (تو یہ) حرام ہے اور اگر توجہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے اور اس (غیر) کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے کارخانہ اسباب پر نظر کرتے ہوئے ظاہری طور پر غیر سے مدد مانگتا ہے تو ایسا کرنا عرفان سے دُور نہیں اور شریعت میں بھی جائز اور درست ہے اور نبیوں اور ولیوں نے ایسی مدد کی ہے اور حقیقت میں یہ مدد غیر اللہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے (ہرگز غیر سے نہیں)۔ (تفسیر فتح العزیز)

مزید ملاحظہ ہو:

"ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطۂ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ استعانت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔" (حاشیہ قرآن، ص ۲: جناب شبیر احمد عثمانی، مطبوعہ سعودیہ)

جناب اشرف علی تھانوی کا فتویٰ ملاحظہ ہو: "جون وال غریبہ در احکام اقسام استعانت بالمخلوق:

سوال: طریقہ اربعین یعنی چلہ میں حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب ضیاء القلوب صفحہ ۵۵ میں تحریر فرماتے

فرماتے ہیں: استعانت و امداد از ارواح مشائخ طریقت بواسطہ مرشدہ خود کردہ الخ، استعانت و استمداد کے الفاظ ذرا کھٹکتے ہیں۔ غیر اللہ سے استعانت و امداد بطریق جائز کس طرح کرتے ہیں؛ خالی الذہن ہونے کی تاویل و توجیہ جی کو نہیں لگتی ایسی بات ارشاد ہو جس سے قلب کو تشویش نہ رہے۔

الجواب: (۱) جو استعانت و استمداد بالمخلوق باعتقادِ علم و قدرت مستقل ہو مگر وہ علم و قدرت کسی دلیل صحیح سے ثابت نہ ہو معصیت ہے۔ (۲) اور جو باعتقاد علم و قدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم و قدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائز ہے۔ خواہ وہ مستمد منہ حی ہو یا میت۔ (۳) اور جو استمداد بلا اعتقاد و قدرت ہو نہ مستقل پس اگر طریق استمداد مفید ہو تب بھی جائز ہے جیسے استمداد بالنار و الماء و الواقعات التاریخیہ (۴) ورنہ لغو ہے۔ یہ کل پانچ قسمیں ہیں۔"

(بوادر النوادر صفحہ ۸۲۔۸۳: مطبوعہ ادارۂ اسلامیات لاہور، فتاویٰ امدادیہ صفحہ ۹۹۔۱۰۰: ج ۴: مطبوعہ تھانہ بھون)

یہ بھی ملاحظہ ہو: "وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے امداد کے مسئلہ میں علماء دیو بند کا خیال بھی وہی ہے، جو عام اہلِ سنت و جماعت کا ہے۔ آخر جب کہ ملائکہ جیسی روحانی ہستیوں سے خود قرآن ہی میں ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی امداد کراتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ واقعہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تخفیف صلوٰۃ (نماز وں کی تعداد کم کروانے) کے مسئلہ میں امداد ملی اور دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں، بشارتیں ملیں۔ تو اس قسم کی ارواحِ طیبہ سے کسی مصیبت زدہ مومن کی امداد کا کام قدرت اگر لے تو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے تردید ہوتی ہے؟ اور سچ تو یہ کہ آدمی کو عام طور پر جو امداد بھی مل رہی ہے، حق تعالیٰ اپنی مخلوقات ہی سے تو یہ امدادیں پہنچا رہے ہیں۔" (سوانح قاسمی: صفحہ ۲۳۲/۱: از جناب مناظر احسن گیلانی: مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

اس موضوع پر "مزارات و تبرکات اور ان کے فیوضات" میں متعدد اقتباس علمائے دیو بند کی تحریروں سے پیش کئے ہیں۔ "حقائق" اور "سفید و سیاہ" میں اس حوالہ سے تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں وہ تمام عبارات نقل کروں تو نصف ضخامت بھی ناکافی رہے۔ کچھ اشعار ضرور نقل کر رہا ہوں، ملاحظہ ہوں:

حضرت سیدنا امام زین العابدین اوسط رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ؎

یا رحمة للعالمین ادرک لزین العابدین　　　محبوس ایدالظالمین فی موکب المزدحم

(اے تمام جہانوں کے لیے رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) زین العابدین کی مدد کو آئیے، اس ازدحام میں وہ ظالموں کے ہاتھ میں قید ہے۔)

حضرت سیدنا امام ابو حنیفہ بن ثابت کوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ؎

یا اکرم الثقلین یا کنز الوریٰ ! جدلی بجودک وارضنی برضاک

انا طامع بالجود منک ولم یکن لابی حنیفۃ فی الانام سواک

(مجموعۃ القصائد: صفحہ ۴۲: مطبوعہ مجتبائی، دہلی)

اے مخلوقات میں سب سے زیادہ عزت والے، اے (اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے) مخزن، اپنے جود وسخا سے میرے لیے بھی عطا فرمایئے اور اپنی رضا اور خوشنودی سے مجھے بھی اپنی رضا عطا کیجیے۔ میں آپ سے جود وسخا کی طمع رکھنے والا ہوں اور آپ کے سوا تمام مخلوق میں ابو حنیفہ کو کوئی نوازنے والا نہیں۔

حضرت ابوالحسن امام شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے قصیدہ بردہ شریف میں فرماتے ہیں: ؎

یا اکرم الخلق مالی من الوذ بہ سواک عند حلول الحادث العمم

اے مخلوق میں سب سے زیادہ عزت وکرم والے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے سوا میرے لیے کوئی نہیں کہ جس سے مصیبت کے وقت مدد کی التجا کروں۔

عاشقِ رسول حضرت مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ السامی فرماتے ہیں: ؎

ز مہجوری برآمد جانِ عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم

نہ آخر رحمۃ للعٰلمین ز مہجوراں چرا فارغ نشینی (زلیخا)

حضرت شمس العارفین شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

یا رسول اللہ حبیب خالق یکتا توئی ! برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی

یا رسول اللہ تو دانی امتانت عاجز اند عاجزاں را رہ نما وجملہ را ماوٰی توئی !

(یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم خالق کے حبیب یکتا اور ذوالجلال رب تعالیٰ کے لاثانی برگزیدہ آپ ہی ہیں، آپ جانتے ہیں کہ آپ کی امت عاجز ہے۔ ان عاجزوں کے رہ نما اور سب کو پناہ دینے والے بھی آپ ہی ہیں۔)

شیخ محقق حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

بہر صورت کہ باشد یا رسول اللہ کرم فرما بلطف خود سروساماں جمع بے سروپا

یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم ہر حال میں ہم پر کرم فرمایئے، ہم بے سروساماں ہیں، ہمارا سروسامان آپ کا لطف وکرم ہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: ؎

ویاخیر من یرجی لکشف رزیۃ　ومن جودہ فاق جود السحائب
وانت مجیر من ھجوم ملمۃ　اذا انشبت فی القلب شر المخالب

(اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم)

(اور اے وہ بہترین جس سے سختی و مصیبت دفع ہونے کی امید کی جاتی ہے اور جس کی سخاوت برسنے والے بادلوں سے بہت زیادہ ہے اور آپ سختی کے حملوں سے پناہ دینے والے ہیں جب کہ بدترین مصیبتیں آپڑیں۔)

جناب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ؎

شفیع عاصیاں تم ہو وسیلہ بے کساں تم ہو　تمہیں چھوڑ کر اب کدھر جاؤں بتاؤ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)
جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں　بس اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(گلزار معرفت)

دوسرے مقام پر یہی حاجی صاحب یوں عرض کرتے ہیں : ؎

یا محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) فریاد ہے　اے حبیب کبریا (صلی اللہ علیہ وسلم) فریاد ہے
سخت مشکل میں پھنسا ہوں آج کل　اے مرے مشکل کشا فریاد ہے

(مناجات نالۂ امداد غریب)

جناب محمد قاسم نانوتوی کہتے ہیں : ؎

کروڑوں جرموں کے آگے یہ نام کا اسلام　کرے گا یا نبی اللہ میرے پہ کیا پکار
مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا　نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

(قصائد قاسمی، صفحہ ۶)

جناب اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں : ؎

یا شفیع العباد خذ بیدی　انت فی الاضطرار معتمدی
لیس لی ملجاء سواک اغث　مسنی الضر سیدی وسندی
غشنی الدھر یا ابن عبد اللہ　کن مغیثا فانت لی مددی
یا رسول الالہ بابک لی　من غمام الغموم ملتحدی
لیتنی کنت ترب طیبتکم　فالتثمت النعال فاک قذی

اے بندوں کی شفاعت کرنے والے میری دستگیری فرمائیے۔ آپ ہر مشکل میں میری آخری امید اور سہارا ہیں۔ آپ کے سوا مجھے کوئی پناہ دینے والا نہیں، میرے سردار میرے آقا میری فریاد سنئے۔ میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ زمانے کی مصیبتوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ اے ابن عبداللہ میری فریاد سنئے میری مدد فرمائیے۔ ؎

میں ہوں بس اور آپ کا درِ یا رسولؐ ابرِ غم گھیرے نہ پھر مجھ کو کبھی

کاش ہو جاتا میں کی خاک نعل بوسی ہوتی کافی آپ کی

(نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ دار الاشاعت، دیوبند)

نواب صدیق حسن خان بھوپالی قصیدۃ العنبریہ میں فرماتے ہیں: ؎

یاسیدی یا عروتی ووسیلتی یا عدتی فی شدۃ ورخاء

یامقصدی یااسوتی ومعاضدی وذریعتی یا مرصدی مولائی

شفعت جاھك ضارعا متذللا مالی وراءك صارف الضراء

انت المغیث برحمة وکرامة فی غمة وغوایل و بلاء

انجع سرالی یاکریم کرائم انت القدیر علی نفاد رجائی

مالی ورائك مستغاث فارحمن یا رحمة للعالمین بکائی

اے میرے سردار، اے میرے سہارے اور اے میرے وسیلے۔ اے میرے سختی و نرمی کی حالت سازوسامان۔ اے میرے مقصد، اے میرے پیشوا اور میرے پروردگار اور میرے ذریعہ اور اے میرے ٹھکانے، میرے مولا، میں نے نہایت عاجزی و انکساری سے آپ کی عزت وجاہ کو شفیع بنایا کیوں کہ میرے لیے آپ کے سوا تکلیف و مصیبت کو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ آپ مددگار ہیں اپنی رحمت و کرامت کے ساتھ ہر سختی اور مشکلات و بلا میں۔ میرے مقاصد پورے فرماؤ، اے بزرگیوں اور کرامتوں والے آپ میری امید کے پورا کرنے پر قادر ہیں۔ آپ کے علاوہ میرا کوئی فریادرس نہیں۔ اے رحمۃ للعالمین، میری گریہ وزاری کو دیکھو اور مجھ پر رحم کرو۔ (مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والاجاہی: ص ۳۰، ۳۱/۲)

جناب اشرف علی تھانوی اپنے استاذ مرشد کو یوں لکھتے ہیں: ؎

یا مرشدی یا مولائی یا مفزئی یا ملجائی فی مبدئی ومعادی

ارحم علی یا غیاث فلیس لی کھفی سوی حبیکم من زاد

فازالانام بکم وانی ھاشم ‏ فانظرالی برحمۃ یاھاد

یاسیدی للہ شیاانہ ‏ انتم لی المجدی وانی جاری

میرے مرشد میرے مولا مری وحشت کے انیس ‏ میری دنیا کے مرے دین کے لے جائے پناہ

میرے فریاد سا مجھ پہ ترس کھاؤ کہ ہیں ‏ آپ کی حب کے سوا رکھتا نہیں توشۂ راہ

خلق فائز ہو شہا آپ سے اور میں حیران ‏ رحم کے ہادی من اب تو ادھر کو بھی نگاہ

میرے سردار خدا واسطے کچھ تو دیجیے ! ‏ آپ معطی ہیں مرے میں ہوں سوالی الی اللہ

(تذکرہ الرشید: صفحہ ۱۱۴ : ج 1)

مذکورہ بالا آیات واحادیث اور کچھ عبارات واشعار میں استمداد و استعانت کا واضح ثبوت پیش کر کے معلوم کرنا چاہتا ہوں لفظ "یا" کے استعمال کو شرک کہنے والے اپنے ان علمائے وہابیہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ "یا شیخ سید عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کہنے والے سنی کو مشرک کہا جائے اور جناب اشرف علی تھانوی کو "یا سید للہ شیئاً انہ" کہنے پر بھی موحد مانا جائے۔ اس موضوع پر بہت تفصیل ابھی باقی ہے، تاہم امید کرتا ہوں کہ لفظ "یا" کے استعمال کو غلط قرار دینے والے اور استمداد و استعانت کو شرک بتانے والے اس قدر تفصیل کے مطالعہ کے بعد اپنے غلط موقف سے رجوع کرلیں گے!؟ ▲▲

درس حدیث

"...... حضرت عائشہؓ آپ کے اچھے سلوک اور برتاؤ کا حال اس طرح سناتی ہیں کہ آپ نے کبھی کسی غلام کسی عورت، کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا اور جب بھی گھر میں داخل ہوتے اور مسکراتے ہوئے داخل ہوتے ......" (ترمذی)

"فجر کی نماز فرشتوں کے جمع ہونے کا وقت ہے، اور اس وقت رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں"۔

حافظ جیلانی باشاہ لطیفی　　بلہاری

رسالت کی ضرورت

جب اللہ کو آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرماں برداری والی زندگی گزاریں، تو ہم اس کے محتاج ہو گئے کہ کس طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کے احکام ہمارے لیے کیا ہیں؟ اور اس کی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہے اور کن کاموں اور کن باتوں کی ممانعت ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر انسان کو براہ راست یہ باتیں بتلاتا نہیں اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسانوں کو ملی ہوی ہے وہ اس دنیا کی روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے تو کسی حد تک کافی ہے لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں بالکل نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور وہ کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہے۔ پس ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا

یعنی اللہ تعالےٰ جس طرح ہماری ضرورت کے لیے سورج پیدا فرمایا، جس سے ہم گرمی اور روشنی حاصل کرتے ہیں اور جس طرح اس نے ہمارے لیے غذا کی پیداوار کا نظام قائم فرمایا یعنے طے فرمایا کہ اپنے خاص اور منتخب نمائندہ کے ذریعہ نبوت و شریعت درحقیقت خود ہماری ضرورت ہے اور اللہ تعالےٰ کی صفت رحمت و ربوبیت کا تقاضا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ سورج، ہوا، پانی وغیرہ ہماری ضرورتیں ہیں اور اللہ کی رحمت و ربوبیت نے ہماری ضرورت کے لیے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ پس وہ لوگ بڑے جاہل اور حقیقت ناشناس ہیں جو دین اور شریعت کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بوجھ ہے جو اللہ کی طرف سے انسانوں پر لاد دیا گیا ہے۔ اور اس کا تعلق اللہ کی بس صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہے۔ بہرحال نبوت اور شریعت ہماری ضرورت ہے اور اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کیوں کہ بندے اسی کے راستے سے اللہ کے رضا کے مقام تک اور جنت تک پہنچیں گے۔

رسول کون ہونا چاہیے

اب ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نبی کون ہونا چاہیے؟ اس بارے میں بعض قوموں کو بڑے مغالطے ہیں۔ بعضوں نے تو کہا ہے کہ خود خدا کسی روپ میں آکر انسانوں کو اپنا قانون بتاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ اپنی رعیت کے پاس اپنا حکم نامہ بھیجنا چاہتا ہے اور خود ہی پوسٹ مین کی وردی پہن کر اور

اس کا روپ بھر کر اپنا حکم نامہ گھر گھر بانٹتا پھرتا ہے۔ ایسی مہمل اور غلط بات ان لوگوں نے کہی اور ان ہی لوگوں نے قبول کی جنھوں نے خدا کی شان کو بالکل نہیں سمجھا: سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○

نبی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہی ہو سکتا ہے

اور بعضوں نے خیال کیا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور سراپا نورانی مخلوق ہے۔ لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لیے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا کام اسے کرنا ہے وہ ان کے رجحانات ان کے مزاج اور ان کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو۔ اور فرشتے بے شک مقدس اور نورانی ہیں لیکن انسانی جذبات اور احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بے چارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصہ، حسد، نفسانی شہوت چیزوں کی حقیقت کو فرشتے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہیں جب انسان ان سے گزرتا ہے۔ مثلاً جس شخص میں شہوت کا مادّہ ہی نہ ہو یعنی فطرتاً اس سے خالی ہو، وہ شہوت کی حقیقت کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا۔ اسی طرح جس شخص نے کبھی سوتے میں خواب نہ دیکھا ہو اس کو ہزار سمجھایا جائے وہ خواب کی اصل حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا اور ایک شہوت یا خواب ہی پر منحصر نہیں اکثر انسانی احساسات کا حال یہی ہے۔ جس نے کبھی آم نہیں چکھا اس کو کسی طرح آم کا ذائقہ نہیں سمجھایا جا سکتا۔ مادرزاد اندھے کو گلاب کے پھول کی رنگت اور اس کی حسین صورت دو گھنٹے کی تقریر سے بھی نہیں سمجھائی جا سکتی

بہرحال انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات اور احساسات سے پوری طرح واقف ہو اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے اللہ تعالےٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں ہی میں سے بھیجے۔ اور جو بے وقوف اور احمق یہ کہتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے، قرآن مجید میں ان سے کہا گیا کہ: وَقُلْ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○ (بنی اسرائیل)

اس کا مطلب یہی ہے کہ نبی اور رسول اسی جنس میں سے ہونا چاہیے جن کی طرف اور جن کی ہدایت کے لیے وہ بھیجا جائے۔ تو زمین اگر بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے اور رسول ان کی ہدایت کے لیے بھیجنا ہوتا تو ہم کسی فرشتے ہی کو نبی بنا کر بھیجتے۔ لیکن جب زمین مستقل آبادی انسانوں ہی کی ہے اور ان ہی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نبی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت تو انسان ہی سے پوری ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ وہی انسانوں کے مسائل اور ان کے احوال اور ان کے طبعی تقاضوں کو اچھی طرح

سمجھ سکتا ہے :

نبی اگر خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ ہو تو نبوت کا مقصد ہی فوت ہو جانا

اس کے علاوہ اگر نبی کو انسان نہ مانا جائے بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ سمجھا جائے تو نبوت و رسالت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ پھر نبی اور رسول کی زندگی ان انسانوں کے لیے نمونہ اور مثال نہیں بن سکتی۔ جن کی ہدایت اور رہ نمائی کے لیے وہ بھیجا گیا ہے۔ انسان کسی انسان کی پیروی اور نقل تو کر سکتا ہے اور اس سے اس کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن خدا کی یا فرشتے کی نقل کرنا اس بے چارے کے بس کی بات نہیں اور نہ اُس سے اس کا مطالبہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

نبیوں کو خدا کا اوتار یا فرشتہ ماننے کے بعد ان کی زندگیوں میں کوئی کمال بھی نہیں رہتا۔

علاوہ ازیں نبیوں اور رسولوں کو خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ قرار دینے کے بعد ان کی زندگی میں کوئی خاص کمال بھی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر غور کیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر انسان مانا جائے تو ان کی زندگی ایک نہایت کامل اور بلند ترین انسان کی زندگی نظر آئے گی۔ جس میں ظلم کے مقابلہ میں صبر ہے، حلم ہے، زہد ہے، توکل ہے، علم و حکمت ہے۔ محبت و ہمدردی ہے، دل سوزی و غم خواری ہے اور اسی کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے عطا کیے ہوئے معجزات ہیں جو گویا ان کی سچائی کی سند اور نشانی ہیں۔ لیکن اگر ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ مانا جائے تو اس معیار سے ہماری عقل ان کی زندگی میں حسرت ناک نقائص اور کمزوریاں محسوس کرے گی پھر ان کا کھانا پینا، مریم کے پیٹ سے پیدا ہونا یہودیوں کا ان کو طرح طرح سے ستا سکنا اور ان کی بے انتہا توہین و تذلیل کرنا (اور انجیلوں کے بیان کے مطابق) ان کا سولی پر چڑھایا جانا یہ سب باتیں بجائے کمال کے نقائص نظر آئیں گے جن کی کوئی تعبیر بھی نہ کی سکے گی بلکہ پھر تو ان کے معجزات میں بھی کوئی ندرت اور خصوصیت نہیں رہے گی۔ کیوں کہ خدا کی قدرت تو ان معجزوں سے بھی بڑے بڑے نمونے دنیا کے اس کارخانہ میں ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔ الغرض اس مسئلہ میں یہ جو شخص کچھ بھی غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے آنے والے نبی اور رسول اُن ہی کی جنس سے ہونے چاہئیں اور نبیوں اور رسولوں کو خدا یا خدا کا اوتار یا فرشتہ قرار دینا ایک جاہلانہ اور احمقانہ گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں جابجا اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جتنے پیغمبر بھی اس دنیا میں بھیجے وہ سب انسان ہی تھے۔ ارشاد ہے قرآن مجید کا اعلان کہ سارے پیغمبر انسان ہی تھے۔

مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ ۝ (یوسف) اے رسول! ہم نے تم سے پہلے جو پیغمبر بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بار بار اسی کا اعلان کرایا کہ میں تو بس انسانوں میں سے ایک انسان ہوں، اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے:

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل) میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں اور اللہ کا پیغمبر۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۝ (الکھف: ع: ۱۲) آپ اعلان کر دیجیے کہ میں تو بس تم جیسا ایک انسان ہی ہوں۔

قرآن مجید نے اس مسئلہ کو اتنا روشن کیا ہے کہ سارے نبیوں کا انسان ہونا اور بشر ہونا مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہو گیا ہے۔ اسلامی عقائد کی کتابوں میں نبی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالےٰ اپنی ہدایت اور اپنا پیغام دے کر اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے اور پیغمبرانہ ذمہ داریاں اس کے سپرد کرتا ہے۔ یہاں تک کی گفتگو سے یہ ہو گیا کہ نبوت و رسالت ہماری زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبی اور رسول انسانوں ہی میں سے ہونا چاہیے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی عقیدہ اور قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے۔

دنیا میں انبیاء برابر آتے رہے ہیں اس کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالےٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اور جس نے انسان کے لیے وہ سب پیدا کی ہیں جن کی انسان کو اپنی زندگی ضرورت ہے اس نے انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کو بھی ہمیشہ پورا کیا ہے یعنی جب سے اس دنیا میں انسانوں کا سلسلہ شروع ہوا اسی وقت سے نبوت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اور ضرورت وقت کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف ممالک اور علاقوں میں اس کے پیغمبر آتے رہے ہیں۔ ہم تو یہ نہیں بتلا سکتے کہ کل کتنے پیغمبر آئے قرآن مجید میں ان کی تعداد نہیں بتلائی گئی اور نہ اس کی ضرورت تھی لیکن یہ صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ کوئی ملک اور مقام ایسا نہیں جہاں ہم نے رسول و پیغمبر نہ بھیجا ہو۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۝ (یونس: ع ۵) یعنی ہر قوم کے واسطے پیغمبر آئے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ (فاطر: ع ۳) یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس ہمارا رسول نہ پہنچا ہو ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ۝ (نحل: ع ۵) یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں۔

ان پیغمبروں میں سے چند خاص پیغمبروں کے نام اور ان کے کچھ احوال بھی قرآن مجید میں بیان فرمائے گئے ہیں اور باقیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا لیکن ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سب پر ایمان لائیں اور ان سب کو یکساں طور پر اللہ کے راستباز اور پاکباز بندے سمجھیں اور ان سب کا ادب کریں اس کے بغیر ہم مومن نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید میں ایمان والوں کا اصول اور عقیدہ یہ بیان کیا گیا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۝ (بقرہ: ۴۰) کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرتے بلکہ سب مانتے ہیں۔ غرض اس چیز سے اتنی بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ ہر ایک جماعت کا خطاب الگ الگ ہے اور مقصد بھی جدا گانہ اب فیصلہ لوگوں پر ہے خاتم النبیین حضور سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا جیسا بشر سمجھ کر (بقیہ صفحہ 205 پر).....
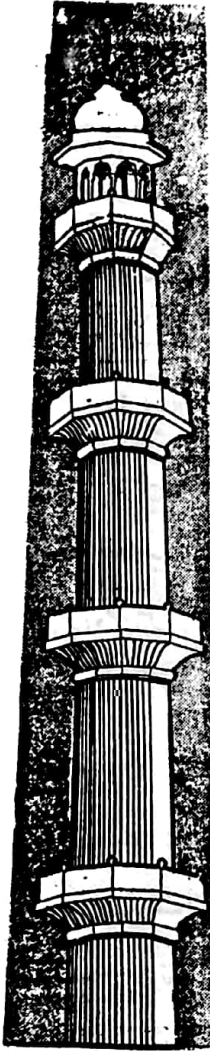
حافظ ای ۔ یم ۔ ڈی ۔ یچ ذاکر ۔ متعلم دارالعلوم لطیفیہ ۔ حضرت مکان ۔ ویلور گنتکل

"بیت المقدس کی بے شمار فضیلتیں ہیں" اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبروں سے اسی سرزمین کا وعدہ فرمایا ہے ۔ جیساکہ مندرجۂ ذیل قرآن مجید کی آیاتِ مقدسہ کے ترجمہ سے بخوبی واضح ہے ۔ ہم نے انھیں اور لوطؑ کو اسی سرزمین میں نجات دی ہے جو تمام دنیا والوں کے لیے میرے نزدیک بہت مبارک ہیں۔" اس جگہ مبارک سرزمین سے مراد بیت المقدس ہے ..

ایک دوسری آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوے ارشاد فرماتا ہے ۔" اور ہم نے تمہیں سرزمینِ طور کی داہنی جانب والی جگہ کی بشارت دی ہے ۔"

جغرافیائی اعتبار سے سرزمینِ طور کے دو حصے ہیں ۔ بائیں جانب والا حصہ مصر اور فلسطین کے درمیان واقع صحرائے سیناد کا علاقہ ہے اور داہنی طرف والا علاقہ سرزمین فلسطین کا وہ حصہ ہے جس میں بیت المقدس واقع ہے تیسری جگہ قرآن مجید کا ارشادِ مبارکہ ہے : ہم نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ مریمؑ کو دو گواہ قرار دیے ۔ پھر انھیں ایک ایسی جگہ عطا کردی جہاں وہ چین اور سکون کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں ۔ اسی جگہ پُرسکون جگہ سے مراد بیت المقدس ہے ۔ قرآنِ حکیم بیت المقدس کی فضیلت کا تذکرہ کرتے ہوے ارشاد فرماتا ہے : یعنی نہایت پاکیزہ ہے وہ پروردگار جس نے ایک رات میں اپنے محبوب بندے حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام یعنی مکّہ سے لے کر مسجد الاقصیٰ بیت المقدس کی سیر کرائی ۔" مسجد اقصیٰ سے مراد وہی سرزمین بیت المقدس ہے ۔ اس روایت میں منقول ہے کہ جو شخص بیت المقدس میں نماز ادا کیا' اس کی مثال ایسی ہے گویا اس نے آسمان پر نماز ادا کی ۔ کیوں کہ بیت المقدس آسمان سے بہت قریب ہے ۔ اور پروردگار عالم نے حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی سرزمین سے آسمان پر اٹھالیا ۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوے تو اللہ تعالیٰ نے آپؑ سے فرمایا : اے سلیمان (علیہ السلام) تم دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا ۔" حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاے اور عرض کیا : اے پالنے والے میری لغزشوں کو

معاف فرمادے۔ غیب سے آواز آئی: اے سلیمان میں نے تمہاری دعا قبول کرلی۔ اس کے بعد سلیمان علیہ السلام نے پروردگار عالم کی بارگاہِ عالیہ میں دعا کرتے ہوئے کہا: اے سارے جہانوں کے پالنے والے! جو شخص اس سرزمین میں تیری نماز ادا کرے اس کے بھی گناہ معاف فرمادے۔ پروردگار عالم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے پروردگار سے درخواست کی کہ جو شخص مریض یا محتاج اس سرزمین پر آکر اپنی حاجت طلب کرے، اے پالنے والے! تو اسے شفاء کاملہ عطا فرمادے اور اسے اتنا غنی کردے کہ پھر کسی کے آگے دستِ سوال نہ پھیلائے۔ پروردگار عالم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جو شخص ان تین مقدس مقامات کی زیارت کرے گا اُسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ایک میری مسجد یعنی مدینۂ منورہ، دوسری خانۂ کعبہ مکۂ معظمہ اور تیسری بیت المقدس۔ حضرت آدم علیہ السلام نے وصیت فرمائی کہ انھیں اسی سرزمین میں دفن کیا جائے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراھیم علیہ السلام اسی سرزمین میں دفن ہیں۔

پروردگار عالم نے حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزشوں کو اسی مقدس سرزمین پر معاف فرمایا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارہ میں لوگوں سے اسی جگہ پر کلام کیا تھا اور اپنی والدہ کے اشارہ پر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور قیامت کے دن لوگوں کو اسی جگہ سے جنّت و دوزخ کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ بیت المقدس کی بنیاد پیغمبروں نے رکھی تھی اور یہ لوگ اسی پاکیزہ زمین پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ کے پیغمبروں نے اس سرزمین پر نماز ادا کی ہے۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ سرزمین ہمیشہ ہی پیغمبروں کی عبادت گاہ رہی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک روز حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا: یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے پہلے کس مسجد کی تعمیر کی گئی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے مسجد الحرام یعنے خانۂ کعبہ کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ حضرت ابوذرؓ غفاری نے پھر دریافت فرمایا کہ اللہ کے رسولؐ دوسری مسجد کون سی ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: بیت المقدس، جس کی بنیاد خانۂ کعبہ کے تعمیر کے چالیس سال کے بعد رکھی گئی تھی۔

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص شوق و ذوق کے ساتھ بیت المقدس کی زیارت کا شرف حاصل کرے اس کی جگہ جنّت ہوگی۔ اور جو شخص اس مقدس سرزمین میں دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اس کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس کے دل میں ہمیشہ اللہ تعالےٰ کا خوف رہا کرتا ہے اور اس کی زبان پر ذکرِ الٰہی رہا کرتا ہے۔ جو شخص بیت المقدس میں محتاجوں کی مدد کرے گا وہ روزِ قیامت دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام اس مقدس گھر کے بانی اول ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد دشمنوں نے بیت المقدس کو بالکل ویران کر ڈالا اور ایک ایرانی بادشاہ نے اس کی دوبارہ تعمیر کرائی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں عجیب و غریب چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ ان میں ایک زنجیر بھی تھی جس کا ایک سرا مسجد کی چھت سے لگا ہوا تھا اور اس کا دوسرا سرا زمین پر لٹک رہا تھا۔ صرف پاکیزہ اور نیکوکار لوگوں کا ہاتھ ہی اس زنجیر تک پہنچ پاتا تھا اور ناپاک و گناہگار لوگ اس زنجیر کو نہیں چھو پاتے تھے۔ جب پاکیزہ اور نیکوکار لوگ اس زنجیر کو چھو لیتے تھے تو انھیں کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن اگر ناپاک اور گناہگار لوگ کسی طرح اسے چھو لیتے تو فوراً ان کا ہاتھ جل جاتا تھا۔ بیت المقدس روئے زمین پر دوسرے نمبر پہ ہے۔

مسجد بیت المقدس کے صحن میں ایک عالی شان عمارت ہے جس کے اوپر سونے کا بہت بڑا گنبد ہے اس شاندار عمارت کو مسجد صخرہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسجد کے وسط میں صخرہ پتھر آج بھی موجود ہے۔ اور جب شب معراج میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی جانب پرواز کرتے وقت اسی پتھر پر اپنا قدم مبارک رکھا تھا اور آپ کے قدم مبارک کا نشان اس پتھر پر آج بھی موجود ہیں۔ مسجد صخرہ سے باہر نکلنے کے لیے چار دروازے ہیں۔ مشرقی دروازے پر بہت خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے۔ اسے گنبد سلسلہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے گنبد بھی مسجد صخرہ میں موجود ہیں جنہیں گنبد معراج اور گنبد حضرت داؤدؑ کہتے ہیں۔ خلیفہ دوم رضؓ نے عمر بن عاصؓ کی سپہ سالاری میں ایک لشکر بیت المقدس کے لیے روانہ کیا تھا لیکن عمر بن العاص اس شہر کو فتح کرنے میں ناکام رہے۔ چناں چہ لشکر کی قیادت ابو عبیدہ بن الجراح کے سپرد کی گئی لیکن وہ بھی شہر کے اندر داخل ہونے میں ناکام رہے۔ اس شہر کے لوگوں نے قلعہ کی کنجی لشکر اسلام کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ قلعہ کی چابیاں صرف خلیفہ وقت کی تحویل میں دی جا سکتی ہیں۔ چناں چہ ابو عبیدہؓ نے خلیفہ دوم کو ایک خط تحریر کیا کہ شہر کے بیشتر لوگوں کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ قلعہ کی چابیاں خلیفہ کی تحویل میں دیں گے۔ لہٰذا موجودہ صورت حال کے پیش نظر آپ کی آمد بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ دمشق کے نزدیک واقع شہر (جابیہ) میں داخل ہوئے اور اسی شہر میں چند روز قیام کرنے کے بعد آئندہ کی حکمت عملی وضع کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ وہ بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے اور اپنی بہترین حکمت عملی کی بدولت بغیر کسی خونریزی کے یا کسی قسم کے جدال و قتال کے بیت المقدس کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا یہی نہیں، بلکہ خلیفہ حضرت عمرؓ کی خوش اخلاقی اور نرم دلی سے متاثر ہو کر شہر کے زیادہ تر لوگ اسلام قبول کر لیا باقی جو لوگ نصاریٰ اور یہودی اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ انھیں حکماً اس بات کی پوری آزادی دے دی گئی کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں اور یہودی اور نصاریٰ لوگوں کو مسلمانوں کی طرح ہر طرح کی سیاسی سماجی اور معاشرتی آزادی دی گئی۔

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمان اور مومن بندوں کو اس پاک سرزمین بلکہ بیت المقدس کی زیارت نصیب فرمائے: آمین!!

فضیلتِ علم

محمد نواز خان　متعلم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

ارشادِ ربانی ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

کہہ دیجیے کہ اے رسولؐ! کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟

اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم اور جہالت کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے علم کی فضیلت میں فرمایا ہے کہ عالم کا مرتبہ جاہل عابد سے اتنا زیادہ ہے جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ کسی ادنیٰ شخص پر۔ علم روشنی ہے جہالت تاریکی ہے۔ قرآن شریف کا ایک واقعہ ہے۔

اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا پھر ربِّ کائنات نے انسانوں کو پیدا کرنے کا جو طریقہ اس کائنات میں رائج فرمایا، اس پر غور کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک ناپاک ذلیل منی کا قطرہ تخلیق انسانوں کا ذریعہ بنا پھر ہمارے رب نے اس ناپاک قطرہ کو اشرف المخلوقات بنایا۔ آدم علیہ السلام کی تاریخ کو قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جب حق تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ زمین پر ہم ایک بشر پیدا کریں گے اور اس کو خلیفہ بنائیں گے تو فرشتوں نے کہا کہ کیا زمین پر مفسد اور خوں ریز کو خلیفہ بنایا جائے گا؟ اے اللہ! ہم عابد و زاہد ہیں، رات دن تیری تقدیس کرنے والے موجود ہیں۔ فرشتوں کو جواب ملا کہ اے فرشتو! حقیقتِ حال سے ہم واقف ہیں تم واقف نہیں ہو! میں ان کو ایسی باتیں سکھاؤں گا، جس کا تم کو علم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ملائکہ پر فضیلت دینی چاہی تو چیزوں کے نام کا علم دیا اور فرشتے عابد تھے زاہد تھے اور فرماں بردار تھے مگر علم سے عاری تھے۔ ایک زبان ہو کر کہا کہ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے اور تمام تعریفیں تیرے لیے۔ ہمیں ان باتوں کا کیا علم جس کو تو نے ہمیں بتایا نہیں۔ ہم تو تسبیح و تقدس کرنا جانتے ہیں تو ہی حکیم و دانا ہے۔

امتحان ہال میں آدمؑ کھڑے تھے۔ ارشادِ ربانی ہوا کہ اے آدمؑ! تم ان چیزوں کے نام ملائکہ کو بتلاؤ! حضرت آدمؑ نے پڑھایا ہوا سبق فرفر سنا دیا۔ خدا نے فرشتوں سے خطاب فرمایا: کیا ہم نے نہیں کہا تھا کہ زمین آسمان کی کھلی چھپی باتوں کو ہم جانتے ہیں۔

دیکھا آپ نے کہ علم کے سبب خاک کا پتلا آدمؑ بڑی نورانی مخلوق پر فوقیت لے گیا۔ ارشادِ ربانی ہوا کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ یعنی ہم نے آدمؑ کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اسی علم کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے تعظیمی سجدہ کرایا۔ اسرافیلؑ اور جبرئیلؑ اور تمام ملائکہ نے حکم کی بجاوری میں سجدہ کیا مگر ابلیس نافرمانی کر کے ہمیشہ کے لیے مردود اور لعنتی ہوگیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد بہت سے انبیاء دُنیا میں آئے۔ حق تعالیٰ نے علم کی دستارِ فضیلت اُن کے سر پر رکھی اور حضرات انبیاء کے ذریعہ دُنیا میں علم پھیلایا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کو دُنیا میں سب سے پہلے لکھنے پڑھنے کا علم عطا کیا اور اُن کے ذریعہ دُنیا میں علم پھیلا۔ دُنیا میں بادشاہ و گدا سب اسی علم کے محتاج ہیں۔

بزرگوں نے کہا ہے کہ یہ سارا جہان، زمین، آسمان علم الٰہی کا مدرسہ ہے۔ سب سے اول اس مدرسہ کے مدرس حضرت آدمؑ تھے، جنھوں نے سینا، پکانا اور کھیتی باڑی کرنا سکھایا۔ پھر ادریس علیہ السلام نے علم و قلم کو رواج دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے تو آپؑ نے علم شریعت یعنی حلال و حرام کی تعلیم فرمائی۔ آپؑ نے دنیا میں بڑھئی کے کام کو رواج دیا۔ اور خدا کے حکم سے ایک کشتی بنائی جس کی وجہ سے آپؑ کو ایک زبردست طوفان سے محفوظ رکھا گیا۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو علمِ معرفت دیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر کا علم دے کر دُنیا کی مدرسی عطا کی گئی۔ آپؑ نے شاہِ مصر کے خواب کی تعبیر بتا کر قید و بند سے نجات ملی۔ اور مصر کے خزانوں کے مالک ہوے۔ اور تعبیر کے علم ہی کی بدولت مصر پر آپؑ نے حکومت کی۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت سے نوازا اور آپؑ کی حکومت کا دبدبہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو حیوانات کا باہم کلام اور ان کی بول چال سمجھنے کا علم دیا تھا۔ اسی وجہ سے آپؑ شیاطین اور جنات سے بھی کام لیتے تھے۔ ہُدہُد ایک پرندہ ہے۔ اس پرندے کو اللہ تعالیٰ نے زمین کے خشک و تر طبقات کا علم دیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس پرندے کو ساتھ رکھتے۔ سیر و سفر میں اُس پرندہ کے ذریعہ زمین کے اندر کا پانی معلوم کیا جاتا تھا۔ تر طبقہ سے پانی برآمد کر کے لشکر سیراب ہوتا تھا۔

ایک دن عین نماز کے وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کو پانی کی ضرورت پڑی تو ہُدہُد کو یاد کیا۔ اس وقت ہُدہُد اپنے مستقر پر موجود نہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ خفا ہوے اور کہا کہ اگر وہ اپنے غائب ہونے کی مناسب وجہ نہ بتایا تو اُسے ذبح کر ڈالوں گا۔ تھوڑی دیر میں ہُدہُد حاضر ہوا۔ اور اس نے کہا، اے اللہ کے نبیؑ میں ایک نیا علم لایا ہوں جس کا آپؑ کو اور آپؑ کے لشکر کو علم نہیں ہے۔ میں یہ خبر ملک یمن کے شہر سبا سے لایا ہوں۔ ایک عورت ایک بڑے ملک پر حکومت کرتی ہے۔ اس کے پاس بڑا ساز و سامان ہے۔ اس کا تخت بھی بڑا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا، اچھا ہم تیرے سچ یا جھوٹ کا امتحان لیتے ہیں۔ ہمارا یہ خط لے جا کر اس ملکۂ سبا کو پہنچاؤ اور دیکھو کہ اس خط کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہے اور وہ کیا جواب دیتی ہے؟

ہُدہُد یہ خط لے کر گیا۔ ملکۂ سبا بلقیس سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سینے پر خط رکھا اور دُور سے تماشہ دیکھنے لگا۔ جب ملکۂ سبا جاگی تو اس نے خط پڑھا۔ اپنے درباریوں کو جمع کیا۔ وہ سب لڑنے والے لوگ تھے۔ ملکہ نے کہا: پہلے کچھ تحفے تحائف بھیج کر اندازہ لگائیں گے۔ اس کے بعد جنگ کی باتیں کریں گے۔ ملکہ نے عجیب و غریب تحفے دے کر ایک وفد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیجا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نہ صرف بادشاہ تھے بلکہ پیغمبر بھی تھے۔ آپؑ نے تحفے واپس کئے اور کہا کہ اس کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ درباریوں نے فوراً کہا کہ اطاعت قبول کی جائے ورنہ آفتوں میں مبتلا ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بلقیس آخر مسلمان ہو گئیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ علم دُنیا بھی کتنی عظمت کی چیز ہے۔ کہاں حضرت سلیمان علیہ السلام اور کہاں یہ چھوٹی سی چڑیا ہُدہُد؟ مگر اللہ نے اس کو ملکۂ سبا کا علم دیا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چھوٹی سی چڑیا کی بات سُننی پڑی اور اس کے مطابق عمل کرنا پڑا۔ اللہ کے پیغمبر کے سامنے ہُدہُد کا یہ کلام! اس کی یہ جرأت! ہاں اگر جرأت تھی تو صرف علم ہی کی وجہ سے تھی۔ اس چھوٹے سے جانور کے علم کی وجہ سے تھی۔ اس چھوٹے سے جانور کے علم کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ کے قبضہ میں ایک بڑا ملک آیا۔ ملکہ مسلمان ہوئی۔ اس واقعہ پر سوچیئے تو علم کی عظمت واضح ہو جائے گی۔

حضرت حسن بصریؒ روایت کرتے ہیں کہ جو شخص علم کی تلاش میں گھر سے نکلے اس کے سر پر ملائکہ اپنے پروں کا سایہ کرتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ فضا میں اڑنے والے پرندے اس کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں۔ وحشی جانور جنگل میں اور مچھلیاں پانی میں طالب علم کے لیے دعا کرتے ہیں۔ پھر خدا کی طرف سے بہتر شہیدوں کا اجر و ثواب عنایت ہوتا ہے۔

طالبانِ علم نبوت کا کتنا درجہ ہے: ایک غریب طالب علم کے لیے فرشتوں کے پروں کا سائبان، چرند و پرند، سمندر کی مچھلیاں اور زمین پر رینگنے والی چیونٹیاں تک اس کے لیے دعا کریں ایسا کیوں؟ کیوں کہ علم دین کے باقی رہنے سے خدا کی یاد زمین پر باقی رہے ہے۔

ایک چھوٹی سی حدیث ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے واسطے سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے: کہ قیامت کے دن علم کے مسائل تحریر کرنے کی سیاہی اور شہید فی سبیل اللہ کے بدن کا خون میزان میں رکھ کر تولا جائے گا تو علم کی سیاہی بھاری ہوگی۔ اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ عالم کا مرتبہ شہید سے بلند ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے آج سے تقریباً چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے علوم دین کا جو دِیا جلایا تھا وہ آج بھی روشن ہے اور ایک عالَم اس سے مستفید ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا ۝ یعنی اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اپنی اولاد کو بھی علم دین کی طرف لگایا جائے تو مرنے کے بعد یہ اولاد اپنے والدین کے لیے خیر جاریہ ہوتی ہے۔

اپنے لیے دعا کرنے والی اولاد

علمِ دین سے ان کو بہرور کرنے سے ہی اولاد والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرے گی۔

علمِ دین ایک عالم کو مستفید کرتا ہے اور اس کے فیوض و برکات باقی رہتے ہیں۔ علم اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ جس اللہ کے بندے نے اس کی صفت علم کو اپنا لیا اس کی وہ نیکی اور علمی صفت اللہ کے پاس باقی رہے گی اور ایسے بندوں کو دُنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ مالامال کر دے گا۔

اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے: اے اللہ! تمام مسلمانوں اور ان کے بچّوں کو علمِ دین حاصل کرنے کی ہدایت عطا فرمائے آمین

بقیہ ص ۱۹۸ کا: "رسالت"

ابو جہل کی جماعت میں شامل ہوں یا سرکارؐ کی ذات گرامی کو اپنی بشریت سے بلند و بالا سمجھ کر صدیق اکبرؓ کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ غرض واقعات طول ہیں۔ اس طویل گفتگو میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مختصر سی بات یہ ہے۔ لیکن یہ یاد رکھو ایمان کی جان اور جانِ ایمان ہے۔

ربّ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سچّی محبت و عقیدت ڈال دے تاکہ اس ذریعہ ہم کل کے روز نجات حاصل کر سکیں ؎

اللہ کی سرتابقدم شان ہیں یہ !! ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انھیں ایمان یہ کہتا ہے میری جان ہیں یہ

وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ

ڈاکٹر محمد نعمان باشاہ: ادیب فاضل (مدراس یونیورسٹی) ویلور

والتین قرآن کریم کی ۹۵ ویں سورۃ ہے اور مکۂ مکرمہ میں نازل ہوی۔ اس سورۃ کے اندر اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں (انجیر، زیتون، طور سینا مکۃ المکرمہ) کی قسم کھائی ہے۔ اس کے سورہ کے علاوہ دیگر سورتوں میں بھی اللہ نے قسم کھائی ہے۔ خدا نے قسم کیوں کھائی یہ بڑی طویل بحث ہے۔ یہاں صرف ایک بات نقل کی جاتی ہے کہ کسی بات کی اہمیت بتلانے کے لیے قسمیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ عصر ہے: والعصر ان الانسان لفی خسر: زمانہ کی قسم! بے شک انسان نقصان میں ہے۔

التین اور الزیتون کے معنی مختلف بتائے گئے ہیں اور یہ سب مرادی معنی ہیں۔ مثلاً تین سے جودی پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی بنائی ہوی مسجد مراد ہے اور زیتون سے بیت المقدس مراد ہے یا تین سے مراد دمشق ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔

انجیر التین ایک پھل کا نام ہے اور الزیتون ایک درخت کا نام ہے اور یہی معنی خاص وعام میں مشہور ہے۔

اس مقام پر التین اور الزیتون سے متعلق طبی حیثیت سے چند باتیں پیش کی جارہی ہیں۔

اس پھل کو عربی میں تین کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں انجیر کہتے ہیں اور انگریزی میں FIG کہتے ہیں اس کا نباتی نام ہے FICUS CARICA LINN

ضیاء الدین عبداللہ بن احمد اندلسی المعروف ابن بیطار نے اپنی تالیف "الجامع لمفردات الادویۃ والاغذیۃ" میں انجیر سے متعلق لکھا ہے:

خشک انجیر کا مزاج درجۂ اول کے آخر اور دوم کی ابتداء میں گرم ہے۔ اس میں لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ انھیں تاثیرات کی بناء پر یہ منضج ہے اور سخت ورموں کو تحلیل کرتا ہے۔ انجیر تازہ اور خشک دونوں ہی دست آور ہیں۔ درخت انجیر کی ٹہنیاں اس قدر گرم اور لطیف ہوتی ہیں کہ جب انھیں گائے کے سخت گوشت میں ڈال کر

پکایا جاتا ہے تو گوشت گل جاتا ہے ۔ انجیر خشک میں غذائیت کافی پائی جاتی ہے۔ گردہ و مثانہ کے امراض، مزمن امراض کے بعد لاغری، مرگی اور جنون میں اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کو زوفا کے ساتھ پکا کر پینے سے سینے کے فضلات کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔

تازہ انجیر سوکھے ہوے سے نسبتاً کم گرم اور کم خشک ہوتا ہے اور یہ عمدہ میوؤں میں شمار کیا جاتا ہے گاڑھا خلط پیدا کرتا ہے۔ اپنی رطوبت کی وجہ سے ملین ہے۔ اعتدال کے ساتھ بدن کو غذائیت بخشتا ہے۔ گردہ و مثانہ میں جلاء پیدا کرتا ہے اور فضلات کا تنقیہ کرتا ہے۔ انجیر سے بڑھ کر غذائیت سے بھرپور کوئی دوسرا میوہ نہیں ہوتا۔ دوسرے میوؤں کے مقابلہ میں یہ ریاح کم پیدا کرتا ہے۔ انجیر خام اور اس کے علاوہ دوسرے تمام خام میوہ جات کے کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ پختہ ہو جانے کے بعد سبھی کا کھانا بہتر ہوتا ہے۔ انجیر طحال و جگر کو جلا بخشتا ہے۔ تازہ خشک سے عمدہ ہوتا ہے۔ انجیر خشک سرد مزاج والوں درد پشت اور تقطیر البول (قطرہ قطرہ پیشاب آنا) میں مفید ہے۔ گردے کو حرارت بخشتا ہے۔ سینہ و پھیپھڑے کے فضلات کو خارج کرتا ہے۔ ملین ہے۔ یعنی قبض کو دور کرتا ہے۔ ہمراہ مغز اخروٹ کھانا بدن کو عمدہ غذائیت بہم پہنچاتا ہے۔ سب سے عمدہ انجیر پختہ شیریں اور شیرہ دار ہوتا ہے۔ انجیر خام سب سے زیادہ خراب ہوتا ہے جو ریاح پیدا کرتا ہے اور شکم سے بمشکل خارج ہوتا ہے۔ اس کو مستقل طور پر کھاتے رہنے سے آدمی لحیم ہو جاتے ہیں۔ انجیر میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ یہ قلب کی قوتِ غضبانیہ کو کم کرتا اور سکون دیتا ہے۔

الزیتون

عربی اور اردو میں زیتون ہی نام ہے۔ یہ ایک درخت کا نام بھی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے پھل کا نام بھی ہے۔ اس کا انگریزی نام OLIVE ہے اور نباتی نام ہے OLEA EUROPAEA LINN۔

حکیم احتشام الحق قریشی اپنی کتاب "علاج بذریعہ غذا" میں زیتون کی شناخت اور اس کے مزاج اور اس کے فوائد سے متعلق لکھتے ہیں:

زیتون ایک بڑا درخت ہے۔ بستانی، صحرائی اور کوہی ہوتا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں پھلتا ہے اور ہزار برس تک رہتا ہے۔ اس کے پھل بیضاوی اور بیر کی طرح ہوتے ہیں۔ کچے پھل رنگت میں گہرے سبز اور جب گدر ہو جاتے ہیں تو رنگت سرخ یا قوتی ہو جاتی ہے۔ پک کر پھل سیاہ پڑ جاتے ہیں۔ پھل کے اندر گٹھلی ہوتی ہے۔ پتے لمود کے پتوں سے مشابہ اور گول ہوتے ہیں۔

زیتون کی لکڑی اور پتے دونوں سرد و خشک اور قابض ہیں۔ بعض کے نزدیک پیڑ کے تمام اجزا سرد و تر اور خشک اور قابض ہیں۔ اس کا پکا ہوا پھل اعتدال کے ساتھ گرمی رکھتا ہے اور کسی قدر قابض بھی ہے۔

شیخ بوعلی سینا کے مطابق زیتون سے بدن کو غذا کم پہنچتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زیتون سیاہ میں دوسروں سے زیادہ غذائیت ہے مگر معدہ میں جلد فاسد ہو کر سودا بن جاتا ہے۔ زیتون تازہ سرخ معدہ کو ڈھیلا کرتا ہے۔ متلی پیدا کرتا ہے اس کے بعد سرکہ یا کانجی[1] کھالینے سے نفع ہوتا ہے۔ پرانا زیتون دیر میں ہضم ہوتا ہے۔ کچا پھل معدے کے اجزاء کو قوت دیتا ہے۔ اس کو سرکہ میں ملا کر کھانے سے صفرہ کو نفع ہوتا ہے۔ سداب[2] کے ساتھ جوش دے کر پینے سے پیٹ کی مروڑ، کیڑے اور قولنج ورمی کو نفع ہوتا ہے۔

زیتون کے پتے سکھا کر پیس کر بدن پر ملنے سے پسینہ کا آنا رک جاتا ہے۔ اس کے سفوف کو شہد میں ملا کر لگانے سے داخس[5] (Paranythia) کو نفع ہوتا ہے۔

زیتون کے پختہ پھلوں کو دبا کر نچوڑنے سے تیل نکلتا ہے۔ تیل نکالنے کی تدبیر یہ ہے کہ زیتون کے پھلوں کو ایک برتن میں بھر کر دھوپ میں یا گرم تنور میں رکھ دیں۔ جب وہ مرجھا جائیں تو گٹھلی سمیت کوٹ کر نچوڑلیں روغن نکل آتا ہے۔

روغن زیتون دوسرے درجے میں گرم و خشک ہے۔ پرانا پڑنے پر گرمی بڑھ جاتی ہے۔ پکے ہوئے پھلوں کا تیل پٹھوں کی سردی دور کرتا ہے ان کو طاقت دیتا ہے بلکہ اکثر اعضا کو قوت دیتا ہے۔ ورموں کو تحلیل کرتا ہے۔ پیٹ کے کیڑے مار کر نکال دیتا ہے۔ آنتوں کی مروڑ، قولنج اور نفخ کو مفید ہے۔ سردی کے سبب بدن یا جوڑوں میں درد ہو تو مالش سے آرام ملتا ہے۔ بلغم دور کرتا ہے۔ روغنِ زیتون کو چہرے پر ملنے سے اس کی رونق بڑھتی ہے مسوڑھوں پر ملنے سے دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔ کھانے سے قبض دور ہوتا ہے۔ دواؤں کی قوت اور زور کو گھٹاتا ہے۔ پتھری کو توڑتا ہے۔

روغنِ زیتون کی سبھی قسمیں گرم، درد، چہرے کی کھال کو ملائم کرتی ہیں۔ جسم کو سردی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اور اسے حرکت کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ اجابت صاف لاتی اور نقصان دہ دواؤں کے اثرات کو کمزور کر دیتی ہیں صحرائی زیتون کا روغن مسوڑھوں سے کثرت سے ساتھ خون آنے میں، اس کی کلی سے فائدہ ہوتا ہے اور ہلنے والے دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

1. ایک قسم کا پودا جس کے پھول اور پتے شربت وغیرہ بنانے کے کام آتے ہیں۔
2. نیم پختہ۔ آدھا کچا آدھا پکا (۳) ایک قسم کا کھٹا پانی جس میں رائی، زیرہ نمک وغیرہ اچار کی طرح ڈالتے ہیں۔
5. یہ ورم گرم ہے۔ جو کہ ناخن کی جڑ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس میں شدت کا درد ٹیس اور تناؤ ہوتا ہے۔ کبھی شدت درد سے بخار بھی ہو جاتا ہے۔
4. کالادانہ

مولوی سید نیاز احمد جمالی : پرنسپل جمالیہ عربک کالج : پرمبور۔ چنئی

الحمد لله والصلوٰة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه اجمعين

ان التصوف فن يقصد به تطهير القلوب عن الافكار الفاسدة بعث الله سيدنا محمد صلى الله عليه وسلم ليعلم الناس الكتاب والحكمة ويزكى قلوبهم وانفسهم كما قال عزوجل فى التنزيل لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل ضلال مبين۔

ان اهل التصوف يهتمون بالاخلاق اهتماما بالغا وللتواضع لديهم اهمية كبرى لان التواضع ادل على اظهار العبودية وانما اخرج ابليس عن حظيرة القدس وحيز رحمة الله تعالى للانعدام التواضع ان الصوفية يجتهدون غاية الاجتهاد فى ازالة الكبر عن القلب فان الكبر داء عضال ولا يصفوا القلب الا اذا كان خاليا عن الكبر ان الصوفية يعتقدون ان الفائزين فى الدارين من تطهير قلبه عن نجاسة الكبر ولا يصبح العبد جديرا بولاية المولى عزوجل الا اذا لبس التواضع والقى عن نفسه رذيلة الكبر روى عن انس ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان الله تعالى اوحى الى ان تواضعوا ولا يبغى بعضكم على بعض۔

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم اكثر تواضعا بل كان سيدا لمتواضعين قال الامام السهروردى فى كتاب عوارف المعارف وكان من تواضع رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجيب دعوة

الحر والعبد ويقبل الهدية ولو انها جرعة لبن او فخذ ارنب ويكافي عليها ويأكلها ولا يستكبر عن اجابة الامة والمسكين ـ

ومن اهم مقاصد اهل التصوف التقرب الى الله عزوجل ان العبادة باطلة عندهم ان لم يقصد بها التقرب الى الله سبحانه وتعالى ان الصوفية يعرضون عن الخلق ويتبتلون عنه ويتوجهون الى الله تعالى توجها كاملا وينغمسون فى ذكر الله تعالىٰ و التفكر فى صفاته كما قال عزوجل واذكر اسم ربك و تبتل اليه تبتيلا ـ

وللصوفية اهتمام كبير بالقيام بالنوافل لان العبد يتقرب الى الله تعالى بالنوافل بعد اداء الفرائض ان الاشتغال بالنوافل دليل واضح على اشتياق عبادة الله تعالى ولا يشتاق الى عبادة الله تعالى الا من استنار قلبه بمحبة الله تعالى واما التخلف عن العبادة فانه من امارات قلة المحبة اعاذنا الله تعالى منها ويفرض الصوفية والشيوخ على مريدهم كثيرا من الاوراد والاذكار لتحقيق الغرض المذكور فان الاشتغال بالاوراد الطيباء يريح القلب و ينجيه عن الوقوع فى الافكار الفاسدة الشيطانية قال تعالى فى كتابه العزيز ومن يعش عن ذكر الرحمٰن نقيض له شيطانا فهو له قرين ـ

ان الصوفية يحبون ان لا تنقضى لحظة من لحظات حياتهم خالية عن ذكر الله تعالىٰ فانهم يشغلون نفسهم بالذكر من اول يقظتهم الى وقت نومهم ولا يضيعون وقتا من الاوقات ان ايديهم تكون فى اعمال مختلفة لكن قلوبهم تكون منيرة ومملوءة بذكر مولى تعالى قال امام اهل التصوف الغزالى رحمه الله فى كتاب بداية الهداية فاذا استيقظت من النوم فاجتهد ان تستيقظ قبل طلوع الفجر وليكن اول ما يجرى على قلبك ولسانك ذكر الله تعالىٰ فقل عند ذلك الحمد لله الذى احيانا بعدما اماتنا واليه النشور اصبحنا واصبح الملك لله والعظمة والسلطان لله والعزة والقدرة لله رب العالمين اصبحنا على فطرة الاسلام وعلى كلمة الاخلاص وعلى دين نبينا محمد صلى الله عليه وسلم وعلى ملة ابينا ابراهيم حنيفا مسلما وما كان من المشركين ـ اللّٰهم بك اصبحنا وبك

نحیا وبك نموت والیك النشور اللّٰهم انا نسئلك ان تبعثنا فی هذا الیوم الی کل خیر ونعوذبك ان نجترح فیه سوء اونجره الی مسلم اویجره احد الینا نسألك خیرهذا الیوم وخیرما فیه ونعوذبك من شرهذا الیوم وشرما فیها ان اصلاح القلب امرلازم عند الصوفیة الکرام لان به تستقیم اعضاء الجسد کلها ان للقلب سلطة علی سائر الاعضاء ان القلب یأمرو ینهی وبقیة الاعضاء تطیع قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الاوهی القلب ان فلاح العبد فی الدارین متوقف علی صلاح القلب وطهارته قال تعالی قد افلح من تزکیٰ وقال جل شانه فی مکان لاینفع مال ولا بنون الامن اتی اللّٰه بقلب سلیم واذا تسیطرت علی القلب هموم الدنیا فانه یفسد و یتنجس ولایحصل له الاطمئنان وانما یطمئن القلب بدوام الذکر کما قال تعالیٰ الابذکر اللّٰه تطمئن القلوب۔

ان الصوفیة یلقنون مریدیهم المراقبة وهی ادامة الفکر وازالة الغفلة عن اللّٰه تعالی ان الصوفیة یامرون الطلبة ان یدیموا ذکر آیات توجب التوجه والالتفات الی اللّٰه تعالی منها قوله تعالی یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور وقوله تعالی یعلم ما فی قلوبکم۔

ان الصوفیة الکرام یبغضون الدنیا ویکرهونها و یعتقدونها عدوة ومفسدة ولذلك یوجبون علی الطلبة والمریدین ان یزیلوا حب الدنیا عن القلوب قال رئیس الصوفیة الشیخ الغزالی رحمه اللّٰه فی کتاب احیاء علوم الدین فان الدنیا عدوة اللّٰه وعدوة لاولیاء اللّٰه وعدوة لاعداء اللّٰه اما عداوتها للّٰه فانها قطعت الطریق علی عباد اللّٰه ولذلك لم ینظر اللّٰه الیها منذ خلقها واما عداوتها لاولیاء اللّٰه عزوجل فانها تزینت لهم بزینتها وعمتهم بزهرتها ونضارتها حتی تجرعوا مرارة الصبر فی مقاطعتها وعما عداوتها لاعداء اللّٰه فانها استدرجتهم بمکرها وکیدها فاقتنصیتهم بشبکتها حتی وثقوا بها وعولوا علیها فخذلتهم احوج ما کانوا الیها فاجتنوا منها حسرة تنقطع دونها الاکباد هم حرمتهم السعادة ابدا الاباد فهم علی فراقها یتحسرون ومن مکایدها یستغیثون ولا یغاثون

بل یقال لھم اخسئوا فیھا ولا تعلمون ۔

ان الصوفیۃ یرکزون عنایاتھم با لاحسان وقد قیل ان التصوف اسم اٰخر للاحسان اخرج مسلم عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال بینما نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لایری علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ ووضع کفیہ علی فخذیہ وقال یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال الاسلام ان ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ وتقیم الصلاۃ وتؤتی الزکاۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا قال صدقت فعجبنا لہ یسالہ ویصدقہ قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تؤمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ و قال صدقت قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم یکن تراہ فانہ یراک قال فاخبرنی عن الساعۃ قال ما المسئول عنھا باعلم من السائل قال فاخبرنی عن اماراتھا قال ان تلد الامۃ ربتھا وان تری الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاء ویتطاولون فی البنیان قال ثم انطلق فلبثت ملیا ثم قال لی یا عمر اتدری من السائل قلت اللہ ورسولہ اعلم قال فانہ جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم ۔

الحدیث المذکور ھو اصل بنی علیہ التصوف ویسمی الحدیث عند القوم بحدیث التصوف ذکرت فی الحدیث ثلاثۃ اشیاء وھی الاسلام والایمان والاحسان وقد بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم المشاھدۃ و المراقبہ فی ایضاح حقیقۃ الاحسان ان العبادۃ لا یعتد بھا عند الصوفیۃ اذا کانت فارغۃ عن مشاھدۃ الرب او مراقبتہ ۔

ومن الناس من نشروا امورا مخالفۃ للشریعۃ الاسلامیۃ وسموھا تصوفا فان التصوف بریٔ من تلک الامور ان التصوف تعریف العبد ربہ واصلاح قلبہ عن الافکار الفاسدۃ وتزیینہ بالاخلاق الجمیلۃ وختاما ادعو اللہ تعالیٰ ان یرزقنا علم التصوف ویکسونا اخلاق اھل التصوف ۔ ▲▲

نعتِ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

سید سراج الدین منیرؔ حیدرآبادی

اب یہ سوچا ہے کہ خود اپنا مقدر لکھوں
مدحتِ نُور کروں نعتِ پیمبر لکھوں

طاہر و پاک و مطہر و مطہر لکھوں
آپؐ کی شان میں تحریرِ معطر لکھوں

سیدِ کل کی عنایات کا دفتر لکھوں
یعنی سرکارؐ کے دربار کا منظر لکھوں

مظہرِ ذات لکھوں نُور کا پیکر لکھوں
سیدِ کون و مکاں خواجۂ محشر لکھوں

محرمِ رازِ نہاں شاہدِ داور لکھوں
شافعِ روزِ جزا مالکِ کوثر لکھوں

قبلۂ اہلِ وفا کعبۂ اربابِ صفا
حُسنِ قرآنِ مبیں نُور کا مصدر لکھوں

منشئہ ربّ بھی مشیت بھی صدائے کُن بھی
محوِ حیرت ہوں کہ کیا آپؐ کو سرور لکھوں

حُسنِ اخلاق و محبت و مروت کی قسم
کم ہے گر آپؐ کو رحمت کا سمندر لکھوں

آپؐ کی ذات وہ ہے جس کی گواہی کے لیے
دستِ بوجہل میں گویا ہوئے کنکر لکھوں

آپؐ کی چشمِ کرم جب سے ہوئی ہے مجھ پر
کھُل گئے مجھ پہ میری ذات کے جوہر لکھوں

کیا کہوں تم سے منیرؔ آلِ نبیؐ کے غم میں!
زخم سینے پہ اُبھر آئے بہتر لکھوں!

پیشکش: سید علی احمد قادری کلیم

نعت شریف

محمدؐ مصطفےٰ کا تاابد فرمان ہے سچّا

یس محمد یوسف تھماس، اسٹیشن مینجر ساؤتھ سنٹرل ریلوے۔ ادونی (اے پی)

میرا ایمان ہے سچّا مرا ایقان ہے سچّا
محمدؐ مصطفےٰ کا تا ابد فرمان ہے سچّا

نبیؐ سچّے رسل سچّے ملائک سارے ہیں سچّے
وہ کُل سچّوں کا سردار شہ ذیشان ہے سچّا

جو اقراء سے شروع تو نصر تک آخر مکمل ہے
نگینہ لوح کا عالم میں یہ قرآن ہے سچّا

خطابت جن کی سُن کر سچّے آخر ہو گئے سچّے
پیامِ حق نبیؐ کا برسرِ فاران ہے سچّا

ہر اک سختی مگر لب سے صدائے حق نکلتی تھی
بلالِؓ پاک جو سرکار کا دربان ہے سچّا

گذارے کتنی صدیاں جستجو میں کتنے سچّوں کی
بالآخر پالیا سچّا نبیؐ سلمانؓ ہے سچّا

محبت غائبانہ یوں فدا خیر الوریٰؐ پر تھا
اویسؓ قرن عاشقِ سرِ دندان ہے سچّا

یہ فرمائش تھی نادانوں کی دیکھیں چاند پر قدرت
کیا دو قاش جس کو داعیٔ ایمان ہے سچّا

سُنا جو سورۂ مریمؑ تو رقّت ہو گئی طاری
حبش کے شاہِ نجاشی کا اب ایمان ہے سچّا

اک فتح مصر و فارس و روم کی بھی خوشنویدی دے
تھا خندق میں رسولؐ کا سرِ جیانؓ ہے سچّا

صحابہؓ ہر گھڑی تیار رہتے جان دینے کو
وہ پروانوں کا محور حبِ رضا و سلطان ہے سچّا

وہ جس کے رجز سے باطل ہوا مرعوب تھماسؔ
وہ دلبر مصطفےٰؐ کا شاعرِ حسّان ہے سچّا

پیش کش: حکیم عنایت علی قریشی

حضرت مکاں

علیم صبا نویدی

علمِ دیں کی برکتیں حضرت مکاں میں چار سُو
رحمتیں ہی رحمتیں حضرت مکاں میں چار سُو

گلستانِ علم و فن ہیں بے نظیر و بے مثال!
نُور اور نکہتیں حضرت مکاں میں چار سُو

قربیؔ و ذوقیؔ کا نُوری آسماں ہے صد بہار
نُورِ حق کی گُل رُتیں حضرت مکاں میں چار سُو

حضرتِ طاہرؔ کی بے شک یہ دعاؤں کا اثر
سایہ افگن راحتیں حضرت مکاں میں چار سُو

قطبِ ویلوری کا یہ فیضان کامل دیکھیے
فکر و فن کی جنّتیں حضرت مکاں میں چار سُو

حضرت عثماںؔ ہلالؔ و بکرؔ و انوارؔ و بشیرؔ
ہیں مبارک صورتیں حضرت مکاں میں چار سُو

صوفیوں کے زیرِ سایۂ یہ صباؔ آباد ہے
ہیں دعائی دولتیں حضرت مکاں میں چار سُو

پیش کش: سید سلمان قادری۔ حیدرآبادی

عظیم الشان ہے میلہ نظام الدین چشتیؒ کا

محمد یوسف شمیم نیلور

بہر سو بول ہے بالا نظام الدین چشتیؒ کا
ہر اک ہے شیفتہ خواجہ نظام الدین چشتیؒ کا

لگا ہے ہر طرف میلا نظام الدین چشتیؒ کا
ہر اک جلوے میں ہے جلوا نظام الدین چشتیؒ کا

شہنشاہوں کے سر جن کے در اقدس پہ جھکتے تھے
وہ در ہے ارفع و اعلیٰ نظام الدین چشتیؒ کا

ہوا جس سے اخوت کا سرورِ دائمی حاصل
وہ ہے لبریز پیمانہ نظام الدین چشتیؒ کا

وہ خالق کے دلارے ہیں وہ ہیں مخلوق کے پیارے
ہے عرش و فرش پر چرچا نظام الدین چشتیؒ کا

نگاہوں میں ہیں رقصاں نو بہ نو جلوے بہاروں کے
عظیم الشان ہے میلا نظام الدین چشتیؒ کا

فریدِ گنج شکرؒ کا عمامہ آپؒ نے پایا
مقام عشق ہے اونچا نظام الدین چشتیؒ کا

نظام الدین چشتیؒ کے ثنا خواں خسروی نغمے
عظیم القدر ہے رتبہ نظام الدین چشتیؒ کا

زبانِ خلق پر ہے گونج "سلطان المشائخ" کی
لقب ہے کس قدر پیارا نظام الدین چشتیؒ کا

ہوا ہے ہر تیرہ دل تعلیم روحانی سے تابندہ
اجالا ہر طرف پھیلا نظام الدین چشتیؒ کا

خلافت آپ نے پائی فریدالدین بابا سے
تھا طرفہ زہد اور تقویٰ نظام الدین چشتیؒ کا

شمیمؔ اپنا سخن در مدح محبوبِ الٰہی ہے
لبوں پر ہے مرے نغمہ نظام الدین چشتیؒ کا

ع ۱ امیر خسرو

پیشکش: محمد باقر حسین اور محمد سجاد حسین (پوتے محمد یوسف شمیم)

سلام

بہ حضور سید الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

اے حبیبِ خدا، اے نبی مصطفٰے! تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

اے رسولِ خدا، احمدِ مجتبےٰ! تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

قبلۂ انبیاء، کعبۂ اصفیاء تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

عرض کرتے ہیں آقا تمہارے گدا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

نفس و شیطاں سے ہم کو بچا لیجیے، سیدھے رستہ پہ ہم کو لگا دیجیے

ایسی نظرِ کرم ہم پہ کرنا ذرا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

مصدرِ رحمتِ بیکراں تم ہی ہو، صدرِ کون و مکاں بے گماں تم ہی ہو

تم ہی ہو مظہرِ ذاتِ نورِ خدا، تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

شربتِ وصل ہم کو پلا دیجیے، جلوۂ حق نما بھی دکھا دیجیے

بس ہماری یہی تم سے ہے التجا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

پاس کچھ بھی نہیں ہے حبیبِ خدا پھر بھی کیا ڈر کہ تم ہو شفیع الوریٰ

لاج رکھنا ہماری بروزِ جزا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

ہے یہ امید مقبول ہو جائے گا، نورؔ کا بھی کرم سے درود و سلام

عرض کرتے ہیں آقا یہ صبح و مسا تم پہ لاکھوں سلام تم پہ لاکھوں سلام

خواجہ محمد بیابانی نورؔ قادری و چشتی

ایک مرثیہ نما نظم

بیاد
شیخ المشائخ
اعلیٰحضرت
مولانا مولوی
ابوالنصر قطب الدین
سیّد شاہ محمد باقر
قادری علیہ الرحمہ
بہ موقعہ
سالانہ فاتحہ

اثر خامہ: علیم صبا نویدی

مصطفائی نُور میں مہکی بہار
اعلیٰ حضرتؒ یادِ باقرؒ پہ نثار
عطر آگیں ہوگیا دار السرور
مہکی علمی روشنی ہے دور دور
زینتِ بزمِ دعا، علمائے دیں
چار سو ہے منظرِ خلدِ بریں!
سینہ سینہ یادِ باقرؒ قادری
نقش جن کا نور آور ہے ابھی
جن کے ہر کردار میں وصفِ نبیؐ
نیکیوں سے لیس جن کی زندگی
جن کو حاصل تھا کمالِ آگہی
نوری سینے میں جمالِ آگہی
جن سے روشن خانقاہی سلسلہ
تاجورِ حضرتِ مکاں کا قافلہ
اب ھلالؔ و عثماںؔ پاشا قادری
فیض یاب و کامراں ہیں ہر گھڑی
سایہ افگن جن پہ فضلِ ربِّ صبا
قبر پہ ہے رحمتِ شاہِ ھدیٰ

سالنامہ اللطیف ویلور
دار العلوم لطیفیہ کا ایک منظر
دار العلوم لطیفیہ مکان حضرت قطب ویلور
Printed at Tamilnadu Urdu PUblication, Chennai - 600 002. Cell : 9840361399